ماہنامہ
چارسو
راولپنڈی

۔۔۔۔ مقامات ۔۔۔۔

(منظوماتِ حرمین الشریفین)

خانۂ خدا میں شرفِ باریابی نے شرف الدین کو ایسی باطنی رفعت، پاکیزہ رقّت اور طمانیت خاطر اور دولتِ قرب وحضوری سے نوازا ہے کہ وہ نشاطِ بندگی سے چُور رہو کر آیا ہے۔ نزہت تخیل کے حوالے سے اس کا سفرِ حج ایک بے مثال صوفیانہ تجربہ ہے۔ اس نے اس تجربے کو پورے خلوصِ فن کے ساتھ سپردِ قرطاس کیا ہے۔ اس کا پیرایۂ بیان شاعری کے محاسن سے مالا مال ہے اور اپنی واردات کے اعتبار سے اظہار کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس کے تجربے کی ندرت نے اُسلوبِ بیان کے نئے اُفق دریافت کیے ہیں۔ اس کی طرزِ نوا کے تار میں برقِ شعریت کی رو خاصی زوردار ہے۔ اس تجربے کی تحسین کے لیے مجھے خاموشی سے بہتر کوئی پیرایہ کارگر محسوس نہیں ہوتا۔

۔۔۔۔ پروفیسر انور مسعود

اشاعت ۲۰۱۳، قیمت ۳۵۰ روپے، میٹرکس پبلی کیشنز راولپنڈی

۔۔۔۔ محبت کی کتاب ۔۔۔۔

اگر میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا اور اپنے کانوں سے نہ سُنتا تو میں یقین نہ کرتا کہ منظوم ڈرامے کی صنف میں ایسی شاعری بھی ہو سکتی ہے۔ ''محبت کی کتاب'' غیر معمولی کتاب ہے اور مدتوں یاد رکھنے کے لائق کارنامہ بھی۔

۔۔۔۔ شمس الرحمٰن فاروقی

ایوب خاور نے اس مختلف انداز کی تحریر میں اپنے اندر موجود تینوں صلاحیتوں یعنی شاعری، ڈرامہ نگاری اور ڈائریکشن کو جس تخلیقی اُپج اور فنکارانہ مشّاقی کے ساتھ استعمال کیا ہے اس کی داد نہ دینا یقیناً بے انصافی ہوگی۔ یہ ایک ایسا منظوم ڈرامہ ہے جو لکھا تو نوجوان نسل کے لیے گیا ہے لیکن اس سے بڑی عمر کے لوگ بھی یہ سوچ کر مستفیض ہو سکتے ہیں کہ ''یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے''۔

۔۔۔۔ امجد اسلام امجد

قیمت ۲۵۰ روپے، القا پبلی کیشنز، گلبرگ ۲، لاہور

۔۔۔۔ نیم وادریچہ ۔۔۔۔

''نیم وادریچہ'' نجیب عمر کا دوسرا مجموعہ ہے۔ مصنف کے ۴۳ افسانوں کا پہلا مجموعہ ''حصارِ نظر'' اسی برس شائع ہو چکا ہے۔ ''حصارِ نظر'' کے افسانے اور اس دوسرے مجموعے کے افسانے منجملہ اس لحاظ سے بہت اہمیت کے حامل ہیں کہ ان دونوں مجموعوں میں مصنف کے افسانے مقصدیت اور ماہیت کے علاقے سے قاری کو متوجہ کرتے ہیں اور بہ لحاظ بنت Technique ان افسانوں کے ساتھ دیگر رنگوں کی تخلیقی نثریں بھی شامل ہیں۔ اولین تاثر ان دونوں مجموعوں کے مطالعے سے یہ پیدا ہوتا ہے کہ محض تین برس میں لکھے گئے یہ ادب پارے جن کی تعداد تقریباً ۱۰۰ بنتی ہے۔ کتابی صورت میں ہمارے ہاتھوں میں آئے ہیں تو بے شک نجیب عمر کے تیز تخلیقی عمل اور ان کے عمر بھر کے مطالعے، تجربے اور مشاہدے کی ہمہ گیریت کے اوصاف سے ہی ممکن ہوا ہے۔

۔۔۔۔ نورالہدیٰ سیّد

اشاعت ۲۰۱۳، قیمت ۳۰۰ روپے، الحمد پبلی کیشنز، کراچی

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۲،شمارہ:مئی جون۲۰۱۳ء

بانی مدیراعلیٰ

سید ضمیر جعفری

○○○

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

○○

مدیران معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

○

مجلسِ مشاورت

○○○

قارئین چہارسُو

○○○

زرِ سالانہ

○○○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

○

رابطہ: 537/D-1،ویسٹریج-III،راولپنڈی، پاکستان۔

فون: 5462495,5490181-51-(92+)

فیکس: 5512172-(92+)

موبائل: 0558618-336-(92+)

ای۔میل: chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق ------ شعیب حیدر زیدی

تزئین ---------- عظمیٰ رشید

کمپوزنگ ---------- تنویر الحق

قرطاسِ اعزاز

آستانِ شباب ---------- رشی پٹیالوی ۵

دولتِ یقین ---------- عروب شاہد ۶

دربارِ محمد ---------- شباب للت ۸

خلعتِ زریں ---------- فاری شا ۹

براہِ راست ---------- گلزار جاوید ۱۳

دل کے دروازے ---------- محمد انعام الحق ۲۳

زندگی کا احساس ---------- نند کشور وکرم ۲۸

خامشی کا طلسم ---------- ڈاکٹر شکیل الرحمٰن ۳۱

سرابوں کا سفر ------ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید ۳۴

منفرد تحقیق ---------- کرشن کمار طور ۳۸

کرشمہ دامنِ دل -------- شباب بانو سرتاج ۳۹

فقیرِ بے نوا ---------- محمد شاہد پٹھان ۴۴

ایمان کی قدریں ---------- عطیہ سکندر علی ۵۰

عکسِ وحدت ---------- ڈاکٹر شباب للت ۵۵

ظرافت اور صحتِ معاشرہ --- ڈاکٹر شباب للت ۵۷

افسانے

شکریہ میرے مہرباں -------- عبداللہ جاوید ۶۱

بڑا دل ---------- وقار بن الٰہی ۶۵

رقص کرنے کی سزا ---------- عذرا اصغر ۷۰

ہم سے تو پرندے اچھے ------- امرناتھ دھمیجہ ۷۲

دعوتِ حشر

مشکور حسین یاد، محمود الحسن، سرور انبالوی، آصف ثاقب، غالب عرفان، سری واستو رند، انتظار باقی، حمیدہ معین رضوی، پرواز انبالوی، صدیق شاہد، نسیمِ سحر، انوار فیروز، مہندر پرتاپ چاند، پنہاں۔ ۷۴

افسانے

نام کیا دوں ---------- حنیف باوا ۸۱

بیتے لمحوں کا لمس ---------- محمد طارق علی ۸۳

لمحات کا سایہ ---------- شفیع ہمدم ۸۷

ادھ کھائی بوٹیاں ---------- گلزار جاوید ۸۹

حقیقت تک رسائی

زہیر کنجاہی، وشال کھلر، شگفتہ نازلی، ضیا شہزاد، جہانگیر اشرف، جوہی پرویز، عارف شفیق، منظور حسین، ایم۔زیڈ۔کنول، نوید سروش، تصور اقبال، ندیم ہاشمی، مسعود تنہا، زاہدہ عابد حنا۔ ۹۱

ہوا کے دوش پر

ایک عام آدمی کی داستانِ حیات ---- فیروز عالم ۹۶

نشانِ راہ

دیوانِ رعبایاتِ انیس ------ ڈاکٹر احساس بیگ ۱۰۰

آئینۂ فن

رشتوں کی تقدیس -------- ڈاکٹر رینو بہل ۱۰۲

الیکشن کا زمانہ ---------- انوار فیروز ۱۰۴

زندگی کا سفر

امجد اسلام امجد، غلام سرور ساگر، یوگیندر بہل تشنہ، سلیم آغا قزلباش، جاوید زیدی، فیصل عظیم، کرامت بخاری، شگفتہ نازلی۔ ۱۰۶

ایک صدی کا قصہ

کے۔ آصف ---------- دیپک کنول ۱۱۱

ورثہ

ہمارے درد صوفی ہیں -------- بخشش مہرانوی ۱۱۵

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین -------- وقار جاوید ۱۱۶

☆

''آستانِ شباب''

اِک زمانہ ہے مدح خوانِ شبابؔ
ایک دُنیا ہے قدر دانِ شباب

دَرد کا ہے بیان بیانِ شبابؔ
داغؔ کی ہے زبان زبانِ شباب

خوب برجستہ ہے زبانِ شبابؔ
صاف ہے شُستہ ہے بیانِ شباب

اللہ اللہ یہ عروجِ نیاز
میرا سَر اور آستانِ شباب

کیفِ دل کیفِ روح کیفِ حیات
کتنی دل کش ہے داستانِ شباب

منہ ہے چھوٹا مگر ہے بات بڑی
کس طرح مجھ سے ہو بیانِ شباب

حَدِّ تحریر میں نہیں آتی
اللہ اللہ عزّ و شانِ شباب

تا ابد سلسلہ رہے یہ رشیؔ
میرا سَر اور آستانِ شباب

رشیؔ پٹیالوی (بھارت)

○
○○
○○○

قرطاسِ اعزاز

○○

ڈاکٹر شبابؔ للت

○○

کے نام

○○○
○○
○

''دولتِ یقیں''

عروب شاہد
(اسلام آباد)

نام : بھگوان داس للت
ادبی شناخت: ڈاکٹر شباب للت
ولد : رام کرشن للت
پیدائش : ۳؍اگست ۱۹۳۳ء، خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ (حال پاکستان)
تعلیم : ایم۔اے (تاریخ) ۱۹۵۶ء پنجاب یونیورسٹی (بھارت)
// // (اردو، گولڈ میڈلسٹ) ۱۹۶۴ء // //
پی۔ایچ۔ڈی (اردو ادب) ۱۹۹۳ء // //
پیشہ ور تعلیم : بیچلر آف ٹیچنگ (۱۹۵۴) // //
بنیادی ڈپلومہ برائے میڈیا آپریشن (۱۹۷۴ء) دہلی
مصروفیات : سب ایڈیٹر اردو روزنامہ ''ویر'' دہلی، ۵۳۔۱۹۵۲
ایڈیٹر اردو ماہنامہ ''لہریں'' روہتک، ۵۴۔۱۹۵۳ء
ٹی۔جی۔ٹی حکومت پنجاب (بھارت) ۵۷۔۱۹۵۴ء
ہیڈ ماسٹر، گورنمنٹ ہائی سکول، کانگڑہ، ۶۱۔۱۹۵۷ء
// // ایچ۔آر۔سیکنڈری سکول، کانگڑہ، ۶۶۔۱۹۶۱ء
فیلڈ آفیسر، وزارت آئی۔اینڈ۔بی، ۹۱۔۱۹۶۶ء
مہمان مدیر، ''جدید فکر و فن'' (ہماچل پردیش) ۲۰۰۵۔۱۹۹۴ء

شعری تخلیقات:

۱۔ مضراب (حکومت پنجاب سے انعام یافتہ) ۱۹۶۱
۲۔ چٹوار (ایضاً) ۱۹۶۴
۳۔ پُروائی (ایضاً) ۱۹۶۷ء
۴۔ منزل منزل (یو۔پی اردو اکادمی سے انعام یافتہ) ۱۹۷۰ء
۵۔ صحرا کی پیاس (ایضاً) ۱۹۷۳ء
۶۔ اُڑان (ایضاً) ۱۹۷۶ء
۷۔ دریاؤں کا سفر (بنگال اردو اکادمی سے انعام یافتہ) ۱۹۸۰ء
۸۔ زرد موسموں کے درد (لینگویج انسٹیوٹ، میسور سے انعام یافتہ) ۱۹۸۳ء
۹۔ سمندر پیاسا ہے (ہماچل اکادمی آف آرٹ سے انعام یافتہ) ۱۹۸۶ء
۱۰۔ آنچ برف زاروں کی ۱۹۸۸ء
۱۱۔ اجنبی ہوا (ہماچل اکادمی سے انعام یافتہ) ۱۹۹۶ء
۱۲۔ زندگی اک سمجھوتہ ۲۰۰۵ء

ہندی:

۱۔ چٹوار ۱۹۷۲ء
۲۔ دھنک میری چیتنا کی ۱۹۷۴ء
۳۔ اپنی تلاش میں ۱۹۸۶ء
۴۔ تیرتے چٹان ۱۹۹۴ء
۵۔ ہم ٹھہرے بڑے آدمی (طنزیہ مضامین) ۲۰۰۱ء
۶۔ مسکانوں کی رم جھم میں (طنز و مزاح) ۲۰۱۲ء

ہماچل شاعری:

۱۔ بھگسو دے نونے ۱۹۷۵ء
۲۔ گجی چوٹ ۱۹۸۹ء

ادبی تنقید:

۱۔ متؔ لکھنوی ایک مطالعہ ۱۹۹۶ء
۲۔ آئینوں کے روبرو (اٹھارہ مضامین) ۲۰۰۷ء
۳۔ قلم کرشمے (زیرِ طبع) .....

تحقیق:

دو معلمات بملا دیوی اور کرن ٹھاکر نے ۲۰۰۳ اور ۲۰۰۴ میں ہندی کی کتب (۱) شباب للت کا مجموعہ مضامین (۲) شباب للت کا شعری شعور کے عنوان سے ایم۔فل کے مقالے تحریر کر کے ڈگریاں حاصل کیں۔

تدوین:

قریب ایک درجن کتب کی تدوین جن میں تین ہماچل پردیش اکادمی کے تحت (۱) وجود و عدم (۲) نویدِ سحر (۳) درد کو ہساروں کا وغیرہ۔

مختصر سوانح:

(۱) گلشن نادونوی مرحوم (۲) ساغر پالم پوری (۳) سودرشن کوشل برائے ہماچل اکادمی (ہندی میں)

ترجمہ:

تین درجن سے زائد اردو، ہندی کتب جن میں رشی وید ویاس کی

گرو گیتا، تاریخِ ریاست، تاریخ کہلور برائے ہماچل اکادمی، ''Gyneack'' برائے نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی۔

فرائض:

۱۔ جنرل سیکرٹری انجمن ترقی اردو (ہندی) ہماچل پردیش۔
۲۔ جنرل سیکرٹری بزم ادب ہماچل پردیش۔
۳۔ ممبر ہماچل اکادمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز۔
۴۔ ممبر گورننگ باڈی ہماچل اکادمی (۱۹۸۴۔۱۹۸۹)

ادارت:

مہمان مدیر سہ ماہی ''جدید فکر و فن''، لینگویجز اور کلچر ڈیپارٹمنٹ ہما چل پردیش (۱۹۹۴ء تا ۲۰۰۵ء)

مشاغل:

مقرر، معاہداتی شاعر آل انڈیا ریڈیو (۱۹۵۸ء تا ۱۹۷۲ء) اردو پاک کے تمام مستند اردو، ہندی، پنجابی جرائد کے علاوہ امریکہ، برطانیہ، پاکستان، بنگلہ دیش اور ناروے کے جرائد میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں شباب صاحب کے مضامین اور کلام مذہبی و روحانی مزاج کے حامل جرائد میں بھی تواتر سے شائع ہوتے ہیں۔ شباب صاحب کا ایک اختصاص ہندوستان کے تمام ریڈیو اسٹیشن سے اردو، ہندی، پنجابی اور ڈوگری زبان میں سنجیدہ، مزاحیہ، طنزیہ مضامین اور کلام باقاعدگی سے نشر ہوتے ہیں۔

اعترافِ ہنر:

شباب صاحب کی ساٹھ سالہ علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں نامور ادیب اور عالمی اردو ادب کے مدیر جناب نند کشور وکرم نے دسمبر ۲۰۰۵ء میں ''شباب للت شخصیت اور خدمات'' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب دہلی سے شائع کی جس میں ہر طبقہ اور مزاج سے تعلق رکھنے والے اہلِ قلم نے شباب صاحب کی شخصی و فنی جہات کا احاطہ کیا ہے۔

اعزازات:

۱۔ ہماچل شری (ہیموت کرش ہماچل)	۱۹۹۸ء
۲ ہماچل رتن (آل انڈیا اٹلیکچول)	۲۰۰۱ء
۳۔ آبشارِ ادب (نورنگ لدھیانہ)	۲۰۰۴ء
۴۔ ادبی انعام (سرمور ساہتیہ کلا پریشد)	۲۰۰۴ء

☆

○

جناب شباب للت ایک معروف صاحبِ قلم ہیں اور ہر مکتبہ فکر کے شعراء و ادباء کے حلقے میں ان کی شعری تخلیقات قدر و منزلت کی نگا سے دیکھی جاتی ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں ان کا پہلا مجموعہ ''مضراب'' شائع ہوا۔ مشق کے آٹھ دس برس بھی اس میں شامل کر لئے جائیں تو ان کے شعری سفر اور ادبی زندگی کی مدت ۵۰۔۶۰ برس کو محیط ہے۔ ان کے آٹھ مجموعے ملک گیر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اور نویں تصنیف ''سمندر پیاسا ہے'' پیشِ نظر ہے۔

مبدءِ فیاض نے ان کو جہاں پُر گوئی اور زود گوئی کے اوصاف سے نوازا ہے۔ وہاں خوش گوئی کا امتیازی وصف بھی عطا کیا ہے۔ اپنے عہد کے چلن کے مطابق ان کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی۔ فن، زبان اور عروض پر دسترس حاصل کرنے کے بعد انھوں نے جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ وہ ادب کی مختلف تحریکوں اور نظریات سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ لیکن کسی تحریک سے مکمل وابستگی کا الزام ان پر عائد نہیں ہوتا۔ صحت مند روایت کی پاسداری، ترقی پسندی کا طلسم، اور جدیدیت کی خوشبو ان کی تخلیقات میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ لیکن ایسے امتزاج کے ساتھ جو ان کے مزاج کی بوقلمونی، تصیل کی پرواز اور عصری حسّت کی معنیٰ آفرینی کو خوش سلیقگی کے ساتھ ذریعہ ترسیل و ابلاغ بنا دیتا ہے۔ یہ ان کی برسوں کی ریاضت، مطالعے اور گہرے مشاہدے کا ثمرہ ہے۔ شعر کہنے کے ہنر کی اس انفرادیت نے ان کی قوتِ اظہار اور اندازِ بیان کو ایسی رعنائی عطا کر دی ہے کہ وہ ''چاندنی اور دھوپ'' کا ذکر کریں تو لطافت اور حرارت کا احساس ہونے لگتا ہے ''جگنو'' کا لفظ کہیں آجائے تو روشنی کی ٹمٹماہٹ متشکل ہو جاتی ہے۔ اور صحرا دشت یا جنگل کی علامتوں کو استعمال یں لائیں تو ویرانی، تپش اور محرومی و ناکامی کے عفریت منہ پھاڑے سامنے آجاتے ہیں۔ آپ اسے امیجری کہہ لیں یا اعجاز و ایجاز، ترسیل و ابلاغ کی یہ خوبی ان کی غزلوں اور نظموں میں آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔ شباب للت کے غزلیہ اشعار میں شادابی، تازگی اور بانکپن ہے۔ ان کے یہاں قافیہ، ردیف سے خیال کا پیکر نہیں تراشا جاتا۔ بلکہ تخیل اس قدر حسن اور ندرت کا حامل ہوتا ہے کہ قافیہ اور ردیف اس پر پروانہ وار نثار ہو جاتے ہیں۔

ساحر ہوشیار پوری (بھارت)

دربارِ محمدؐ

(شباب للت)

حاصل نہ ہوا گو مجھے دیدارِ محمدؐ دیتا ہے مجھے روشنی کردارِ محمدؐ
ہرآیتِ قرآں ہے طہارت کا خزینہ احکام ہیں یزداں کے بگفتارِ محمدؐ
اے خاکِ مدینہ تجھے آنکھوں سے لگالوں دامن ہے ترا مطلعِ انوارِ محمدؐ
دشمن کا بھی مانگا نہ بُرا بلکہ دُعا دی دیکھے تو کوئی جذبۂ ایثارِ محمدؐ
محشر میں کریں گے وہی بخشش کی سفارش ہر سچے مسلماں سے ہے اقرارِ محمدؐ
جنت نہ ملے حشر میں تو اپنی بلا سے خوش ہوں کہ ملے گا مجھے دیدارِ محمدؐ
خودسیرت یزداں کا ہے آئینہ وہ سیرت اک نور کا مینار ہے کردارِ محمدؐ
گلہائے نوازش ذرا دوچار اِدھر بھی صدقے تیرے اے دامنِ گلبارِ محمدؐ
کرتے رہیں توحید کے چشمے اسے سیراب شاداب و شگفتہ رہے گلزارِ محمدؐ
محبوبِ الٰہی وہ رسول عربیؐ ہے کُل امتِ اسلام ہے دلدارِ محمدؐ
انسان کو انسان بنانا ہے ابھی تو ہے تشنۂ تکمیل ابھی کارِ محمدؐ
منعم سے زیادہ یہاں مفلس کی ہے پرسش دربارِ محمد ہے یہ دربارِ محمدؐ

میرا بھی ہے مخدوم وہ محبوبِ الٰہی
میں بھی شبابؔ ادنےٰ پرستارِ محمدؐ

''خلعتِ زریں''

فاری شا

(لندن)

۲ر نومبر ۱۹۶۳ء
دہلی۔

عزیز محترم شباب صاحب، نمستے۔

محبت نامہ ملا۔ انعام ملنے پر، امتحان میں کامیابی پر اور سب سے بڑھ کر شادی خانہ آبادی پر مسرت ہوئی مکرّر مبارکباد! جواب میں کچھ تاخیر عزیزی جگن ناتھ کے باعث ہوئی جوان دنوں دہلی سے باہر تھا۔ کلام پر جگن کی رائے ملفوف ہے۔ میری صحت پہلے سے بہتر ہے لیکن کچھ شکایات باقی ہیں اور عمر کا تقاضا بھی ہے۔ خیر طلب

تلوک چند محروم

۶ر دسمبر ۱۹۷۸ء
نکودر۔

خط ہی نہیں ہمدردی و بیمار پرسی کا شکریہ، عرصہ سے صاحبِ فراش ہوں۔ بس پر چڑھتے وقت اُلٹا گر پڑا تھا۔ کولہے کے نزدیک کی ایک ہڈی نیچے کی جانب جھک گئی۔ اُس وقت تو لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو گیا مگر ایک سال بعد چوٹ پھر سے جاگ اُٹھی۔ دو چار قدم بھی چلنے سے معذور ہو گیا ہوں۔ دہلی کے ڈاکٹروں نے بہ وجہ زیادتی عمر آپریشن کی ذمہ داری سے انکار کر دیا ہے۔ وہاں دوسرے ڈاکٹروں کی رائے بھی یہ ہی تھی کہ جسم کو حرکت دینے اور ٹانگ پر زور دینے سے پرہیز کیا جائے۔ یہ کام نکودر میں بھی ہو سکتا تھا لہٰذا میں نکودر واپس آ گیا ہوں۔ ڈاکٹروں کی ہدایت پر عمل کیے جاتا ہوں اور ہر طرح کی حرکت سے پرہیز کرتا ہوں۔ باقی حالات اچھے اور درست ہیں خدا بچوں کی عمر دراز کرے۔

جوش ملسیانی

۲۶ر مئی ۱۹۷۹ء
دہلی۔

پیارے شباب للت!

تم نے ایک خوبصورت چیز بھونڈے آدمی کو بھیج دی۔ میں نے نظر بد سے بچانے کے لیے تمام تصویریں ایک خوبصورت انسان کو دے دیں۔ یعنی چیف ایڈیٹر ''ملاپ'' کو۔ کاغذ کی گرانی کے دور میں تصویریں چھاپنے کا ہنر اُنھوں نے اپنے پاس محفوظ کر لیا ہے۔ ہم تو صرف ڈاکیے ہیں یا تصویریں چھپنے کے بعد اُن کی داد دینے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔

فکر تونسوی

۱۲ر جون ۲۰۰۳ء
جموں، کشمیر۔

''ہمہ شب اُمید دارم کہ نسیم صبح گاہی
زنوائے آشنائے نبد از و آشنارا''

برادر عزیز، لیکن آپ نے تو جہاں تک ''جدید فکر و فن کا تعلق ہے'' مجھے حلقہ بیرون در میں شامل کر دیا ہے۔ زمانہ ہو گیا ہے میں مذکورہ جریدے کی شکل دیکھنے کو ترس گیا ہوں۔

''مکن تغافل ازیں بیشتر کہ می ترسم
گماں بہ نہ کہ ایں بندہ بے فدادنہ است''

آپ نے منوّر صاحب کی یاد زندہ رکھنے کے لیے ان پر تھیسس لکھا۔ اس سے زیادہ ایک باصلاحیت شاگرد اور کیا کر سکتا تھا۔ میں نے اس پر تبصرہ کیا جو پاکستان کے کسی ماہنامے میں شائع ہوا۔ اب اس وقت یاد نہیں آ رہا ہے کہ کس جریدے میں تبصرہ کیا۔ عمر بھی ۸۵ برس سے تجاوز کر گئی ہے۔ بشرطِ زندگی ۵ر دسمبر کو چھیاسیواں سال شروع ہو جائے گا۔ آج صورت یہ ہے کہ لوگ منوّر صاحب کو بھی بھول گئے ہیں اور اُن کے ساتھ ان کے شاہکار ''کمار سنبھو'' کو بھی۔ ''کمار سنبھو'' نامی کتاب میں (یعنی منور لکھنوی صاحب کے منظوم ترجمے میں) غالباً تین دیباچے تھے۔ ان میں سے ایک میرا تھا۔ میں نے اسے محفوظ رکھنا چاہا اور اتفاق کی بات ہے کہ ''کمار سنبھو'' کی ایک جلد بھی مل گئی۔ اس کے ذریعے سے مجھے میرا دیباچہ بھی موصول ہو گیا۔ چنانچہ میں نے اسے اپنی کتاب ''تعمیرِ فکر'' میں محفوظ کر لیا ہے۔ کتاب کی دو جلدیں حاضر ہیں۔ ایک آپ کی نذر ہے اور دوسری جلد ''جدید فکر و فن'' میں تبصرے کے لیے ہے۔ ''جدید فکر و فن'' میں اس پر تبصرہ دیکھنے کا اشتیاق رہے گا۔ مذکورہ دیباچہ اسی کتاب میں ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ اس دیباچے کو ایک مضمون کی صورت میں ''جدید فکر و فن'' کے کسی شمارے میں شامل کر کے اسے محفوظ تر کر لیں۔

(''تعمیرِ فکر'' کو منظرِ عام پر آئے چند روز ہی ہوئے ہیں۔ تبصرے کے لیے یہ کتاب ابھی دو تین احباب ہی کو گئی ہے۔ ان میں ایک آپ ہیں۔ میں بھی اس کتاب کو جلد مشتہر نہیں کرنا چاہتا۔ آپ پر یہ اعتراض نہیں ہو گا کہ آپ نے ایک مطبوعہ مضمون کو شائع کیا ہے۔ منور صاحب آپ کے اُستاد تھے، میرے ایک رہنما تھے۔ اس مضمون کو چھاپنا بھی ان کی یاد کو تازہ کرنا ہے)

جگن ناتھ آزاد

۱۶ر نومبر ۲۰۰۷ء
دہلی۔

محبِ مکرم ڈاکٹر شباب للت صاحب۔

آپ کا نوازش نامہ ملا۔ آپ کے نام اور کام سے کوئی بدنصیب ہی ہوگا جو واقف نہ ہوگا۔ میں آپ کا ایک ادنیٰ مداح ہوں۔ ہر چند کہ میری محرومی ہے کہ ابھی تک نیاز حاصل نہیں کر سکا۔ کاش جس کام کے لیے آپ نے لکھا ہے، اُسے میں کر سکتا۔ ساہتیہ اکادمی میں کتابیں نہیں خریدی جاتیں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں ضرور خریدی جاتی ہیں لیکن وہاں سے اب میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ کی کتاب کی ایک جلد میرے پاس ہے جہاں سے ممکن ہوگا میں اس کے لیے کوشش کروں گا۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

گوپی چند نارنگ

۲۰/اکتوبر ۱۹۶۷ء
جموں، کشمیر۔

آپ سے جموں کے ایک مشاعرے میں ملاقات ہوئی۔ آپ مشاعرہ کنڈکٹ کرنے کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ آپ کے اعلان میں نثر سے زیادہ نظم ہوتی تھی اس لیے شاعر سے زیادہ داد آپ مار جاتے تھے۔ آپ اردو کے ایم۔اے ہیں اس لیے میں نے آپ کو خود سے نزدیک محسوس کیا۔ آپ کا مجموعہ کلام ''پتوار'' نظر سے گذرا۔ شروع ہی میں ایک شعر نے متوجہ کر لیا۔

جب نظر آیا کوئی پژمردہ پھول
ہند کے اہلِ قلم یاد آ گئے

مزید مطالعے سے اندازہ ہوا کہ آپ کی غزلوں سے انتخاب کیا جائے تو چونکا دینے والے متعدد شعروں کی اچھی تعداد نکل آئے گی۔ وہ جنسِ کم یاب جسے خلوص کہتے ہیں آپ کے کلام میں بہتات سے ہے۔ دو چار نظمیں ہی ایسی ہوں گی جو فرمائشی ہوں ورنہ زیادہ تر ذاتی تجربے اور احساسات کی اکساہٹ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔ آپ کے بعض نقادوں کی رائے ہے کہ آپ کی نظمیں غزلوں سے زیادہ بلند ہیں لیکن مجھے ''مقابلۃً'' آپ کی غزلوں نے زیادہ متاثر کیا۔

مخلص
گیان چند جین

۱۹/دسمبر ۲۰۰۴ء
انبالہ سٹی۔

برادرِ مکرّم شبابؔ صاحب، آداب وتسلیمات۔

اُمید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ لیجیے مضمون بھیج رہا ہوں۔ اس مقدس فریضہ کو نبھانے میں جو غیر معمولی تاخیر ہوئی ہے اس کے لیے ایک بار پھر معذرت چاہتا ہوں۔ یقین جانیے اس تاخیر میں میری نیت کو کوئی دخل نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ میری نااہلیت کے سبب ہوا۔ نثر لکھتے ہوئے مجھے بے حد وحشت ہوتی ہے اور پھر آپ ایسی قدآور شخصیت کے بارے میں لکھنا کارے دارد۔ بہر حال اب جو کچھ بن پایا ہے آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں آگے آپ جانیے:

سپُردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

جہاں تک میرا سوال ہے میں سمجھتا ہوں کہ ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''۔ بہر کیف اگر آپ اسے قبول فرمائیں تو براہ کرم بلاتکلف ہمیشہ کی طرح اس میں مناسب تخفیف، ترمیم یا اضافہ خود فرمالیں۔ اس کے لیے نہ صرف آپ کو پورا اختیار ہے بلکہ میری استدعا بھی ہے کہ آپ اس بات کو یکسر بھول کر کہ یہ آپ سے متعلق ہے، اس کی مطلوبہ اصلاح بھی فرمائیں اور ترمیم بھی۔ اپنے گراں قدر تاثرات سے نوازیے گا۔ ہاں آپ اس کا عنوان بھی بدلنا چاہیں تو بصد شوق کوئی نیا عنوان رکھ لیجیے گا۔ آپ کی ترامیم/ اصلاحات کے بعد اگر اسے دوبارہ لکھنا مطلوب ہو تو ایسا کرنے کے بعد اسے مجھے واپس بھیج دیجیے گا۔ دوسرے جیسا کہ میں نے پچھلے خط میں بھی لکھا تھا پاکستان جانے کے لیے جو تاریخ / تاریخیں آپ کو اپنے حساب سے موزوں لگتی ہوں مجھے فوراً لکھ بھیجیے گا اور اپنے پاسپورٹ کے پہلے اور آخری (دو آمنے سامنے والے) صفحات کی فوٹو نقل بھی واپسی ڈاک سے مجھے بھیجیے گا تاکہ آپ کے لیے وہاں سے دعوت نامہ منگوا سکوں۔ زیادہ اظہارِ خلوص۔ بھاوج محترمہ کی خدمت میں آداب۔ عزیزان کے لیے دعائیں۔

آپ کا
مہندر پرتاپ چاند

۳۱/اگست ۲۰۰۷ء
نیو دہلی۔

مکرمی ومحترمی جناب شباب للت صاحب، آداب وتسلیمات۔

پہلی بار تحریری طور پر آپ کو مخاطب کرنے کی جسارت کر رہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ جناب والا بھی میرے معروضے پر توجہ فرما کر شرف باریابی عطا فرمائیں گے۔ گزشتہ کچھ برسوں سے اہلِ ادب کے سوانحی خاکے ترتیب دینے میں مصروف ہوں، جن میں اب تک پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ، قتیلؔ شفائی، مجروحؔ سلطانپوری، پروفیسر عنوانؔ چشتی، پروفیسر حفیظؔ بنارسی، مجتبیٰ حسین، بلراج کومل وغیرہ پر سوانحی خاکے ضابطۂ تحریر میں آ چکے ہیں، جو اردو اکادمی دہلی کے ماہنامہ ''ایوانِ اردو''، ''راشٹریہ سہارا'' کے ''امنگ'' ایڈیشن اور ''عالمی سہارا'' اردو میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ آپ جیسی مقتدر، عہد ساز ادبی شخصیت بھی اگر اس میں شامل ہو جائے تو اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ براہِ کرم اپنے سوانحی کوائف، خواہ وہ طبع شدہ ہی کیوں نہ ہوں، اپنی دو پاسپورٹ سائز تصاویر کے ساتھ ارسال فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ مکمل سوانحی حالات کے لیے بطور اشاریہ ایک کوائف نامہ ترتیب دیا ہے جو حاضر خدمت ہے تاکہ جملہ سوانحی حالات ریکارڈ میں آ سکیں۔ اُمید قوی

ہے کہ اردو کی آئندہ نسل کے لیے یہ خاکے اہمیت کے حامل ہوں گے۔
خدا کرے آپ تادیر اردو ادب میں درخشاں سورج کی طرح روشن رہیں۔آمین!

خیر طلب
ڈاکٹر ظفر مرادآبادی

۱۹؍جون ۱۹۷۹ء
پونہ۔

مکرمی شباب للت صاحب، آداب عرض۔

''ادب نکھار'' کے تازہ شمارے میں آپ کی ''معذرت'' پڑھی بے حد پسند آئی، مبارکباد۔۔!مدعائے تحریر یہ ہے کہ میں اردو نظموں کا ایک مجموعہ مرتب کررہا ہوں جس میں اردو زبان کی تعریف میں لکھی گئیں نگارشات شامل کر رہا ہوں۔اس سلسلے میں اب تک جن مشاہیر شعراء کرام کی نظمیں موصول ہوئی ہیں ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں۔

عزیز قریشی، مفتوں کوٹوی، شاطر حکیمی، اعجاز صدیقی، رونق دکنی سیمابی، علامہ شہباز صدیقی، علامہ جمیل مظہری، رضا مظہری، سرور مرزائی، اعجاز غالبی، محبوب راہی، دلدار ہاشمی، جگن ناتھ آزاد، نیاز فتح آبادی، کرشن موہن، ہادی دہلوی، حفیظ، ملیگاؤی، عتیق احمد عتیق کے علاوہ اور بہت سے شعرائے کرام۔آپ سے گذارش ہے کہ آپ بھی مذکورہ بالا موضوع پر اپنی نگارش مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

فقط
نذیر فتح پوری

۲۳؍اپریل ۱۹۹۸ء
چندی گڑھ۔

محترم شباب للت صاحب، آداب۔

آپ اپنی مصروفیات کے باوجود بھی خط کا جواب اتنی جلدی دے دیتے ہیں کہ مجھے خود پر شرم آنے لگتی ہے۔میں بھی کوشش کروں گی کہ آپ کی اس خوبی کا مجھ پر بھی کچھ اثر ہو۔اُمید کرتی ہوں آپ کا سفر اچھا رہا ہوگا اور گھر پر سب خیریت سے ہوں گے۔

ڈاکٹر ہارون ایوب کے اچانک انتقال نے ہلا کر رکھ دیا۔۳؍اپریل کو میں اُن سے مل کر آئی اور آنے والے دنوں کا پروگرام بھی بنالیا لیکن کسے معلوم تھا کہ اگلی صبح ہی وہ اس دنیا کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔وہ نہ صرف میرے Guide تھے بلکہ رہنما بھی تھے۔آج میں اردو زبان کے جس مقام پر ہوں اس کا پورا Credit اُن کو جاتا ہے۔ہماری ان سے ملاقات کوئی بیس سال پرانی تھی۔ابھی بھی یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید کسی دن اچانک ان سے ملاقات ہوجائے، شاید اُن کا فون آجائے لیکن حقیقت تو اس کے برعکس ہے۔خُدا ان کو جنت نصیب کرے اور میڈم ریحانہ اور اُن کے لختِ جگر کو غم سہنے کی طاقت عطا کرے۔
دُنیا کا کاروبار تو چلتا ہی رہتا ہے۔میرا جو کام ادھورہ رہ گیا ہے وہ کسی نہ کسی طرح پورا ہوجائے گا لیکن اُن کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔

آپ نے جو تین عنوان خط میں لکھے تھے اُن میں سے سب سے اچھا ''کچھ ہم سے کہا ہوتا'' لگا۔ایک اچھے اور سلجھے ہوئے ادیب کی سنگت کا یہی فائدہ ہوتا ہے۔کل یہاں پر Indo-Pak مشاعرہ بھی تھا۔بہت لطف آیا۔بہت اچھے اچھے شعراء آئے ہوئے تھے۔مجھے یہ لگا شاید آپ بھی غالب والے Seminar میں شرکت کریں گے لیکن آپ کو وہاں نہ پاکر مایوسی ضرور ہوئی۔
خیر اب جب کبھی بھی چندی گڑھ آنا ہو تو ملے بنا نہیں جایئے گا۔اگلے خط میں دوسری غزل اصلاح کے لیے روانہ کروں گی۔اس بار آپ کو بہت محنت کرنی پڑی ہے۔آپ نے میری عادتیں بگاڑ دی ہیں اور اسی لیے آپ کو بار بار زحمت دوں گی۔نیک دعاؤں اور خواہشات کے ساتھ۔

رینو بہل

۲۱؍مئی ۲۰۰۳ء
دہلی۔

محترم ڈاکٹر صاحب، سلام ورحمت۔

آپ کا ۶؍مئی کا مرقوم خط مجھے ۱۹؍مئی کو ملا۔ڈاکٹر شباب للت کا خط پاکر کتنی مسرت ہوئی بیان نہیں کرسکتا۔اس لیے نہیں کہ وہ اردو کی بڑی ہستیوں میں سے ایک ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ آج کے اُن گنے چنے شعرا میں سے ہیں جنہیں میں پسند کرتا ہوں اور جنہوں نے مجھے ہمیشہ ہی متاثر کیا ہے۔ڈاکٹر صاحب میرے پاس بہت سے رسالے آتے ہیں ہر رسالے میں غزلیں ہوتی ہیں بس یہاں وہاں نگاہ ڈال لی اور آگے بڑھ گیا۔لیکن اگر ڈاکٹر شباب للت کی غزل پر نظر پڑ جاتی ہے تو وہیں ٹھہر جاتی ہے۔ایک ایک لفظ متوجہ کرتا ہے غور وفکر پر مجبور کرتا ہے۔معانی، مفاہیم اور خیالات کے اظہار کے لیے جن الفاظ کا استعمال اور جس اسلوب کے ساتھ آپ کرتے ہیں وہ صرف آپ کا حصہ ہے جو آپ کو دوسروں سے الگ کرتا ہے اور ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔آپ کے اشعار PITHY ہونے کے باوجود اتنے شگفتہ ہوتے ہیں کہ قاری تادیر ان سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔میں نے تو یہی محسوس کیا ہے۔کئی رسالوں میں آپ کی غزلوں پر اپنے تاثرات بھیج چکا ہوں، بالکل یاد نہیں آرہا ہے لیکن ابھی کچھ ہی عرصہ قبل کسی رسالے میں اپنے خط میں میں نے آپ کا کوئی شعر بھی CITE کیا تھا جو گزشتہ شمارے میں پڑھا تھا۔

میری ناواقفیت اور نامعلومیت کا عالم یہ ہے کہ آپ کے خط سے پہلی بار علم ہوا کہ شملہ سے بھی کوئی رسالہ ''جدید فکر وفن'' نکلتا ہے۔بہرحال حسب الحکم ایک تازہ اور غیر مطبوعہ افسانہ ارسال خدمت ہے۔رسیدگی کی اطلاع اگر آپ دے سکیں تو مجھے مزید خوشی ہوگی۔آپ کا خط پاکر واقعی بہت اچھا لگا۔اللہ

آپ کو اچھا رکھے۔

مخلص

اقبال انصاری

۷/نومبر ۲۰۰۶ء

لدھیانہ۔

برادر محترم شباب للت صاحب، آداب۔

میں نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ آپ کا مضمون رجسٹرڈ ڈاک سے مجھے مل گیا ہے۔ میں ایک بار پھر آپ کا بے حد مشکور ہوں۔ آپ نے بہت محنت اور لگن سے مضمون لکھا ہے۔ اس میں کچھ بھی غیر ضروری نہیں ہے۔ اسے اسی شکل میں کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ یہ اطلاع باعثِ مسرت ہے کہ مضامین پر مشتمل آپ کی کتاب ''بشرطِ زندگی'' عنقریب شائع ہو رہی ہے اور آپ اس میں مذکورہ مضمون شامل کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں اجازت طلب کرنے کی کیا بات ہے! میں ممنون ہوں کہ آپ نے ناچیز کو اس قابل سمجھا۔ تمام حقوق آپ کے پاس ہیں۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

کیول دھیر

۱۴/فروری ۲۰۰۵ء

نواکدل، سری نگر،

کشمیر۔

محترم و مکرم شباب للت صاحب۔

سلام و رحمت۔ اُمید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

آپ کا ۲۰/جون کا ارسال کردہ خط چند یوم قبل موصول ہوا۔ جواب فوری طور دینے میں حاضر نہ ہو سکی جس کے لیے معذرت چاہتی ہوں۔ ''جدید فکر و فن'' کا ایک شمارہ بھی ملا۔ شمارہ معیاری ادب سے بھرپور ہے دل خوش ہوا۔ اب شمارہ ۴۳ دیکھنے کا اشتیاق ہے اس لیے کہ اس میں آپ کی کہانی ''ہمالین کوئین'' شائع ہو رہی ہے اس کہانی کے عنوان میں اس قدر کشش ہے کہ بیان نہیں کر سکتی۔ اس عنوان نے مجھے از حد متاثر کیا۔ آپ نے شمارہ ۴۳ میں میرے مضمون کو بھی جگہ عطا فرمائی ہے جس کے لیے از حد ممنون ہوں۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ آپ بنگلہ دیش کی لڑائی کے دوران سری نگر تشریف لائے ہیں۔ اُن دنوں میری عمر چھ سات سال کی ہوگی بنگلہ دیش کی لڑائی کا مجھے علم نہیں ہے بہت چھوٹی تھی، میں نے ۱۹۷۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا ہے۔ اب کبھی کشمیر آنا ہوا تو غریب خانے پر ضرور تشریف لائیے گا۔ آپ کی بہت ساری کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں کیا آپ بطور تحفہ کسی کتاب کی ایک کاپی ارسال کرنے کی زحمت فرمائیں گے۔ کرشن کمار طور صاحب بھی ''رسالہ سرسبز'' کا تازہ شمارہ جلد ہی منظر عام پر لا رہے ہیں۔ جان کر از حد مسرت ہوئی۔ انشاء اللہ جلد ہی ان کے رسالہ کے لیے ایک مضمون ارسال کر دوں گی۔ آپ کی خدمت میں ''دشتِ تنہائی'' کی ایک کاپی ارسال کر چکی ہوں پڑھ کر اپنی تنقیدی رائے سے نوازیئے گا یہ میرا پہلا مجموعہ ہے، دوسرا ابھی زیر ترتیب ہے۔ ''جدید فکر و فن'' کے لیے اپنی شعری تخلیق ارسال کر رہی ہوں اگر قابل اشاعت ہو تو رسالہ میں جگہ دیجئے گا۔

سیدہ نسرین نقاش

۲۵/مارچ ۱۹۷۷ء

شملہ۔

محبی شباب صاحب، تسلیم۔

آپ شاید جناب سجاد ظہیر مرحوم کی شخصیت اور قومی و ادبی خدمات سے بخوبی واقف نہ ہوں۔ وہ لکھنؤ کے ایک نہایت ہی اعلیٰ خاندان کے چراغِ چشم تھے اور لندن سے ۱۹۳۰ء میں بار۔ ایٹ۔ لاء کیا۔ مگر ہندوستان واپس پہنچ کر اپنی ساری خدمات رجعت پسند طاقتوں سے لڑنے اور ترقی پسند قوتوں کو متحد کرنے میں لگائی۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب، شاعر اور سیاسی مفکر تھے۔ ترقی پسند تحریک کے روح رواں تھے۔ وہ اس دیش کی نمائندگی باہر کے ملکوں میں بھی کرتے رہے اور ستمبر ۱۹۷۳ء میں رُوس میں جب ایک اہم ایشیائی کانفرنس میں بھارت کی نمائندگی کر رہے تھے تو اچانک انتقال فرما گئے۔

تمام پردیشوں میں سجاد صاحب کی یاد میں میموریل کمیٹیاں قائم کی جا رہی ہیں اور ایک سینٹرل کمیٹی ہوگی جس میں کہ ہر صوبہ سے نمائندے لئے جائیں گے۔ فراہم شدہ فنڈز اردو ادب کو فروغ دینے کو استعمال کیے جائیں گے جس کی مختلف انجمنوں کو بہت ضرورت رہتی ہے۔

آپ کو اس کمیٹی میں ضلع کانگڑا، دھرم سالہ، نور پور وغیرہ پالم پور کے لیے ساغر بیچ ناتھ کے لیے نرسنگھ دیا سے اس اُمید کے ساتھ کنوینر مقرر کیا جاتا ہے کہ آپ نہایت تندہی سے اس کام کو سرانجام دیں گے۔ رسید بکس آپ کو کمیٹی کے سیکرٹری مسٹر جمال بھیج دیں گے۔ چیک بھی آپ سیکرٹری سجاد ظہیر میموریل کمیٹی کے نام لے سکتے ہیں۔ مگر چیک پردیش سیکرٹری کو مندرجہ بالا پتہ پر بھیجنا ہوگا۔ میں ذاتی طور پر بحیثیت صدر کمیٹی درخواست کروں گا کہ آپ اس کام میں مجھے پُورا تعاون دیں تاکہ ہمارے پردیش میں بھی سجاد ظہیر مرحوم کا نام زندہ رہے اور فنڈز ادب کی ترقی کے لیے استعمال کیے جا سکیں۔

آپ سے استدعا ہے کہ آپ ایک کمیٹی بنا لیں جس میں ادب نواز حضرات اور اردو زبان کے پرستار بھی شامل کیے جائیں۔ جو زیادہ سے زیادہ فنڈز فراہم کرنے میں مدد و معاون بن سکیں۔ کمیٹی کی تفصیلات سے ہمیں فوراً آگاہ کریں۔

نیاز کیش

لال چند

(وزیر جنگلات، ہماچل پردیش)

براہِ راست

سینئر اور بزرگ اہلِ قلم کی زبانی اکثر ادب آداب اور تہذیب وتمدن کی کمیابی اور زوال کا نوحہ اکثر سننے میں آتا ہے۔ ہم اور ہماری نسل کے لوگ بھی اُن کے ہمنوا دکھائی دیتے ہیں۔ صورت حال سنگین ہونے کے باوجود مایوس کُن ہرگز نہیں۔ ہمارے درمیان ابھی بھی ایسے بلند قامت، کشادہ دل اور کشادہ ذہن اہلِ قلم دستیاب ہیں جو نہ صرف اپنے بزرگوں اور برگزیدہ ہستیوں کا دل سے احترام کرتے اور اُن کی شان میں قصیدے لکھتے بلکہ دیگر مذاہب، اقوام اور تہذیب کا احترام بھی ان کے ہاں خلوص دل سے پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شباب للت کا شمار ایسے ہی پاکیزہ اور پرخلوص احساسات کے حامل اہلِ قلم میں نمایاں طور پر ہوتا ہے جنہوں نے گئے وقتوں کی تعلیم، تہذیب اور تمدن کے ساتھ آج کے دور کی ترقی اور تہذیب کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی کاوش اور کوشش میں کس قدر کامیاب وکامران ٹھہرے ہیں اس کا درست فیصلہ ذیل کے صفحات کے مطالعہ کی روشنی میں بخوبی لگایا جاسکتا ہے!!!

گلزار جاوید

☆ اس بات سے تو ہم باخبر ہیں کہ آپ تین اگست انیس سو تینتیس مظفر گڑھ میں پیدا ہوئے۔ آپ ہمیں پیدائش سے پہلے اور بعد کا خاندانی پس منظر بتلایئے؟

☆☆ جی ہاں برادرم! میری ولادت ضلع مظفر گڑھ (پنجاب) کے ایک تاجر اروڑہ (کھتری) خاندان میں ہوئی تھی۔ یہاں کے مقامی انتظامات میونسپل کمیٹی کے حوالے تھے۔ یہ قصبہ ڈویژنل صدر مقام ملتان سے ۳۳ میل اور ضلعی صدر مقام سے گیارہ میل جنوب کی جانب کراچی کو جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ قصبہ کی آبادی پانچ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ میرے دادا جناب گوبندہ رام للت قصبہ کے پانچ سرکردہ چوہدریوں میں مقام رکھتے تھے۔ قریبی دیہات میں اُن کی اراضیات اور شہر میں ۱۴ مکانات اور ۲ دوکانیں تھیں۔ نجی کاروبار میں انیٹوں کا ایک بھٹہ تھا۔ موسم گرما میں آموں اور کھجور کے باغات ٹھیکے پر لیتے تھے اور پھل پیک کروا کے پنجاب کے مختلف شہروں میں آڑھتیوں کو بھیجتے تھے۔ اس سارے کاروبار میں ان کے ایک دوست برخوردار خاں (عرف بگو خاں) کی شراکت (بھائیوالی) تھی۔ میرے والد لاڈلے بیٹے تھے کیونکہ دادا جان کی تین اولادوں کے بعد زندہ بچے تھے۔ کم سن بچوں کی اموات یعنی Infent mortality عام ہوتی تھیں۔ پرائمری سکول میں پہلے دن ہی ان کا تلخ تجربہ رہا۔ دادا جان نے پھر انہیں سکول نہیں بھیجا۔ البتہ وہ گرمکھی بھاشا پڑھ لیتے تھے اور کاروباری بھاشا لکھ لیتے تھے جو کرِی کہلاتی تھی اور بہی کھاتے لکھنے میں استعمال ہوتی تھی۔ میرے چچا نے البتہ میٹرک پاس کر کے طبیہ کالج ملتان سے حکیم حاذق کی ڈگری حاصل کی اور خان گڑھ میں ہی اُن کی میڈیکل پریکٹس خوب چل نکلی۔ دادا جان کی دو بیٹیوں نے مقامی سکول میں پرائمری تک تعلیم پائی۔ میری والدہ نے بھی پانچویں درجے تک ہندی اور گرمکھی پڑھی تھی۔

☆ کچھ تفصیل تعلیمی ماحول اور گردوپیش کی یقیناً حافظے میں محفوظ ہونی چاہیے؟

☆☆ ہمارے قصبے میں ڈسٹرکٹ بورڈ کا ماڈل مڈل سکول تھا۔ جس میں میں نے آٹھویں درجے تک تعلیم پا کر ورنیکولر فائنل کے امتحان میں ضلع میں سیکنڈ رہ کر سرکاری وظیفہ حاصل کیا۔ اُنہیں دنوں پنجاب کی کولیشن سرکار میں ہمارے ضلع کے ابراہیم برق جو یونینسٹ پارٹی کے ممبر اسمبلی چُنے گئے تھے وزیر کابینہ برائے تعلیم مقرر ہوئے۔ خضر حیات ٹوانہ پنجاب کے وزیراعلیٰ بنے۔ مڈل سکول میں ہمارے ٹیچر صاحبان بہت محنتی اور مخلص تھے۔ ہیڈ ماسٹر جناب غلام قادر مندوانی بلوچ شفیق محنتی اور صاحبِ ذوق اُستاد تھے۔ لیکن اُستاد صاحبان سخت گیر بھی ہوتے تھے۔ اس لیے امتحانی نتائج بہت تسلی بخش آتے تھے۔ انگریزی اور فارسی کے مضامین پانچویں جماعت ہی سے لازمی مضمون ہو جاتے تھے۔ فارسی نے ایم۔اے تک میرا ساتھ دیا کیونکہ ایم۔اے اردو کے امتحان میں فارسی کا بھی ایک پرچہ لازمی ہوتا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں احقر نے گورنمنٹ ہائی سکول مظفر گڑھ میں نویں درجے میں داخلہ لیا۔ سائنس اور ریاضی نہیں چلا پایا۔ ۸ ماہ بعد مضامین بدل کر اردو اور فارسی پر اکتفا کرنا پڑا۔ ضعفِ بصارت کے باعث عینک اُنہیں دنوں آنکھوں کا زیور بن گئی۔

☆ یہاں شعر وسخن سے آپ کے تعلق اور تعاوف کی بابت اشتیاق فطری امر ہے؟

☆☆ شاعری کے جراثیم کئی بار اسلاف واجداد سے خون میں منتقل ہوتے ہیں۔ میرے نانا جناب شانوں رام سچدیو جو گاؤں رام پور (جہانیاں پیر) کے زمیندار تھے پنجابی میں روحانی شاعری کرتے تھے اور ملتانی بولی میں بھی، جسے اب اہلِ پاکستان نے سرائیکی کا نام دے رکھا ہے۔ شاید اُن کے اس جوہر کے اثرات مجھے بھی ودیعت ہوئے اور میں چوتھی جماعت ہی میں یعنی لگ بھگ نو برس کی عمر میں کچھ مصرعے موزوں کرنے لگ گیا تھا۔ قصبہ میں جناب آشورام آشؔ آریہ سماج سبھا کے مستقل سیکرٹری تھے، انہیں میں نے اپنے اشعار دکھانے شروع

کیے۔ محدود سہی تاہم کچھ رہنمائی اور حوصلہ افزائی ان سے ملی۔ ہمارے سکول کے کھلے آنگن میں گاہے بگاہے مقامی شعرا جو رئیس نواب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، شام کو مل بیٹھ کر ادبی نشست منعقد کرتے تھے۔ ہمارے کچھ استاد صاحبان بھی ان میں حصہ لیتے تھے۔ مجھے بھی وہاں نظمیں پڑھنے کا موقع ملا۔ ایک ایسی ہی نشست میں پہلی بار میں نے اپنی طبع زاد غزل پڑھی۔ جنوبی تحصیل علی پور کے مشہور شعرا ایڈووکیٹ منوہر لال شہیدؔ، اتم چند شرر سیت پوری، جناب جیمنی سرشار (تلمیذ حضرت تلوک چند محروم) اور لچھمن داس تبسم نے ایک دوبار مجھے علی پور کے مشاعروں میں بُلا کر حوصلہ افزائی کی۔ یہ سبھی لوگ پاکستان سے ہجرت کے بعد مشرقی پنجاب (حال صوبہ ہریانہ) کے سونی پت میں آ کر آباد ہوئے۔ مظفر گڑھ کے دورِ تعلیم میں مشہور شاعر نقشؔ صحرائی سے ملاقاتیں رہیں۔ وہ کشفیؔ ملتانی کے تلامذہ میں تھے۔ پہلے بھگوان داس چمنؔ کے نام سے لکھتے تھے بعد میں نقشؔ صحرائی کے نام سے شہرت پائی۔ ان کا گھر مظفر گڑھ شہر میں ریلوے روڈ پر واقع تھا۔ ان کے یہاں ایک بار کشفیؔ صاحب کے بھی نیاز حاصل کیے۔

☆ شبابؔ سے پہلے آپ شمیمؔ تخلص کیا کرتے تھے ازراہِ کرم ہر دو وجوہات کے اسباب بتلائیے؟

☆☆ جی ہاں شباب سے پہلے میرا تخلص شمیمؔ تھا۔ میری پہلی نظم لاہور کے مقبول نیم مذہبی نیم ادبی رسالہ ''اوم'' OM کے اپریل ۱۹۴۶ء کے شمارے میں اسی نام سے شائع ہوئی۔ بعد ازاں بھی تین برسوں تک لاہور اور دہلی کے روزناموں اور رسائل میں اسی نام شمیم للت سے شائع ہوتا رہا۔ میرے چند افسانے بھی ماہنامہ ''رہنمائے زندگی'' اور ''نرالی دنیا'' میں اسی نام سے شائع ہوئے۔ روزنامہ ''پرتاپ''، ''ملاپ''، ''تیج'' کے سنڈے ایڈیشنوں میں چھپتا رہا۔ ''پرتاپ'' کے سنڈے ایڈیشن کے انچارج خان غازی کابلی تھے۔ انبالہ میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے دوران بردارِ معظم نند کشور وکرم سے ملاقاتیں رہیں اگرچہ وہ دوسرے کالج میں پڑھتے تھے۔ ان کے ہمراہ حلقۂ ارباب ذوق کی نشستوں میں بھی شامل ہوا۔ یونیورسٹی ریکارڈ میں میرا نام بھگوان داس شمیم درج رہا۔ لیکن مجھے احساس ہوا کہ یہ تخلص راس نہیں آ رہا۔ خاندان کی مالی مشکلات کے باعث مجھے بھی سخت جدوجہد اور تنگی کا سامنا رہا۔ لہٰذا ضعیف الاعتقادی کے زیر اثر مجھے شمیمؔ کا ہم وزن اور ملتا جلتا لفظ تلاش کرنا پڑا اور شبابؔ کو اپنے قلمی نام کا حصہ بنا کر یونیورسٹی کے ریکارڈ میں بھی ترمیم کروانی پڑی۔

☆ تقسیم ہند کے دوران آپ اور آپ کے خاندان کو کس قسم کی صورت حال کا سامنا رہا نیز مظفر گڑھ سے شملہ آپ کا انتخاب کیوں ٹھہرا؟

☆☆ دیکھئے میرے والدِ محترم سات بچوں کے باپ تھے۔ ہم پانچ بھائیوں اور دو بہنوں کی پرورش و پرداخت اور تعلیم کے اخراجات، ہمارے با روزگار ہونے تک ان کے ذمہ تھے۔ جو تھوڑی بہت جمع پونجی پاکستان سے ہمراہ لا سکے تھے وہ کب تک کفیل ہوتی۔ تقسیمِ ہند کے سال میں بھی بھائی صاحب طبیہ کالج لاہور میں اپنے کورس کے آخری سال میں تھے۔ اور یہ خاکسار دسویں درجے کا طالب علم تھا۔ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو آزادیٔ ہند کا اعلان ہوا تو مشرقی پنجاب اور پاکستانی پنجاب میں یعنی دونوں طرف فسادات کی آگ سلگنے لگی۔ ۹/ستمبر منگل وار کو جب دوپہر میں ہمارے قصبہ کے باہر ۱۵ ہزار بلوائیوں کا ہجوم لنجھر روڈ پر جمع ہو چکا تھا تو اتفاقاً ملتان ڈویژن کے ڈی آئی جی نذیر احمد اپنے دورے پر آ پہنچے۔ اُس فرض شناس فرشتہ سیرت مسلمان افسر نے پہلے تقریر کے ذریعے سمجھا کر ہجوم کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بے اثر ہونے پر فائرنگ کر کے اُس نے ہجوم کو منتشر کر کے اپنی جیپ میں لوگوں کا میل بھر تک تعاقب بھی کیا۔ اُسی روز اُس مومن نے اپنی جیپ میں ہمارے ضلع کے آخری قصبے پنج ندتک دورہ کر کے راستے میں پڑنے والے قصبوں روہیلاں والی، شہر سلطان، علی پور وغیرہ میں امن قائم کیا۔ اسی اثنا میں ہندو پاک کی حکومت کے مابین تبادلۂ آبادی کا فیصلہ ہو گیا۔ ہمارے ضلع کے لیے ریفوجی ٹرینیں وسط نومبر میں مہیا کی گئیں تب تک ہندو آبادی شہر کے اندر محفوظ رہی۔ فوجی ٹرکوں میں ہمارے قصبہ کی ہندو آبادی مظفر گڑھ ریلوے اسٹیشن کے عقب میں لگے مہاجر کیمپ میں پہنچی۔

دو راتوں کے ریل کے سفر کے بعد ہم مشرقی پنجاب کے ریلوے اسٹیشن اٹاری پر پہنچے تو سب کی جان میں جان آئی۔ راستے میں رائے ونڈ ریلوے جنکشن پر ہماری ٹرین رات بھر رکی رہی تھی اور پل پل حملے کا خطرہ بنا رہا تھا۔ ہماری ٹرین تحصیل کروکشیتر کے قصبہ شاہ آباد مارکنڈہ میں خالی کی گئی جہاں گورنمنٹ ہائی سکول میں مہاجر کیمپ تھا۔ وہاں ہفتہ بھر قیام کے بعد ہمارے شہر کے کچھ خاندان بیل گاڑیوں میں اپنے بستر اور چھوٹا موٹا سامان لاد کر بھارت کے سب سے بڑے مہاجر کیمپ کروکشیتر میں منتقل ہو گئے۔ یہ کیمپ لگ بھگ آٹھ میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ دس بارہ روز کے بعد نومبر دسمبر کی شدید سردی کے پیشِ نظر ہمارے دادا جان نے حکم دیا کہ بچوں کو اس سردی میں خیموں میں رکھنا پُرخطر ہے اس لیے قصبہ تھانیسر (کروکشیتر) کے اندر انہوں نے ایک مکان کا نچلہ حصہ کرائے پر لے لیا۔ اسی قصبہ میں ایک مسلمان مہاجر تیلی کا ٹوٹا پھوٹا مکان میرے والد کو الاٹ ہونے تک ہم اُسی کرایہ کے مکان میں مقیم رہے۔ گزشتہ ۶۵ برسوں میں پُرانی پیڑھی وداع ہو چکی ہے سوائے مجھ ناکارہ انسان کے باقی سب بھائیوں، بھتیجوں، چچا زاد بھائیوں سب نے تعلیم حاصل کر کے، محنت اور کفایت شعاری کے طفیل اربن اسٹیٹ میں اپنی اپنی کوٹھیاں بنالی ہیں۔ ان میں سے بیشتر میڈیکل پیشے میں ہیں۔ شملہ کا انتخاب خود اس ناچیز نے نہیں کیا۔ یہ سب کچھ آب و دانہ کے بس میں ہوتا ہے۔ جہاں کا آب و دانہ کاتب تقدیر نے مقدر میں لکھ دیا ہوتا ہے، انسان اُسی کا قیدی بن جاتا ہے۔ کسی نے بالکل صحیح کہا ہے:

دوشے آدمی را بیارد بزور
یکے آب و دانہ، دگر خاکِ گور

یعنی جہاں کا آب و دانہ قسامِ ازل نے مقرر کیا وہاں آدمی خود چل

کر جاتا ہے اور جہاں آدمی نے آخری سانس لینا ہوتا ہے وہاں بھی وہ خود چل کر جاتا ہے۔ وہ جگہ چل کر اُس کے پاؤں تلے نہیں پہنچتی۔ میری پنجاب کے محکمہ تعلیم کی ملازمت کے گیارہ برس ضلع کانگڑہ میں بسر ہوئے۔ یہ پہاڑی ضلع تب پنجاب میں تھا۔ ۱۹۶۶ء سے ہماچل کا حصہ بنا۔ مرکزی حکومت کی وزارتِ اطلاعات ونشریات میں بطور پبلسٹی آفیسر میری تعیناتی بیشتر عرصہ ہماچل میں رہی، یہاں تعلقات کا حلقہ وسیع ہو گیا اگرچہ تقرری کے مختصر ادوار پنجاب کے گورداسپور، پٹھان کوٹ، چنڈی گڑھ، کشمیر کے سری نگر اور شوپیان میں اور راجستھان کے صنعتی شہر کوٹہ میں بھی گزرے۔ ہمیں اپنے صدر مقام کے نواحی تین تین اضلاع میں ابلاغی سرگرمیاں منعقد کرنی ہوتی تھیں۔ لیکن میری تقرری کے آخری بارہ برس ۱۹۷۹ء تا ۱۹۹۱ء شملہ ہی میں گزرے جہاں سے ۳۱/مارچ ۹۱ء کو میری ریٹائرمنٹ کے بعد ہم اپنا سارا سامان اپنے ہوم ٹاؤن کروکشیتر میں لے گئے۔ منجھلا بیٹا اور سب سے چھوٹا بھی ہماچل سرکار کی گزٹیڈ سروس میں آ گئے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے اپنے اپنے مکان نیو شملہ میں تعمیر کر لیے ان کے باعث ہمیں بھی شملہ لوٹنا پڑا۔

☆ ان حالات وواقعات کا آپ کی فنی زندگی نے کیا اثر لیا؟

☆☆ وقتی طور پر زندگی سے نباہ کرنا دشوار ضرور لگا مگر کروکشیتر ہی میں ایک نامور اور قادرالکلام شاعر جناب نرائن داس بھٹناگر طالبؔ پانی پتی کی صحبت کا فیض احقر کو حاصل ہوا۔ اُنہی کی وساطت سے مجھے علامہ بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی کے آستانۂ ادب سے وابستگی حاصل ہوئی۔ وہ ۱۹۴۹ء میں اپنے ہمراہ مجھے دلّی میں علامہ کے پاس لے کر گئے۔ منوّر صاحب دلی میں ریلوے اکاؤنٹس کی ملازمت میں تیس برس گزارنے کے بعد ۱۹۵۷ء میں ریٹائر ہوئے تو انہوں نے علاقہ پٹوری ہاؤس دریا گنج میں مکان خرید لیا۔ باقی عمر وہیں گزار کر ۱۹۷۰ء میں وہ مالک حقیقی سے جا ملے۔ منوّر صاحب سے میرا روحانی رشتہ اُن کی حیات تک بنا رہا اور بعد ازاں اُن کے متبنّیٰ بیٹے کے پریوار سے بھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد منوّر صاحب مالی تنگی کے باعث ترجمہ کے کام میں زیادہ مصروف ہو گئے اگرچہ انہوں نے مجھے بہت پہلے فارغ الاصلاح کر دیا تھا، پھر بھی اُن کی اجازت سے ناچیز نے لگ بھگ پانچ برسوں تک مسلمہ اُستادِ فن ابوالفصاحت پنڈت لبھو رام جوشؔ ملسیانی سے بھی اکتسابِ فن کیا۔ میں نے اپنے شعری مجموعوں میں ان دونوں کا مل اساتذہ کے تئیں تعظیم وتشکر کا اظہار کیا۔

☆ کچھ تفصیل ملازمت کی بتلانے سے قبل ''لہریں'' اور ''ویر'' کی بیان کیجیے؟

☆☆ جی ہاں! ''ویر بھارت'' جو لاہور سے شائع ہونے والا بے باک اور کثیر الاشاعت روزانہ اخبار تھا، تقسیم وطن کے بعد پٹوری ہاؤس دریا گنج دلّی سے شائع ہونے لگا تھا۔ مجھے اپنے والدین کے لیے جدوجہد کرنی پڑی۔ فاقے بھی کاٹنے پڑے۔ قبلہ منوّر صاحب نے کئی جگہ میری سفارش کی۔ ان کے خاص نیاز مند نوجوان شاعر نریش کمار شادؔ ''ویر بھارت'' اخبار کے ادبی ایڈیشن کے انچارج تھے۔ منوّر صاحب کے ایما پر مجھے ۱۹۵۱ء کے اواخر میں شاد نے ویر بھارت میں سب ایڈیٹر اور مترجم کے طور پر رکھوا دیا۔ لیکن چند مہینوں کے بعد مجھے یہ ملازمت چھوڑنی پڑی۔ کیونکہ تنخواہ پانچ پانچ روپوں کی قسطوں میں ملتی تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ ''ویر بھارت ٹرسٹ'' کا سارا پیسہ جو لاہور سے لایا گیا تھا ایک ذمہ دار شخص نے غُرد برد کر دیا۔ لاہور میں اس مقبول روزنامہ کے ایڈیٹر لسان الاعجاز پنڈت میلا رام وفاؔ ہوتے تھے۔ جن کے کمالِ فن کا اعتراف مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر روزنامہ ''زمیندار'' نے کیا تھا جب وہ ایڈیٹر روزنامہ ''پربھات'' نانک چند نازؔ کے شعری مجموعہ پر تبصرہ کر رہے تھے۔ وہ مشہور شعر ہے:

توڑتا ہے شاعری کی ٹانگ کیوں اے بے ہنر
شعر کہنے کا سلیقہ سیکھ میلا رام سے

☆ شادی کے صرف تین سال بعد آپ کی پہلی رفیقِ حیات کی ناگہانی موت نے آپ کی شاعری اور شخصیت پر بھی یقیناً کچھ اثرات مرتب کیے ہوں گے؟

☆☆ شادی تو بہت بعد کی بات ہے۔ ۱۹۵۴ء میں بی ٹی پاس کرتے ہی مجھے پنجاب کے محکمہ تعلیم میں سرکاری ملازمت مل گئی اور بطور انگلش ٹیچر میرا تقرر ضلع کانگڑہ کے ایک ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی سکول میں ہوا۔ تب یہ پہاڑی ضلع پنجاب میں تھا۔ ۱۹۶۶ء میں پنجابی صوبہ اور ہریانہ صوبہ کے وجود میں آنے پر کانگڑہ ہماچل پردیش میں شامل کر دیا گیا۔ ۱۹۵۷ء میں میری شادی پاکستان کے ضلع کیمبل پور سے ہجرت کر کے آئے ہوئے سیٹھی خاندان کی بیٹی ستیش کماری سے کر دی گئی جس کے ساتھ لگ بھگ چار برسوں کی یادگار رفاقت رہی۔ ۱۴/اپریل ۱۹۶۱ء کو ستیش کی برقی حادثہ میں ناگہانی موت کے بعد زندگی میں میرا اعتقاد ہی متزلزل ہو گیا۔ میری پہلی شادی جو ایک طرح سے لو میرج تھی اس کے ناگاہ ٹوٹنے کا صدمہ میری شاعری میں ابھی تک گاہے گاہے ایک برقی لمحے کی طرح غیر محسوس طور پر لپک آتا ہے۔ ازاں بعد والدین اور سسرال کے اصرار پر دو سال بعد جون ۱۹۶۳ء میں تنہائی کی اذیت سے نجات پانے کے لیے خانہ پُری کرنی پڑی۔ شارداؔ اُتنی ہی خوش خلق، ایثار مند، مخلص اور سُگھڑ رفیقِ زندگی ثابت ہوئی۔ اس جانِ جاں کے ساتھ بشرطِ زندگی کچھ مہینے بعد رفاقت کی گولڈن جوبلی منانے کی تسکین وفرحت کی گھڑی نصیب ہوگی۔ باقی رضائے مولےٰ۔

☆ علامہ منور لکھنوی سے تعارف اور عقیدت کا سفر پی۔ ایچ۔ ڈی پر ختم نہیں ہوتا۔ یقیناً بہت کچھ ان کہا بھی ہونا چاہیے؟

☆☆ کائستھوں کے متعلق یہ روایت ہے کہ یہ لوگ بالعموم مرغ وماہی، شراب وکباب کے رسیا رہے ہیں لیکن سبھی کے بارے میں یہ فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہندوستان پر مسلمان حکمرانوں کے لگ بھگ ہزار سالہ دورِ حکومت میں فارسی دفتری زبان رہی۔ سب سے پہلے کشمیری پنڈتوں اور کائستھوں نے فارسی شوق اور لگن سے سیکھ کر اس میں مہارت حاصل کی اور

سرکاری اسامیوں پر چھاگئے۔ میرے استادِ گرامی علامہ بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی سکسینہ کائستھ تھے۔ منوّر صاحب پیاز نہیں کھاتے تھے، گوشت انڈہ تو درکنار، مکمل متقی، پرہیزگار، کشادہ دل، بلند کردار اور سیکولر انسان تھے۔ گھر میں سبھی فرقوں کے نیازمندوں کا آنا جانا تھا اور اُن کی پوجا کے پرساد میں سبھی کو بلا امتیاز حصہ ملتا تھا۔ آپ نے لگ بھگ اسّی (۸۰) کتابوں کا تخلیقی سرمایہ چھوڑا۔ منوّر صاحب کے تراجم کی کتاب ''تعبیرِ منظوم'' سے میں نے قرآنِ حکیم کی سورۃ فاتحہ، سورۂ لہب، سورۂ آل عمران، سورۂ الناس کے منظوم تراجم موصوف پر لکھے گئے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے میں شائع کیے ہیں۔ کتاب کے شروع میں ''عذرِ تالیف'' کے زیرِ عنوان منوّر صاحب رقم طراز ہیں:

بیدار ہوا نصیب میرا — ہے ختم رسل حبیبؐ میرا
مسجد مرے گھر کے سامنے ہے — قرآن نظر کے سامنے ہے
تکمیلِ مراد کر رہا ہوں — اللہ کو یاد کر رہا ہوں

گو نام ہے پاک ترجمے کا — دعویٰ نہیں خاک ترجمے کا
اکرام کی جستجو نہیں ہے — انعام کی آرزو نہیں ہے
میں ہوں ہندو تو حرج کیا ہے — یہ بھی رضائے کبریا ہے
مجھ پہ لطفِ رسولؐ ہوگا — ہدیہ میرا قبول ہوگا

حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کی اور حضرت علیؓ کی توصیف میں منوّر صاحب نے معرکتہ آلارا نظمیں کہیں۔ شریمد بھگود گیتا، اقبالؔ کی ارمغانِ حجاز، دیوانِ حافظؔ، رامائن والمیک، کالی داس کے پورے لٹریچر، جے دیو کی ''گیت گووند'' مہاتما بدھ کی تعلیمات کے گرنتھ ''دھمیذ'' اور متعدد دیگر اہم کتابوں کے منظوم تراجم منوّر صاحب کی دین ہیں جن میں سے چھ انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیے۔

☆

غیر مسلم ہو کے بھی عاشق ہوئے اردو پہ ہم
زندگی بھر اس حماقت پر ہمیں رونا پڑا

شعر کے خالق سے بہتر شعر کی تخلیق اور بعد کی صورت حال پر روشنی کون ڈال سکتا ہے؟

☆☆ جی ہاں! اس شعر کے تناظر میں کئی تلخ حقائق پوشیدہ ہیں۔ جب مستحق ادیب کو نظر انداز کر کے اُس کی ادبی خدمات، تجربے، تعلیم، محنت اور تخلیقی ذہن کو نظر انداز کر کے کسی کم سواد نااہل قلم کار کو محض سیاسی مصلحتوں اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر ترجیح دے کر نوازا جاتا ہے۔ عمدہ تصنیف سے صرفِ نظر کر کے کم پایہ تصنیف کو فرقہ وارانہ اور ووٹ بنک سیاست کی ترازو پر تول کر ترجیح دی جاتی ہے، بہتر تصنیف کی بجائے فرقہ وارانہ یا سیاسی وجوہات سے کم پایہ تصنیف کی مقابلتاً کئی گنا زیادہ جلدوں کی خرید کی جاتی ہے تو مستحق کے دل میں احساسِ محرومی اور اُبال در آتا ہے۔

☆ آپ کی شاعری کا خاص موضوع سیاست اور سیاست دان ہونے کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ میری شاعری کے ابتدائی دور کی نظموں، غزلوں اور دیگر اصنافِ شعر میں رومانیت، راز و نیاز عشق اور حکایت قدوگیسو کے کلاسیکی رنگ نمایاں رہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ملک کی آزادی کے بعد اس کی تعمیر و ترقی کا جذبہ، اس سے وابستہ مسائل، اس کے لیے ترغیب و تحریک بھی میری شاعری کا حصہ بن گئے۔ بعد میں محبوب رفیقۂ حیات کی مرگِ ناگہانی کے صدمے کا ردِ عمل بھی اس پر عکس ڈالتا گیا۔ ملک کی تیز گام ترقی اور جمہوری نظام کی آمد کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ منظر بدلتے گئے۔ ملک کی سیاست مکروہ ہوتی گئی۔ جگر مرادآبادی نے کہا تھا:

کچھ رہبرانِ خاص جو مخلص ہیں واقعی
ان کا چراغ بھی تہِ داماں ہے آجکل

☆ آپ کے ہاں ہندی سماج کی علامتوں کا استعمال جس کثرت سے ہوا ہے کم کم شاعروں کے ہاں اس قسم کی صورت حال دیکھی گئی ہے؟

☆☆ یہ سچ ہے کہ اس خاکسار نے ہندو دیومالائی علائم، رامائن، مہا بھارت، شوپُران وغیرہ کے کرداروں، تاریخی شخصیات و واقعات چاندبی بی، رانی جھانسی، سکندر، دارا، پورس، خواجہ غریب نواز، ارجن، یدھشٹر، راون، کنس، ہلدی گھاٹی، مذہبی روایات، تاریخ اور اساطیری لٹریچر سے لے کر انہیں علامت اور استعاروں کے طور پر نظم، غزل میں برتا ہے لیکن یہ وہی الفاظ و استعارات ہیں جن سے عام پڑھا لکھا ہندوستانی بخوبی واقف اور مانوس ہے۔ یہ چلن اردو شاعری میں آنجہانی رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری نے داخل کیا اور پروان چڑھایا۔ اردو شاعری میں اسی طرح مسلم و غیر مسلم شاعر صدیوں سے اسلامی تلمیحات اور مشرقِ وسطیٰ کے تاریخی واقعات سے استعارہ کا کام لیتے رہے ہیں اور نظم و غزل کا حصہ بناتے رہے ہیں۔ جیسے کوہِ طور، شعلہ سینا، کربلا، کلیم، دجلہ و فرات، یزیدیت، ابابلیں، تیغ حیدری، ابراہیم، ابلیس، باغِ رضواں، منکر نکیر، خیبر شکن، عزرائیل، قلزم، کعبہ، حرم، بُت شکن، محمود و ایاز، حرا، ہلالِ عید، رستم، پنج تن پاک، یوسف، زلیخا، نمرود، فرعون، جامِ جمشید، چاہ کنعاں، لولاک، حدیث، جبرئیل، شبِ قدر جیسے استعارے۔ خود بندہ ناچیز نے بھی اپنی شاعری میں اسلامی تلمیحات سے کام لیا ہے جس کا ذکر ناقدین نے اپنے مضامین میں بھی کیا ہے۔

☆ روحانیت، ویدانیت اور جیون مرن کا ذکر بھی آپ کے ہاں شدت سے پایا جاتا ہے؟

☆☆ روحانیت و یدانیت (تصوف) جیون مرن، اعمال کی سزا و جزا کے موضوعات صدیوں سے مشرقِ وسطیٰ کی شاعری کا اہم جزو رہے ہیں۔ مسئلہ تناسخ یعنی روح کے بار بار جنم لینے اور چولا بدلنے کا فلسفہ محض شریمد بھگوت گیتا ہی کی منطق نہیں۔ اہلِ تصوف تو صدیوں سے اس کے قائل رہے ہیں۔ محض ہندو

گھرانے میں ولادت پانے کے باعث ہی میرا اس پر اعتقاد نہیں بلکہ گیتا اور دیگر مذہبی کتب ورسائل کے مطالعہ کی بنا پر بھی۔ بھگوت گیتا پہلی بار میں نے فارسی میں پڑھی جب دربارِ اکبری کے نورتنوں میں سے ایک فیضی کا بھگوت گیتا کا منظوم فارسی ترجمہ میرے ہاتھ لگا۔ تب میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا اور اس کتاب کی تفہیم بڑی آسانی سے ہوگئی مجھے یہ ترجمہ کافی سلیس لگا۔ روح اپنے اعمال کی سزا و جزا پانے کے لیے بار بار جنم لیتی ہے۔ مکافاتِ عمل کا یہ عقیدہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں بھی تسلیم کیا گیا۔ میری غزلوں میں بھی تناسخ اور مکافاتِ عمل کے حوالے مختلف اشعار میں گاہے بگاہے آتے رہے ہیں جیسے یہ شعر:

شباب اجر و عمل کا سلسلہ لایا ہے دنیا میں
ہم اور اپنے گناہوں کی سزا پانے کہاں جاتے

روح کا بار بار جنم لینا اور قالب بدل کر پھر دنیا میں آنا دائرے کا سفر ہے جو ختم نہیں ہوتا جب تک ذاتِ ازل سے اس کا اتصال نہ ہو جائے۔ شریمد بھگوت گیتا میں بھگوان کرشن نے مسئلہ تناسخ کی بہت صاف الفاظ میں وضاحت کی ہے۔ سادہ طریقے سے بھی دیکھا اور غور کیا جائے تو ہمیں خالق نے انسان کے قالب میں جنم دیا ہے تو یہ بھی مکافاتِ عمل ہے۔ روح گدھے اور کُتے کے قالب میں بھی ہے، اُس قالب میں کیوں نہ پیدا کیا گیا ہمیں؟ پھر فرق تو کُتے اور کُتے میں بھی رکھا گیا۔ ایک کُتا گلی گلی جُوٹھی ہڈیاں چچوڑتا پھرتا ہے، دوسرا الگژری کار میں بیٹھا گرم اونی کپڑے میں ملبوس بسکٹ اور طرح طرح کے پکوان کھا رہا ہے۔ مجھ ناکارہ کو اگر خدا نے کسی مسلم، عیسائی یا پارسی خاندان میں جنم دیا ہوتا تو میں کیا اس پر معترض ہو سکتا تھا۔ بقول محروم:

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

☆ روحانیت کے ذریعہ منفی قوتوں سے نبرد آزما ہونا اور زندگی کا مقصد پانا بھی قاری کے اشتیاق کو مہمیز دے رہا ہے؟

☆☆ ہر مذہب کا روحانی پیغام یہی ہے کہ انسان امن پیار اور محبت سے رہے۔ نیک اعمال کرے۔ اپنے تنازعوں کو تشدد کی بجائے انصاف، حق رسی اور خیر سگالی سے صلح کے میز پر سلجھائے۔ کرشن جی نے کوروؤں کے سربراہ ان کے بڑے بھائی دریودھن کو بار بار سمجھانے کی کوشش کی دونوں فریقین میں سمجھوتہ ہو جائے اور جنگ کی نوبت نہ آئے۔ اس کے لیے کوروؤں کو اُن کے حق سے کہیں زیادہ کی بھی پیشکش کی گئی۔ لیکن دریودھن کے اڑیل روّیے کے نتیجے میں منفی قوتوں کو بالآخر جنگ کے ذریعے مغلوب اور تباہ کرنا پڑا۔

☆ بھگوان رام چندر، اُن کے اہلِ خانہ اور اقربا سے آپ کی عقیدت اور شاعری میں اُس کا جا بجا اظہار بھی وضاحت طلب ہے؟

☆☆ پہلے تو رام کا تصور تشریح طلب ہے۔ یہ اصطلاح دراصل خدا کی ذاتِ یکتا کا نام ہے۔ رام، یسوع، وہگرو، اللہ، گاڈ کوئی نام دے دیں وہ ذاتِ واحد یکتا تو وہی رہے گی، اس کی وحدت و یکتائی میں تو کوئی فرق نہیں آئے گا۔ ہندو دھرم اوتار واد کو مانتا ہے۔ رام اور کرشن محض تاریخی کردار نہیں، خالق کائنات کے انسانی اوتار ہیں۔ ''یگ یگ'' عہد بہ عہد میں بدی کی قوتوں کو مغلوب کرنے اور نیکی اور ایمان کے تحفظ کیلئے وہ ذاتِ ازل انسانی قالب میں زمین پر آتی ہے، کبھی کرشن کے روپ میں، کبھی رام، کبھی واراہ وغیرہ کے روپ میں آئی۔ شریمد بھگوت گیتا کے لاتعداد منظوم اور منثور تراجم اردو میں شائع ہوئے ہیں۔ خواجہ دل محمد اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ انہوں نے سکھ دھرم کے دینی لٹریچر سکھ منی صاحب، جپ جی صاحب، شریمد بھگوت گیتا کے منظوم ترجمے کیے۔ دینی مضامین میں شریمد بھگوت گیتا کے ۹۰ فیصد حوالے خواجہ دل محمد کی گیتا میں سے دیے جاتے ہیں۔ یہ سب سے مقبول اور سلیس ترجمہ ہے۔ میرے استاد قبلہ منوّر صاحب کے گیتا کے منظوم ترجمہ ''نسیمِ عرفاں'' کے دو ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ میں نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے میں ان کے ترجمہ اور خواجہ دل محمد کے ترجمہ کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے دل محمد صاحب کے ترجمہ کو فائق قرار دیا تھا۔

☆ ایک طرف آپ ہندو میتھالوجی کا پرچار کر کے نظریہ ویدانیت کے حامی دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف اسلام اور قرآن پر آپ کا ایقان وحدانیت کی گواہی دے رہا ہوتا ہے؟

☆☆ دیکھئے یہ بندۂ ناچیز کسی بھی مذہب کے عقائد کی تحریف و تردید نہیں کرتا اور خود اپنے مذہب کے بھی ناقابلِ عمل فرسودہ عقائد کا بھی پابند نہیں جو عدم مساوات، نفرت، ناانصافی، ذات پات کے عدم مساوات، استحصال پر مبنی دکھائی دیں اور جنہیں اپنا ضمیر قبول نہ کرے۔ جو کچھ اپنے پیر و مرشد قبلہ منوّر لکھنوی کی وسیع النظری اور عدم تعصب سے سیکھا ہے اُسی کو اپنی شاعری میں برتا ہے۔ اسلام پر منوّر صاحب کی ایک طویل نظم ہے۔ قرآن کے حوالے سے فرماتے ہیں:

قرآں کی سطر سطر پہ قربان جایئے
کیا جائزہ لیا ہے گناہ و ثواب کا
اسکی حقیقتیں ہیں دوامی حقیقتیں
اس بارگہ میں دخل نہیں انقلاب کا

احقر نے سلام اور نعت بھی کہے ہیں، بعض نیاز مندوں کی اخوت کی اصلاح بھی کی ہے۔

☆ فلاسفر پوئیٹ کا خطاب آپ کے حصے میں کن خدمات اور خصوصیات کے سبب آیا؟

☆☆ یہ تو آپ کا حسنِ ظن اور سعادت مندی ہے کہ آپ مجھے فلاسفر شاعر کا لقب عطا کر رہے ہیں۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ خدارا مجھے اتنا مت بانس پر چڑھایئے چہ نسبت خاک را با عالم پاک، سیدھا سادہ صاف گو انسان ہوں۔ شاعری کا جو جوہر خدا نے عطا کیا ہے اُس کے وسیلے سے انسانیت کو کچھ مثبت پیغام دینا چاہتا ہوں۔

☆ غزل کے لغوی معنیٰ خوبصورت خواتین سے گفتگو کے ہیں۔ اگر اس میں جمالیات اور داخلی احساسات سے قطع نظر بازار کے اتار چڑھاؤ اور سیاست کے داؤ پیچ کے ساتھ مذہبی بیان بھی شامل کر دیا جائے تو غزل ایک طرح سے روزنامچہ یا پمفلٹ نہیں بن جاتی؟

☆☆ میری شاعری کے مجموعی جائزے سے ہی آپ صحیح نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ اس میں جمالیات، رومان، شینگار رس اور داخلی احساسات کتنے فیصد عکس ریز ہیں اور خارجی محسوسات و تجربات کس تناسب میں در آئے ہیں۔ اس فیصلے کے لیے میری اردو شاعری کے بارہ مطبوعہ مجموعوں پر نظر ڈالنی ضروری ہوگی حالانکہ شاعری کے میرے تین مزید مجموعوں کے مسوّدے تیار پڑے ہیں جنہیں شائع کرنا لگ بھگ اسّی (۸۰) برس کی عمر میں میرے بس کی بات نہیں۔ بغیر پوری شاعری کا مطالعہ کئے اسے روزنامچہ یا بازار بھاؤ کی کھتونی قرار دینا جلدی میں لیا ہوا فیصلہ ہوگا۔ دورِ جوانی کے جذبات اور ولولوں کے بمقابلہ ڈھلتی عمر کے تلخ و شیریں تجربات و احساسات ذہنی کیفیات کے مابین کچھ امتیاز تو ہوگا ہی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میری غزلوں اور نظموں، دوہوں، ماہیوں اور گیتوں میں بہت جوان اور رنگین، تلذذ بخش، عاشقانہ اشعار بھی قاری کو ملیں گے۔

☆ اُن صاحب کی نسبت آپ کے احساسات کیا ہیں جنہوں نے داخلی اظہار اور جمالیات کے بے جا استعمال کے باعث غزل کی گردن اُڑانے کا فرمان جاری کیا تھا؟

☆☆ ڈاکٹر کلیم الدین احمد کے بیان سے میں کافی حد تک متفق ہوں۔ پنجابی میں کہاوت ہے کہ ''ات خدا دا ویر ہوندا اے'' جب شاعری میں کوئی رجحان ابتذال اور عریانی کی حدِ فاصل اور انتہا تک پہنچ جائے اور شاعری محض بیوٹی پارلر کے لوازمات، ہارشنگار، مردوزن کے بوس و کنار، چُوما چاٹی کی منظر کشی بن کر رہ گئی تو شاعروں کے تخلیقی عمل میں اصلاح کیلئے مولانا حالی جیسے جرّاح اور سرجن، محمد حسین آزاد کی رفاقت میں میدان میں اُترے اور اپنی قیادت سے اس چلن کو بدل دیا۔ روایتی غزل کی سرجری ہوئی اسے اخلاق سوزی سے پاک کیا گیا۔ غزل کی اسی کمزوری پر ہی کلیم الدین صاحب نے وار کیا اور اسے شوقِ فضول قرار دیا لیکن ''گردن زدنی'' قرار دینا سنگین ترین سزا ہے۔ مجرم کو بھی اصلاح کا موقع دیا جانا چاہیے۔ متقدمین کی غزلیہ شاعری میں رئیسانہ عیش کوشی سے قطع نظر کچھ فنی باریکیاں، نازک خیالیاں اور خوبیاں بھی تھیں جنہیں بالائے طاق نہیں رکھا جا سکتا۔ داغ اور انشا وغیرہ کے غزلیہ سرمایہ کو آپ کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ میر، غالب اور مومن تو افتخارِ غزل ہیں۔ پھر بھی اگر حالی اور کلیم الدین نے جرّاحی نہ کی ہوتی تو فراق گورکھپوری، جوش، جگر، متوّ لکھنوی، فیض، ساحر لدھیانوی، فراز، منوّر رانا، راحت اندوری، پروین شاکر جیسے باصر اور عالی فکر غزل گو اردو کو کیسے نصیب ہوتے۔

☆ ایک طرف آپ کی شاعری کو آورد سے پاک گردانا جاتا ہے، دوسری جانب آپ کے تجربات کا ذکر بھی شدّ و مد سے کیا جاتا ہے؟

☆☆ یہ تو قاری اور نقاد کی دُور رس نگاہ اور ذوقِ سلیم پر منحصر ہے۔ ہر شخص بقدرِ پیمانہ شعور شاعر کی تخلیق کی تفہیم و تزئین کرتا ہے۔

☆ کچھ لوگ مختلف ادبی تحاریک میں آپ کے متحرک رہنے کا ذکر کیا کرتے ہیں اور کچھ ہر قسم کی تحریک، تنظیم اور گروہی سرگرمیوں سے پرہیز کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اصل صورت حال اور اُس کی وجوہات آپ ہی بتلا سکتے ہیں؟

☆☆ یہ بندۂ ناقص و ناچیز انتہا پسند نہیں۔ ترقی پسند تحریک اچھی نمائندہ عوام تحریک تھی، اس کے تحت حلقہ اربابِ ذوق کی ایک دو نشستوں میں شرکت کے باوجود میں اس سے وابستہ نہیں ہوا۔ برادرِ معظم نند کشور وکرم کو اس بات کا شکوہ رہا۔ اس تحریک پر اشتراکی سیاست کا گہرا سایہ تھا اور میرے حالات ایسے نہیں تھے کہ میں تعلیم کے علاوہ کسی دوسرے شوق و شغل کو اپناتا۔ شاعری میں خاکسار نے اپنے لئے خود ایک متوازن رہ بنائی۔ میرے دونوں محترم استادوں کے مزاج و مشرب کا بھی مجھ پر اثر رہا۔ ترقی پسند تحریک کی اشتراکیت اور جدیدیت کی انتہا پسندی سے دور رہا۔ لیکن ان تحریکوں کے فکری رنگ اور رویّے جو مجھے اچھے لگے وہ میں نے اپنی شاعری میں اپنائے اور دیانت سے قبول کئے لیکن شدت پسندی سے بچ بچا کر۔ وقت کے تقاضوں کے ساتھ میری شاعری میں موزوں اور مطلوبہ تبدل کے اثرات نمایاں ہوتے گئے۔ کسی کی گروہ بندی میں شامل نہیں ہوا۔

☆ کلاسیکی شاعری سے متاثر ہونے کے باوجود اُس کی تقلید یا استفادہ نہ کرنا بھی سوالیہ نشان ہے؟

☆☆ شروع شروع میں احقر نے کلاسیکی شاعری کو اپنے تخلیقی عمل کی بنیاد بنایا۔ لیکن ہم عصر شعرا کے کلام کے مطالعہ سے نئے رجحانات میں کچھ جواز نظر آیا تو وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلنا بہتر سمجھا۔ میرے ۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۴ء میں شائع ہونے والے شعری مجموعوں میں کلاسیکی رنگ میری نظموں، غزلوں، رباعیات و قطعات وغیرہ میں کسی حد تک نمایاں ہے۔ تیسرے مجموعے ''پُروائی'' اور اُس کے بعد مطبوعہ شعری تصانیف میں کلاسیکی رنگ نہیں ہے۔

☆ آپ کی غزلوں کو فراق کی غزلوں کی توسیع کن معنوں میں کہا جاتا ہے؟

☆☆ خاکسار پہلے ہی عرض کر چکا ہے کہ ہندو میتھالوجی سے دیومالائی علائم لے کر اردو شاعری کو خالص ہندوستانی رنگ دینے کا مستحسن کام فراق گورکھپوری نے شروع کیا تھا یہ رنگ دلکش بھی تھا اور اردو کے مزاج سے میل بھی کھاتا تھا کیونکہ اردو حقیقتاً ایک ہندوستانی زبان ہے جس میں ۶۷ فیصد ذخیرۂ الفاظ ہندی کا ہے۔ ہندی اور اردو جڑواں بہنیں ہیں جن کی بنیاد شورسینی پراکرت (کھڑی بولی) پر رکھی گئی ہے۔ ہندی اور اردو دونوں کا ارتقا ساتھ ساتھ ایک ہی زمانے میں ہوا ہے۔ دونوں کا گرامر مشترک ہے۔ ان کے مصادر، حروفِ جار، اسمِ ضمیر سانجھے ہیں۔ اردو میں لگ بھگ ۲۰ فیصد الفاظ عربی کے اور لگ بھگ ۱۲

فیصد فارسی کے ہیں جو ہندی میں بھی اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ نہ صرف روز مرہ بولی جانے والی زبان بلکہ ہندی ادب میں بھی جذب ہو گئے ہیں۔ کُرسی، عینک، محنت، شہید، انقلاب، جوش، جوہر، دلال، داخل، عادت، طاقت، حیران، عجیب، خدمت، خیال، خیمہ خالص عربی الفاظ ہیں، اسی طرح فارسی کے الفاظ بھی ہندی میں یوں استعمال ہوتے ہیں کہ جیسے یہ اصل ہندی الفاظ ہوں مثلاً چشمہ، دانہ، دائی، کم، حال، کمان، کشتی، فریب، فریاد، چادر، پوشاک، پہلو، پیچ، پیدا، گلاب، گناہ، گراہ، گنجائش، گوشت، ماہوار، چند، چربی وغیرہ۔ سیاست برطرف یہ دونوں عام بول چال کی زبانیں ہیں، ہندوستان ہی میں بڑھی پلی ہیں تو کیوں نہ ان کے ادب اور شاعری کے مزاج کو ہندوستانیت سے ہم رنگ کیا جائے۔ ہندوستانی مذاہب کی اساطیر، یہاں کے مناظر سے تازہ کاری اور دل آویزی عطا کی جائے۔ کوہِ طور، دجلہ، فرات اور دریائے نیل کی جگہ گنگا، جمنا، ستلج، چناب، راوی، جہلم، شوالک، ہمالیہ، سندھ، بیاس، اور سرجو کو استعارہ بنایا جائے۔ بابا فرید، بلھے شاہ، نانک اور کبیر، میرا بائی، تلسی اور سورداس، میر، غالب، رس کھان اور ملک جائسیؔ کوی رحیم کی بات کی جائے اور یہ استعارے ہمارے ادب کے زیور میں نگینوں کی طرح اس کی دلکشی، جذب وکشش کو بڑھاتے ہیں۔

☆ آپ کی شاعری کو کچھ لوگ کبیر کی شاعری سے بھی تشبیہہ دیا کرتے ہیں؟

☆☆ یہ بھی قاری اور تنقید نگار کی تفہیم اور ذوقِ سلیم کی بات ہے۔ کبیر نے بھی اپنے کلام میں اپنے دور کے دینی و دنیوی تجربات کی روشنی میں عام فہم استعاروں کے ذریعے نیکی، اخلاق، بے غرض عبادت، انسانی فلاح، فرقہ وارانہ ایکتا، ہم آہنگی، اخوت، بھائی چارہ، حرص وہوس، طیش وطمع سے گریز، وسیع القلبی کی تبلیغ کی۔ شاید اُسی مماثلت سے میری شاعری کو کچھ قدر دانوں نے کبیر سے ہم آہنگ پایا ہوگا۔

☆ ایک تصور آپ کے بارے میں یہ ہے کہ آپ اپنی نظموں کے ذریعے ہندوستانی عوام کو خاص جذباتی سطح پر لانا چاہتے ہیں۔ پہلی بات وہ سطح ہے کیا دوسری یہ کہ خواہش صرف ہندوستانی عوام تک کیوں محدود ہے؟

☆☆ یہ رائے بھی غلط فہمی پر مبنی ہے اور نیم صداقت، ورنہ میری شاعری میں اخلاق، اخوت، وطنی آزادی کا تحفظ، شریفانہ وہمدردانہ ہمسائیگی، امن و مساوات، انصاف پرستی، احترامِ اسلاف کا پیغام عصری اپیل رکھتا ہے۔ میری بیسوں نظمیں مثلاً ''فصلِ شعلوں کی، شمشیر وسناں اوّل، مبارک وہ دیش ہے، وقت، سلیقہ تعبیر، دسمبر کی یخ بار قاتل ہوا، مرکز کی طرف، وقفہ، چاندنی کے آبشار، حسن باطن، منافق، نکتہ راز، چار دن کی زندگی میں، وصال، رحمتِ حق بیٹیاں، اور ہم ناچیز بندے، خودشناسی، پھول اور خوشبو' اور دیگر بہت سی نظمیں مذکورہ رائے کی تردید کرتی ہیں۔ میرا روحانی کلام بھی ساری دنیا کیلئے ہے۔

☆ موضوعاتی نظموں کا سلسلہ کب اور کس طور شروع ہوا اور اس میں شدت کیوں در آئی؟

☆☆ جب سے میں نے شاعری شروع کی پہلے پہل مذہبی انجمنوں کے پروگراموں میں موضوعاتی نظمیں پڑھنے لگا۔ ۱۹۴۲ء میں مہاتما گاندھی کی ''انگریزو بھارت چھوڑو' Quit India تحریک کے سلسلے میں کانگریس پارٹی والوں نے ہمارے قصبہ میں بھی ایک سیاسی جلسہ منعقد کیا۔ اُن کی فرمائش پر مجھے بھی اس جلسہ کے لیے نظم موزوں کر کے پڑھنی پڑی۔ اگلی صبح ایک پولیس کانسٹیبل نے ہمارے پشتنی مکان پر دستک دی۔ انگریز کے دورِ حکومت میں کسی گھر پر پولیس کے سپاہی کا دستک دینا بلائے ناگہانی سمجھا جاتا تھا۔ مجھے تھانے لے جایا گیا جہاں باغیانہ نظم پڑھنے کیلئے S.H.O نے بازپُرس کی۔ دادا جان کا شمار شہر کے مدبرین میں تھا۔ انہیں اطلاع ملی تو وہ تھانے پہنچے اور مجھے چھڑا کر گھر لے آئے لیکن میری جو ''تواضع'' تھانے میں ہونی تھی وہ پہل سیوا اور تواضع گھر پر لا کر کی گئی۔ عموماً بزرگوں کے گاہے ماہے کے غصے کے ڈر سے گھر کی خواتین ''مولا بخش'' یعنی چوبی چھڑی کو ادھر اُدھر چھپا کر رکھتی تھیں۔ جب کسی بچے کی شامت آتی تھی تو چھڑی ڈھونڈنے میں ہی مائیں وقت ٹالنے کی کوشش کرتی تھیں لیکن آسانی سے دستیاب ہونے والا (حاضر جواب) ہتھیار ''چرن داس'' یعنی پاپوش ہوتا تھا۔ لہٰذا دادا جان نے اپنی پاپوش (دیسی جوتے) سے ہماری تواضع شروع کی ساتھ ساتھ ان کے ارشادات گرامی بھی نازل ہوتے رہے۔ ''نامرادا گڈھوں آں توں انگریزی حکومت دے خلاف شاعری بلیندیں۔ تیں ڈھکچڑیں کیں جہاڑے۔ نال سائوں وی چٹی پوئیں بھولوں آں'' لہٰذا یہ سلسلہ تب سے شروع ہوا۔

☆ گیت نما نظم اور نظم نما گیت کی بابت بھی کچھ ابہام پایا جاتا ہے؟

☆☆ میرے پورے کلام میں گیت نما نظم کی محض تین چار مثالیں ہی آپ کو ملیں گی۔ میں نے اس طرح کے گیت ملکی مسائل کے پس منظر میں آل انڈیا ریڈیو جالندھر، شملہ اور دلّی کے لیے خاص فرمائش پر لکھے۔ جو ان اسٹیشنوں پر سانگ آف دی منتھ کے طور پر گائے گئے۔ کچھ کورس کی شکل میں گائے گئے جیسے ''اے باغِ وطن کے مالی، کر باغ کی یوں رکھوالی'' ''سپاہی کے بچے کو لوری'' جو ۱۹۶۲ء کے چینی حملے کے تناظر میں مجھ سے لکھوایا گیا۔ ریڈیو کے لیے ''ساون آیا رے'' اور ''کرشن جنم اشٹمی'' وغیرہ کے عنوان سنگیت رُوپک (میوزیکل پلے) بھی تحریر کیے۔

☆ آپ پر لکھے گئے مضامین میں بار بار زود گوئی کا ذکر آپ کے حق میں جاتا ہے یا خلاف؟

☆☆ یہ بات تو میرے حق میں جاتی ہے لیکن زود گوئی تو تب کی بات ہے جب غالب جوان تھا۔ تب دوست نوازی اور ایڈیٹر صاحبان کے تقاضوں کی تعمیل کے لیے یہ سعادت یا زحمت نبھانی پڑتی تھی۔ طبیعت حاضر ہے تو مثبت ادب کی تخلیق کے لیے اپنی صلاحیت کو صرف کرنا کیا جرم وگناہ ہے؟ لیکن یہ سب تو ماضی کی باتیں ہیں۔ اب ڈھلتی عمر میں نہ تو پہاڑ کی شدید سردی زیادہ تخلیقی کام کرنے

کی اجازت دیتی ہے اور نہ صحت ساتھ دے رہی ہے۔

☆ آپ کے خیال میں آپ کی شخصیت وفن کے وہ کون سے نکات ہیں جن کی تشریح ہونا ابھی باقی ہے؟

☆☆ میری صحافت، تحقیق وتنقید، صحافتی خدمات، طنزیہ اور مزاحیہ مضامین اور نظمیں، نیز میری سرائیکی شاعری کے ساتھ انصاف ہونا باقی ہے۔ سرائیکی میں چھپے میرے مزاحیہ مضامین پسند کیے گئے ہیں اور سرائیکی شاعری بھی لیکن اب بھارت میں صرف دو ہندی رسالے ایسے رہ گئے ہیں جن میں چند صفحات سرائیکی کے لیے وقف ہوتے ہیں۔ جو صرف سرائیکی (بحروف ہندی) میں چھپتے تھے، ایڈیٹر صاحبان کی رحلت کے بعد بند ہو گئے ہیں۔ ریڈیو جالندھر سے شام کو جو سرائیکی پروگرام ''جھوک'' نشتر ہوتا رہا ہے اس میں میرا انٹرویو اور کلام نشر ہو چکا ہے۔ سرائیکی مشاعروں میں حصہ لیتا رہا ہوں لیکن اب پاؤں کے عارضہ کے باعث آؤٹ سٹیشن مشاعروں اور ادبی تقاریب میں شرکت سے تائب ہو چکا ہوں۔ مقامی دوردرشن کا ریڈیو، یا محکمہ السنہ وثقافت کے ادبی پروگراموں میں شامل ہوتا رہتا ہوں۔ وہ بھی خود گھر سے لے جاتے ہیں اور واپس چھوڑ جاتے ہیں۔

☆

حق تلفیاں شباب ہوئیں اس قدر
محرمیوں کا زہر میرے خون میں رچ گیا

اس شعر کا جواز بھی وضاحت طلب ہے؟

☆☆ حق تلفیوں کا سلسلہ زندگی بھر میرے ساتھ چلتا رہا ہے۔ وطن سے ہجرت کا سانحہ پہلی حق تلفی تھی، جو تعلیم سکون واطمینان اور خوشحالی کے ساتھ حاصل ہونی تھی اُس سے محرومی ہوئی۔ اس کے لیے غیر متوقع اور غیر معمولی جدوجہد کرنی پڑی۔ کالج میں اس کے باعث احساسِ کمتری کا شکار ہونا پڑا۔ ملازمت میں جب پنجاب سرکار کے محکمہ تعلیم میں بارہ برس گزارے تو ترقی میں یوں رکاوٹیں آئیں کہ جب مرکزی وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے ایما ونشا پر سبھی لوکل باڈی سکول گورنمنٹ کے براہِ راست ماتحت کر دئے گئے۔ جو استاد صاحبان پہلے سے گورنمنٹ سکولوں میں پڑھا رہے تھے ان کا کیڈر ہمارے کیڈر پر غالب یعنی سینئر ہو گیا۔ بہتّر اسامیوں کے لیے امتحان اور انٹرویو دئے تو مجھ سے کم تعلیم یافتہ امیدار سیاسی رسوخ کے طفیل چنے گئے۔ ما بدولت ہاتھ ملتے رہ گئے۔ ادبی خدمات کے لیے جو مراعات واعزازات میرا حق بنتے تھے، انہیں سیاسی رسوخ والے چاپلوس ہتھیالے گئے۔ مرکزی سرکار کی ملازمت میں بھی ہم ستتر (۷۷) لوگوں کا الگ کیڈر بنا دیا گیا اور ترقی کے لیے سپریم کورٹ تک ہمیں لڑنا پڑا۔ تب تک ہمارے کیڈر کے سرکردہ ساتھی مع کمترین کے ریٹائر ہو گئے۔ پنجابی میں کہاوت ہے ''جیہڑے لاہور بھیڑے اوہ لالے موسے وی بھیڑے'' آخر ہم بارڈر کیڈر والے اس لاحاصل تگ ودو کے بعد یہی مان کر بیٹھ گئے کہ:

رکھ تسلّی کہ یوں مقدر تھا

☆ آج کل کے مشاعروں کی بابت آپ کا حسن ظن کیا ہے۔ ترنم سے پڑھنے والے اعلیٰ پائے کے شاعر کیوں تصور نہیں کیے جاتے؟

☆☆ بھائی سچ پوچھو تو آج کل کے مشاعرے ہمارے ملک میں تو مجرے بن کر رہ گئے ہیں۔ اچھے ادب کو سمجھنے والے قاری بھی کم یاب ہیں۔ فنی اور موضوعاتی اعتبار سے صحیح اور مثبت کچھ پڑھنے والے مشاعروں میں معدودے چند ہی نظر آتے ہیں باقی سب بھرتی کا سفارشی گروہ ہوتا ہے۔ مشاعرے شعرا کی اداکاری اور مشاعرات کی جادوگری یا فیشن کے مظاہرے بن گئے ہیں یا گلا پھاڑ کر ترنم میں عامیانہ اور ہلکے اشعار پڑھنے والوں کی بازیگری کا۔ ترنم اچھا ہوگا لیکن کلام میں دم نہیں ہوگا تو ترنم بازوں کو اعلیٰ شاعر کیسے تسلیم کر لیا جائے گا۔ جو نظمیں اور غزلیں شاعروں کی آزمودہ ہوتی ہیں وہی فرمائش کے بہانے سے سٹیج پر سنائی جاتی ہیں، عظیم اور نامور شاعر بھی اس بدعت سے بری نہیں۔ ایسے اکابرینِ ادب کو بھی وہی نظم اور غزل مشاعرے میں پڑھتے ان گناہگار آنکھوں نے دیکھا ہے جو کم از کم تیس مرتبہ ان سے مشاعروں میں سنی ہوتی ہے۔ اس پر شعرا کی اداکاری اور تصنّع، سامعین کی جھوٹ موٹ کی تعریف ارباب ذوق کو مزید بور کرتی ہے۔ کوئی شاعر اکثر سٹیج پر آتے ہی کہے گا آپ کے شہر کے سامعین باشعور اور سخن شناس ہیں۔ اس کا شہرہ سُن کر میں پچاس ہزار سامعین والے مشاعرے کو ٹھکرا کر یہاں چلا آیا ہوں۔ داد بٹورنے کے لیے سامعین کو بیوقوف بنانے کے یہ انداز اور نوٹنکیاں کیا کیا نہیں دیکھا مشاعروں میں۔ اردو رسم الخط جانتے نہیں بہت سے شاعر دیوناگری میں غزلیں لکھ کر لاتے ہیں۔

☆ پہاڑی شاعری کی بابت بنیادی معلومات کے علاوہ اس جانب آپ کے رجحان اور خدمات سے باخبر کیجیے؟

☆☆ ہماچل کے پہاڑی صوبہ میں کوئی مشترکہ دستند پہاڑی زبان نہیں ہے کیونکہ شملہ اور سرمور کے اضلاع نیز چینی سرحد کے قریب واقع قبائلی اضلاع کنّور، لاہول سپتی میں بالکل الگ سی بولیاں بولی جاتی ہیں لیکن چونکہ صوبے کی کثیر آبادی کانگڑی بولتی ہے اور وہی کانگڑہ کے نواحی اضلاح چمبہ، ہمیہ پور، اُونہ، بلاسپور وغیرہ میں سمجھی اور بولی جاتی ہے اس لیے بیشتر شاعری اسی بولی میں وجود میں آئی ہے۔ صنفِ غزل جو فارسی سے ساڑھے چار سو برس قبل اردو میں داخل ہوئی تھی اب بھارت کی سرکاری زبان ہندی اور صوبائی زبانوں میں بھی مقبول ہو چکی ہے۔ کشمیری، ڈوگری، پنجابی، ہماچلی، ہریانوی، مراٹھی، راجستھانی وغیرہ میں بھی غزلیں لکھی جا رہی ہیں۔ ہماچل کی پہاڑی میں بھی غزلیں لکھی گئی ہیں لیکن غزل کے ڈسپلن کی پابند غزلیں کم ہماچلی شعرا نے لکھی ہیں۔ پُرانا ادبی سرمایہ لوک گیتوں، ناٹیوں وغیرہ پر مشتمل ہے اور اس میں اب قابلِ قدر اضافے ہو رہے ہیں نئے نئے گیتوں کے البم اور کیسٹ جاری ہو رہے ہیں۔ پہاڑی میں افسانے بھی کافی لکھے گئے ہیں۔

☆ آپ کو ہماچل کی آواز گردانے والے ایک قومی اور عالمی شناخت کے حامل تخلیق کار کو محدود نہیں کر رہے؟

☆☆ شاید کچھ لوگ ایسا کہتے ہونگے لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے۔ اس خاکسار کی قومی اور بین الاقوامی سطح پر پہچان ہے۔ دراصل میرے بارے میں جتنے مضامین کتب و رسائل میں شائع ہوئے ہیں کسی میں بھی مجھے ہماچل تک محدود نہیں کیا۔ البتہ جس پُرامن، پُرفضا سرزمین پر برسوں سے میں مقیم رہا ہوں، اس کا میرے سر پر قرض بھی ہے جہاں کا آب و دانہ کھا رہا ہوں اس کے حسین مناظر، یہاں کی سادہ زندگی، لوگوں کی شرافت، محنت کشی، یہاں کے سماجی مسائل وغیرہ بھی میری شاعری کا حصہ بنے ہیں، اس اعتبار سے ہماچل کی آواز کہلانے میں بھی مجھے افتخار کا احساس ہوتا ہے۔ اصل میں اردو ادب میں جانے پہچانے ادیبوں میں ہم دو تین لوگ ہی ہماچل میں باقی ہیں۔ سریش چند شوق، جناب کرشن کمار طور، ظلی و بھا نازلی، پرواز نور پوری اور یہ خاکسار۔ چونکہ میں ہماچل کے دارالخلافہ میں رہتا ہوں اور یہاں کے سرکاری اردو رسالہ کا ایڈیٹر بھی رہ چکا ہوں، اس لیے جب کہیں ہماچل کا ذکر ادبی دنیا میں آتا ہے تو لوگوں کو یک لخت میرا نام یاد آ جاتا ہے۔

☆ آپ نے اب تک اندازاً کتنے تحقیقی اور طنزیہ مضامین لکھے اور اُن کا آپ کے خیال میں اردو ادب میں کیا مقام ہے؟

☆☆ اب تک احباب کی کم از کم پچاس کتابوں کے لیے دیباچے لکھ چکا ہوں۔ کتابوں پر اس تعداد سے زیادہ تبصرے بھی لکھے ہیں۔ ستر (۷۰) سے زیادہ تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھ چکا ہوں جن میں سے بیشتر معیاری اردو رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ریڈیو کے لیے درجنوں طنزیہ اور مزاحیہ مضامین لکھے جو رسائل میں بھی چھپے۔ ان میں سے ۱۸ مضامین کا مجموعہ ''ہم ٹھہرے بڑے آدمی'' دیوناگری ہندی رسم الخط میں شائع کیا تھا جس پر ہماچل یونیورسٹی سے ایم۔ فل ہو چکی ہے۔ مختلف اردو و ہندی رسائل میں چھپ چکے میرے مزاحیہ اور طنزیہ کلام کا ایک مجموعہ گزشتہ برس دیوناگری رسم الخط میں ''مُسکانوں کی رِم جھم میں'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے میرا تحریر کردہ سات سو صفحات کا مقالہ مختصر کر کے پانچ سو صفحات کی ضخامت پر ۱۹۹۴ء میں ''منوّر لکھنوی ایک مطالعہ'' کے نام سے شائع ہوا تھا کیونکہ دونوں ممتحن صاحبان نے اپنی رپورٹ میں یہ سفارش کی تھی کہ اسے ضرور شائع کروایا جائے، ایسے اوریجنل مقالے شاذ ہی لکھے جاتے ہیں۔ ۲۰۰۷ء میں میرے اٹھارہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''آئینوں کے روبرو'' شائع ہوا تھا۔ اگلے مہینے میرے ۲۳ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''قلم کرشمے'' منظرِ عام پر آ جائے گا جس کو قومی کونسل برائے فروغِ اردو کی مالی اعانت سے شائع کیا جا رہا ہے۔ سہ ماہی ''جدید فکر و فن'' میں بطور ایڈیٹر جو بیالیس (۴۲) اداریے احقر نے تحریر کیے وہ ان پر مستزاد ہیں۔

☆ آپ ہمیں ادبی اکادمیوں سے ملنے والے انعامات کی تفصیل کے ساتھ ''ہماچل رتن اور ہماچل شری'' کے بارے کچھ آگاہی دیجیے؟

☆☆ اردو اکاڈمیاں سال بھر کی مطبوعہ کتابوں کو (جو ان کے دفتر میں انعامات کی گزارش کے ساتھ موصول ہوتی ہیں) عموماً تین برگزیدہ ادیبوں یا نقادوں کو بھیج کر ان کی توزین evaluation کرواتی ہیں۔ وہاں سے جو نمبر لگ کر آتے ہیں، ممبران ایگزیکٹو کی میٹنگ میں اُن کی اوسط نکال کر انعامات کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ کم از کم ہماچل اکاڈمی میں تو یہی عمل ہوتا ہے۔ لیکن ہماچل میں الگ سے اردو کاڈمی نہیں بنائی گئی۔ یہاں کی اکاڈمی پانچ بھاشاؤں ہندی، انگریزی، سنسکرت، اردو اور پہاڑی کے فروغ کی داعی ہے اور ان زبانوں کی کتابوں پر انعامات دیتی ہے۔ لیکن جب تک کسی زبان کی کم از کم پانچ مطبوعہ کتابیں اس غرض سے دفتر میں موصول نہ ہوں تب تک ان پر انعامات کے لیے غور نہیں ہوتا، عموماً اردو ہی اس تفریق کا ہدف بنتی ہے یا سنسکرت۔ ۱۹۶۰-۷۰ء کے دہے میں یہ انعامات جو کتابوں پر دیئے جاتے تھے چند سو روپوں کے ہوتے تھے اب ان رقوم میں اضافہ ہو کر ۲۵-۳۰ ہزار تک پہنچ گیا ہے۔

☆

دنیا کبھی تو مجھ کو بھی دے گی میرا مقام
یہ بھی شباب اپنا خیالی پلاؤ ہے

آپ کے بیان کی روشنی میں اس شعر کا کیا جواز رہ جاتا ہے؟

☆☆ اس سوال کا جواب پہلے ہی تفصیل سے دے چکا ہوں۔ زیادہ کچھ تبصرہ کرنا بے ادبی ہوگی۔ بہت کچھ ناقدوں اور ادب کے ٹھیکے داروں کی دیانت اور غیر جانبداری پر منحصر ہوتا ہے۔ فنکار کی مخلصانہ خدمت، جو ہر پر نہیں پرکھا جاتا۔ لگن، محنت اور ٹھوس کام کی جگہ ''سلام'' کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔

☆ آپ کے باب میں ایک شکایت موقع اور فرمائش پر ستائشی کلام تحریر کرنے کی بھی پائی جاتی ہے؟

☆☆ ایسا ہرگز نہیں، میری مطبوعہ شاعری میں سے مثالیں دیجیے۔ دیکھنے اور پڑھنے والے کے چشمے کا نمبر غلط ہو یا اس کے شیشوں میں رنگ آمیزی ہو تو شاعر کا اس میں کیا قصور۔ ناقد کے دل میں پہلے سے ہی کوئی تاثر، بغیر پڑھے، اگر جڑیں جما چکا ہو تو شاعر کیا عذر پیش کر سکتا ہے۔ کوئی مثال سامنے ہو تو کچھ عرض کروں۔ آپ کا فرمانا اس حد تک تو بجا ہے کہ میں نے جذبۂ عقیدت کے زیر اثر کچھ عظیم شخصیات کی خدمات کے اعتراف میں نظمیں کہی ہیں اور انہیں اپنے شعری مجموعوں میں جگہ دی ہے۔ کیا آپ کے ملک میں کوئی شاعر جناب محمد علی جناح، ڈاکٹر اقبالؔ، فیض احمد فیضؔ، بابا فرید یا بلھے شاہ کی عظمت کا اعتراف اپنی شاعری میں کرتا ہے تو کیا آپ اُسے موقع پرستی اور فرمائشی ادب فروشی کا الزام دیں گے؟ اگر ماہرِ تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین (نائب صدر، بعد میں صدر جمہوریہ ہند) کی دین، مہاتما گاندھی کی شہادت، لیلیٰ خالد کی دلیری، بھگوت گیتا کے تقدس، مہاتما گوتم بدھ کے ایثار و ریاضت، ختم الانبیاء حضرت محمدؐ کے حضور میں

نعت اور شہید کربلا حضرت امام حسین کے لیے سلام ومنقبت، افسانہ نگار پریم چند اور یش پال جیسے ترقی پسند فکشن نگاروں کی محنت کشوں کی زندگی کی ترجمانی، منشی دیا نرائن نگم اور منشی نول کشور کے اردو پر احسانات کے اعتراف، جواہر لال نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی کے تدبر، گرونانک کی طہارت وتوحید پرستی کو اپنی شاعری میں نذرانہ عقیدت پیش کرنا اوران نظموں کو اپنے شعری مجموعوں میں شامل کرنا اگر جرم وگناہ اور موقع پرستی ہے تو میں بصد عجز ودیانت اقبالِ جرم کرتا ہوں۔

☆ اردو کے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کے ہاں ایک مسئلہ ادبی وراثت کا بھی سنگین صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔ آپ کے ہاں اس حوالے سے صورت حال کیا ہے؟

☆☆ مجھے وراثت کے معاملے میں زیادہ آگہی نہیں ہے۔ لوگ دعوے پیش کرتے ہوں گے۔ میرے علم میں تو ایک مثال جگر جالندھری کی ہے جو خود کو ساحر سیالکوٹی مرحوم کا جانشین بتاتے تھے۔ یا تازہ ترین مثال پروفیسر ست پرکاش تفتہ کی ہے جنہیں اُن کے اُستاد زآر علامی کی وفات کے بعد شاعری میں زارصاحب کا باقاعدہ جانشین قرار دیا گیا اور زآر مرحوم کے خاندان نے وہ رسم ادا کی لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔

☆ اردو کے رسم الخط کے حوالے سے جاری بحث میں آپ کی پوزیشن کیا ہے نیز سیکولر بھارت میں اس زبان وادب کا مستقبل آپ کس طرح کا دیکھ رہے ہیں؟

☆☆ زبانیں ناعاقبت اندیش سیاست کی ریشہ دوانیوں سے ختم نہیں ہوتیں۔ پھر اردو جیسی قوی، پُر وقار اور مستحکم زبان میں مزاحمت اور زندہ رہنے کی زبردست صلاحیت موجود ہے۔ تقسیم ہند سے قبل شمالی ہند اردو زبان کا گڑھ تھا لیکن اب یہ جنوبی ہند یعنی مہاراشٹرا، آندھرا، کرناٹک وغیرہ میں اپنی مضبوط جڑیں بنا رہی ہے۔ مہاراشٹرا میں تو ہزاروں اردو میڈیم سکول ہیں۔ کالجوں میں لگ بھگ سبھی صوبوں میں اردو کے شعبے قائم ہیں۔ یونیورسٹی سطح پر بھی اس کی تعلیم کا انتظام ہے۔ پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ اور پنجاب یونیورسٹی پٹیالہ سے بھی خواہش مند اردو، فارسی میں ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کر سکتے ہیں۔ دلّی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور شہر کی دیگر یونیورسٹیوں میں اردو کی پڑھائی ہوتی ہے۔ اسی طرح بھارت بھر کی یونیورسٹیوں میں شعبہ اُردو موجود ہے۔ بنگال میں اسے باوقار مقام حاصل ہے۔ سرکاری اعلانات کے مطابق بہار اور اتر پردیش میں اسے ثانوی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ جموں کشمیر کی یہ سرکاری زبان ہے۔ اردو کے رسائل وجرائد سب سے زیادہ اب مہاراشٹر سے شائع ہو رہے ہیں۔ شمالی مشرقی ریاستوں کو چھوڑ کر باقی سبھی صوبوں میں اردو اکاڈمیاں قائم کی گئی ہیں جو سرکاری بجٹ سے کام کرتی ہیں۔ لگ بھگ سبھی اپنا اردو رسالہ شائع کرتی ہیں۔ اردو شاعری اب خاصی تعداد میں دیوناگری ہندی رسم الخط میں شائع ہو رہی ہے کیونکہ ہندی میں کتاب کا نکاس آسان ہوتا ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری لائبریریوں میں بھی اردو کتابیں موجود رہتی ہیں لیکن پڑھنے والے کم ہوتے ہیں۔ ٹیلی ویژن چینلوں کی کثرت نے لوگوں کی پڑھنے کی عادت (Reading Habit) مفقود کر دی ہے۔

رہی بات رسم الخط کی ہندی ادیبوں کا ایک بڑا طبقہ اسے ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ اردو کے سرمایہ ادب کو فارسی رسم الخط سے آزاد کر کے دیوناگری رسم الخط میں منتقل کر کے اسے ہندی ادب کا نام دے دیا جائے اور ہندی میراث کہہ کر اس پر اپنا حق قائم کیا جائے لیکن ایسا کرنے کا خطرہ نہ تو سرکار مول لے سکتی ہے نہ ہزاروں دینی مدرسوں کے رہتے اردو رسم الخط کو مٹایا جا سکتا ہے جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جو نان ہندی صوبے ہیں جہاں عام بول چال علاقائی زبانوں بنگلہ، تامل، تیلگو، اُڑیا، کنڑ میں ہوتی ہے، ان زبانوں کے اپنے اپنے رسم الخط ہیں۔ اگر شمالی ہند کا ہندی بھاشی شخص کسی کیرل یا آندھرا کے باشندے سے کہے کہ اپنے ادب یا درخواستوں کو ہندی رسم الخط میں لکھو یا اپنی زبان کو ہندی لپی میں لکھنا شروع کرو تو وہ سنتے ہیں مرنے مارنے کو تیار ہو جائے گا۔ اردو والے بھی اپنے رسم الخط کو کالعدم نہیں ہونے دیں گے۔ اب اس بارے میں زیادہ بیداری ہے۔ مزید براں بھارت کے دینی مدرسوں اور سیکولر یونیورسٹیوں میں بدیشوں سے بھی طالب علم اور محقق پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مرکزی حکومت کی اردو یونیورسٹی وغیرہ کے ہوتے ہوئے کیسے یہ رسم الخط ختم ہوسکتا ہے۔ سندھی بھاشا کا رسم الخط اردو تھا حالانکہ پاکستان سے ہجرت کر کے بھارت میں آئے سندھی اب اس بھاشا کو دیوناگری رسم الخط میں لکھنے لگے ہیں لیکن کشمیری زبان کا رسم الخط کیوں اور کیسے بدل سکتا ہے۔ پھر یہ ہمارے آئین کے شیڈول ۸ کے تحت منظور شدہ صوبائی زبان ہے۔

☆ اگر یہ ہی سوال عالمی حوالے سے کیا جائے تو آپ کا فرمان کیا ہوگا؟

☆☆ عالمی تناظر میں بھی زمینی حقیقتیں کیسے بدل سکتی ہیں۔ اردو رسم الخط فارسی سے مستعار ہے جو اہلِ ایران کی زبان ہے اگر وہاں رسم الخط نہیں بدل سکتا تو دوسرے ملکوں میں بھی کیوں بدلے گا۔ مختلف براعظموں میں خاصی تعداد میں یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور اردو رسم الخط ہی میں دی جاتی ہے۔ پاکستان میں سرکاری زبان کا رسم الخط یہی ہے اور جن ممالک کے ساتھ (بشمول چین و بھارت) پاکستان کے سفارتی تعلقات ہیں، سفارت خانوں میں یہ رسم الخط زیرِ استعمال رہے گا۔ پڑوسی تو بدلے نہیں جا سکتے۔ لہٰذا پاکستان اور بھارت ہمیشہ باہم دست وگریباں ہی نہیں رہیں گے۔ آخر امن اور بھائی چارہ بحال ہو گا، دونوں قوموں کا خون ایک ہے، کلچر ایک ہے، مسائل ایک سے ہیں۔ حالات کے تقاضے باہم خیر سگالی کو استوار کریں گے کبھی نہ کبھی اور انشاءاللہ اردو زبان اور اس کا رسم الخط دونوں کو نئے حالات میں تقویت اور بقائے دوام ملے گی۔

''دل کے دروازے''

(شباب صاحب کے غزلیہ کلام سے مختصر انتخاب)

محمد انعام الحق (اسلام آباد)

○

آ گیا ہے وقت اب، بھگتو گے خمیازے بہت
ہم فقیروں پر کسے تم نے بھی آوازے بہت

تم نے جو قصّے کیے منسوب میری ذات سے
تھی حقیقت اُن میں تھوڑی اور اندازے بہت

جن کو اپنی کامیابی کا بڑا پندار تھا
ہم نے دیکھے ہیں بکھرتے اُن کے شیرازے بہت

گھُٹ نہ جائے دم کہیں نفرت کے اس ماحول میں
کر لئے ہم نے مقفّل دل کے دروازے بہت

شہر کے میلے میں یوں تو گل رُخوں کی بھیڑ تھی
ان میں چہرے تھے مگر کم اور تھے غازے بہت

بس وہی ہوگا رضا کو تیری جو منظور ہے
کام آئیں گے نہ کمپیوٹر کے اندازے بہت

ہم نے ٹھکرائے نجانے کتنے آنکھوں کے پیام
مہ وشوں نے ہم پہ کھولے دل کے دروازے بہت

رفتہ رفتہ وقت کے مرہم سے بھر ہی جائیں گے
عشق نے جو زخم بخشے ہیں ابھی تازے بہت

ہم شریف انساں شبابؔ اس گھر میں نامحفظ ہیں
اس میں دروازے تو کم ہیں چور دروازے بہت

☆

○

اَن گنت شاداب جسموں کی جوانی پی گیا
وہ سمندر کتنے دریاؤں کا پانی پی گیا

نرم صُبحیں پی گیا، شامیں سہانی پی گیا
ہجر کا موسم دلوں کی شادمانی پی گیا

میرے ارمانوں کی فصلیں اس لیے پیاسی رہیں
ایک ظالم تھا جو کُل بستی کا پانی پی گیا

لے گئے تم چھین کر الفاظ کا امرت کلس
میں وہ شوشنکر تھا جو زہرِ معانی پی گیا

اک توجّہ کی نظر شکوے گلے سب کھا گئی
اِک تبسم عمر بھر کی بدگمانی پی گیا

اگلے وقتوں کی مروت رہ گئی بن کر سراب
وقت کا صحرا سبھی قدریں پُرانی پی گیا

پی کے پُرکھوں کی بہت عظمت بیاں کرتا تھا وہ
اپنے پُرکھوں کی جو ظالم ہر نشانی پی گیا

زہر ڈالا تھا کہ امرت تُو نے میرے جام میں
کچھ بھی ہو، میں نے تری تلقین مانی، پی گیا

جا کے وہ برسا نجانے کس سمندر پر شبابؔ
آہ جو بادل مری جھیلوں کا پانی پی گیا

☆

○

جو کافر جھوٹ پَل پَل بولتا ہے
وہ خود کوسب سے افضل بولتا ہے

بہت پیاسی ہے دل کی بانجھ دھرتی
کہاں گھنگھور بادل بولتا ہے؟

انوکھی بات سینے سے ڈھلک کر
ترا پاکیزہ آنچل بولتا ہے

مرے ردِ عمل میں اے زمانے!
مرا بیتا ہوا کل بولتا ہے

میں شاعر ہوں سجیلے پر بتوں کا
مرے فن میں ہما چل بولتا ہے

کئی صدیوں سے ہم شہری ہیں لیکن
لہو میں اب بھی جنگل بولتا ہے

غزلخواں ہے تری آنکھوں میں کاجل
تری بانہوں کا صندل بولتا ہے

عمل کرتا نہیں بھاشن پر اپنے
وہ گھنٹوں تک مسلسل بولتا ہے

زمانہ مصلحت بیں ہے بلا کا
یہ سچ بھی نامکمل بولتا ہے

میں تیرے نام پر قربان جس کو
مرا ہر سانس پل پل بولتا ہے

شبابؔ اِتنا بھی کُھل کر سچ نہ بولو
سُو کیا بات مقتل بولتا ہے

☆

○

تو کیا یونہی ہمیں باقی حیات ڈھونی ہے
متاعِ علم و ہنر جاہلوں میں کھونی ہے

ہے خیر اسی میں کہ ہم ناخدا بدل ڈالیں
ہماری ناؤ اسی نے اگر ڈبونی ہے

جو کانٹے اس نے اگائے ہیں کانٹے دوا سے
ہمیں تو فصل یہاں ایکتا کی بونی ہے

گلاب رنگ ، شکر گفتگو، مہک صندل
کشش بدن کی ترے جانِ من! انکونی ہے

کروں صباحتیں گُل، پورنیما کی اس پہ نثار
بس جو دل میں مرے سانولی سلونی ہے

ہے عکس عصری مسائل کا شاعری اپنی
نوائے وقت اسی میں ہمیں سمونی ہے

شبابؔ ترک محبت کی چھوڑیے باتیں
کہ اب تو ہو چکی رسوائی جو بھی ہونی ہے

☆

○

جو گہرے ہیں بہت بڑھ چڑھ کے وہ باتیں نہیں کرتے
سمندر کو ہساروں سے ملاقاتیں نہیں کرتے

مِرا چرچا مِری پُرسش، مری باتیں نہیں کرتے
نہ جانے کیوں وہ پہلی سی مداراتیں نہیں کرتے

برس جاتے ہیں بادل بن کے ہم پیاسی زمینوں پر
عمل کرتے ہیں اہلِ دل فقط باتیں نہیں کرتے

ہمیں جتنی سزائیں بھگتنی پڑتی ہیں دُنیا میں
یہاں آ کر ہم اُتنی تو خرافاتیں نہیں کرتے

نہ باندھ اہلِ سیاست سے اُمیدیں مہربانی کی
یہ وہ بادل ہیں جو کھیتوں میں برساتیں نہیں کرتے

یہ ڈالیں ہاتھ مٹی میں تو بن جاتی ہے وہ سونا
ہمارے راہبر کیا کیا کرامتیں نہیں کرتے

شبابؔ ایسے گلی کوچے بیابانوں سے بدتر ہیں
جہاں معصوم بچے توتلی باتیں نہیں کرتے

☆

کب مِرے مقدر کے پیچ وخم سنوارو گے
کب مجھے صدا دو گے؟ کب مجھے پکارو گے؟
گھاٹ گھاٹ کا پانی تم پِلا چکے مجھ کو
کون سے جزیرے پر اب مجھے اتارو گے؟
اے شریف انسانو! کیا یہی ہے خودداری؟
ذلّتوں کو پی لو گے اور دم نہ مارو گے؟
بے ضمیر بستی کے سینکڑوں خدا ٹھہرے
کو ن کون سے بُت کی آرتی اُتارو گے؟
مانگتا ہے روزانہ وہ سروں کا نذرانہ
آج اُس کی پُوجا کو کس کا سر اتارو گے؟
وہ تو اتفاقاً ہی ہم کنارِ جاں ہوگا
یوں کبھی نہ آئیگا باٹ جب نہارو گے
سادہ دل یُدھشٹر ہو تم بساطِ دُنیا پر
کورووں کی چالوں سے تم ضرور ہارو گے
کیوں خُدا سمجھ بیٹھے شہر کے نجومی کو؟
زندگی جو باقی ہے خوف میں گزارو گے
یہ نظام تو اپنی خامیوں پہ نازاں ہے
اس نظام میں کس کی خامیاں سدھارو گے؟
خود ہی تم سمجھ لو گے نورِ امن کیا شے ہے
ایک شب جو دہشت کے سائے میں گزارو گے
میزبان کے گھر پر ہے پڑا ہوا تالہ
شب یہ برف و باراں کی تم کہاں گزارو گے
کیا شبابؔ لازم ہے یوں جلی کٹی کہنا
تم حریف کو اپنی خامشی سے مارو گے

☆

○

مُحسن کشی کا دَور ہے یہ بات جان لو
دُشمن جسے بنانا ہو اُس کی مدد کرو
غافل ہو جان بُوجھ کے یا تم نشے میں ہو
اے کاش! تم نوشتۂ دیوار پڑھ سکو
ان موسمی ہواؤں کے سنگ اُڑ چلے تو ہو
ایسا نہ ہو خلاؤں سے تم سر کے بل گرو
تکتے ہیں راہ کب سے حقائق کے ریگ زار
خوابوں کی وادیوں میں نہ دُبکے پڑے رہو
ترکش میں جتنے تیر تھے سورج چلا چُکا
اب تم بھی کچھ جواب دو نیلے سمندرو!
فطرت مری یہ کہتی ہے ''کردو اُسے معاف''
دل کا مطالبہ ہے ''نہیں! انتقام لو''
بے گانہ وش مِلو تو کہیں لوگ خود پسند
لیکن وہی فریب دے اپنا جسے کہو
نقد ونظر کا ایک ہی معیار چاہیے
اپنی ہو خواہ اپنے حریفوں کی بات ہو
یہ لمحہ پھر نہ آئے گا ہم نے تمہاری سمت
جو دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے تھام لو
پاجاؤ گے ضمیر کی سیتا کا تُم سراغ
تم بھی اگر اَنا کا سمندر پھلانگ لو
سیّارے دشمنی پہ تُلے ہیں تو کیاہُوا
اُس کو نگیں بنا کے انگوٹھی میں پہن لو
دُشمن کی خوبیوں پہ جو کرتے ہو زہر خند
اپنی حماقتوں پہ بھی جی کھول کر ہنسو
سورج کی قینچیاں بڑی سفّاک ہیں شباب
خوابوں کے نرم جال ذرا سوچ کے بُنو

☆

○

جادوئی ماحول، من ہر لینے والی چھتریاں
ملگجی رُت، دودھیا ہاتھوں میں کالی چھتریاں
ہم نے جن قدروں کو سمجھا تھا خیالی چھتریاں
تھیں وہی طوفان میں کام آنے والی چھتریاں
غم کے صحرا کی تپش خود جھیلنی ہوگی ہمیں
بے وفا احباب ہیں سائے سے خالی چھتریاں
آج خود ہی بے تحفظ ہیں زمانے کے خُدا
وقت وہ ہے خود ہیں سائے کی سوالی چھتریاں
تیری فرقت کی تپش کچھ اُن سے کم ہوتی نہیں
جام و رقص نغمہ ہیں سب دیکھی بھالی چھتریاں
یہ حسین چہرے، یہ گورے، سانولے، چکنے بدن
یہ غموں کی دھوپ میں کام آنے والی چھتریاں
مسکراتا ہوں غموں کی پردہ پوشی کے لیے
تانتی ہے یوں مری افسردہ حالی چھتریاں
تیز ہے جھکڑ وجود اپنا سنبھالو دوستو!
ایسے موسم میں نہ جائیں گی سنبھالی چھتریاں
کاٹ ہی لے گا بشر دُکھ کی بھری برسات کو
تان کر جھوٹی اُمیدوں کی خیال چھتریاں
ایٹمی چھتری کے دیوانو! اسے تانے گا کون؟
وقت وہ آئے گا، رہ جائیں گی خالی چھتریاں
اپنی منزل تک ابھی تو لاکھ طوفان آئیں گے
تم بدل ڈالو ابھی سے ڈھیلی ڈھالی چھتریاں
دُھوپ کے مارے ہوؤ! کہسار کے دامن میں آؤ
پتّہ پتّہ سائباں ہیں، ڈالی ڈالی چھتریاں

☆

○

شبِ وصال تھی روشن فضا میں بیٹھا تھا
میں تیرے سایۂ لطف و عطا میں بیٹھا تھا

تمام عمر اُسے ڈھونڈنے میں صرف ہوئی
جو چھُپ کے میرے بدن کی گپھا میں بیٹھا تھا

نئی رُتوں کی ہوا لے اُڑی لباس اُس کا
وہ کل تلک تو حریمِ حیا میں بیٹھا تھا

درونِ قافلہ آثار تھے بغاوت کے
عجب سا خوف دِل رہنما میں بیٹھا تھا

بکھیر ڈالا مرا آشیاں ہی آندھی نے
میں انتظار نویدِ صبا میں بیٹھا تھا

ذراسی بات نے اوقات کھول دی اُس کی
وہ کب سے بند حصارِ انا میں بیٹھا تھا

نظر اٹھا کے تُم اَے کاش دیکھ ہی لیتے
میں نذرِ جاں لئے راہِ وفا میں بیٹھا تھا

لہو سے اُس کے ملی دین کو بقائے دوام
وہ قافلہ جو کبھی کربلا میں بیٹھا تھا

اُسی نے لوٹی تھی ابلا کی آبرو کل رات
سویرے بن کے جو مکھیاں سبھا میں بیٹھا تھا

بس اک شکست نے سارے نشے اُتار دئے
وہ تاجدار الگ سی ہوا میں بیٹھا تھا

چلائیں گولیاں جس پر منافقوں نے شبابؔ
صفِ نماز میں یادِ خدا میں بیٹھا تھا

☆

○

حدِستم نہ کر کہ زمانہ خراب ہے
ظالم! خدا سے ڈر کہ زمانہ خراب ہے

اتنا نہ بن سنور کہ زمانہ خراب ہے
میلی نظر سے ڈر کہ زمانہ خراب ہے

بہنا پڑے گا وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ
بن اس کا ہم سفر کہ زمانہ خراب ہے

جو دن دہاڑے لُوٹ رہے ہیں عوام کو
اُن کو نہیں خبر کہ زمانہ خراب ہے

پھلسن قدم قدم پہ ہے بازارِ شوق میں
چل دیکھ بھال کر کہ زمانہ خراب ہے

کچھ اُن پر غور کر جو تقاضے ہیں وقت کے
ان سے نباہ کر کہ زمانہ خراب ہے

آغرقِ جام کردیں ملے ہیں جو رنج وغم
پیمانہ میرا بھر کہ زمانہ خراب ہے

گر بے ٹھکانہ ہیں تو نہیں شرمسار ہم
اب کیا بنائیں گھر کہ زمانہ خراب ہے

محنت، شعور، تجربہ، تعلیم وتربیت
سب کچھ ہے بے اثر کہ زمانہ خراب ہے

دو روٹیاں نہیں نہ سہی ایک ہی سہی
اس پر ہی صبر کر کہ زمانہ خراب ہے

اصلی جو ہیں ادیب اُنہیں پوچھتا ہے کون
پھرتے ہیں دربدر کہ زمانہ خراب ہے

پاکیزہ لاکھ تیری نظر ہو مگر شبابؔ
مت دیکھ اِدھر اُدھر کہ زمانہ خراب ہے

☆

''زندگی کا احساس''

نند کشور وکرم
(دہلی، بھارت)

اُردو کے معروف کہنہ مشق شاعر شبابؔ للت صاحب کو، جو آج لگ بھگ ڈیڑھ درجن شعری مجموعوں اور متعدد کتابوں کے ترجمہ وتالیف سے اُردو ادب کے سرمائے میں قابل قدر اضافہ کرنے کے علاوہ علامہ منوّر لکھنوی مرحوم پر اپنا گراں قدر تحقیقی مقالہ پیش کر کے پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کر چکے ہیں، مَیں تب سے جانتا ہوں جب وہ زائد از نصف صدی پیشتر شباب للت کے نام سے نہیں بلکہ بھگوان داس شمیمؔ للت کے نام سے دنیائے شاعری میں نووارد شاعر کی حیثیت سے قدم رکھ چکے تھے اور انبالہ میں میری طرح زیرِ تعلیم تھے۔

غالباً ۱۹۴۹ء کی بات ہے۔ شری آتما نند جین کالج انبالہ شہر میں ایک مشاعرے کا انعقاد ہوا تھا جس میں جالندھر سے فکرؔ تونسوی، مخمورؔ جالندھری، تاجورؔ سامری اور بلراج کومَلؔ کے علاوہ اخترؔ رضوانی بھی شریک ہوئے تھے۔ اسی مشاعرے کے دوران میرا اُن سے بحیثیت شاعر بھگوان داس شمیمؔ للت تعارف ہوا تھا۔ اور چونکہ اُن دنوں مَیں بھی انبالہ میں ہی قیام پذیر تھا اور اُن ہی کی طرح اس کوچے میں نیا نیا وارد ہوا تھا لہٰذا اُن سے اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں جو بعد میں ایک دوستی میں بدل گئیں۔ بعد ازاں جب مَیں کانپور چلا گیا جہاں سے مَیں نے ماہنامہ 'نئی کہانی'' کا اجراء کیا تھا تب بھی اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ جب اُن کی شادی کے تین برس بعد ہی اُن کی پہلی رفیقۂ حیات کا عین عالمِ شباب میں انتقال ہو گیا تو انہوں نے مجھے انتہائی رنج و غم کی حالت میں بہت ہی دل گداز خط لکھا تھا۔ اُس وقت اس سانحہ نے اُن پر گہرا اثر چھوڑا تھا اور انہوں نے اُس کی یاد کو اپنی شاعری میں بھی بڑے پُر تاثیر انداز میں منعکس کیا تھا:

راہِ منزل میں جدا ہو جائے جس کا ہم سفر
زندگی میں زندگی کا ہو اسے احساس کیا

اب تو کوئی یاد تک دستک نہیں دیتی یہاں
دل کا دروازہ کریں تو کس کی خاطر وا کریں؟

کوئی منزل اس سفر کی اب مجھے ملتی نہیں
تم نے چھوڑا جس سفر میں ساتھ میرا نا گہاں

یہی نہیں پھر جب روہتک سے اُن کی زیرِ ادارت ماہنامہ ''لہریں'' منظرِ عام پر آیا تو انہوں نے مجھے بھی اس رسالے میں لکھنے کی دعوت دی اور میرے افسانے ''ماضی، حال اور مستقبل' کو اس میں شاملِ اشاعت کیا۔

ہمارے کالج کے دنوں میں ترقی پسند شاعر شررؔ فتح پوری اور اسیرؔ منی مزرعوی بھی انبالہ چھاؤنی کے جی۔ ایم۔ این کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔ اور چونکہ شررؔ اور میرا اسٹوڈنٹ فیڈریشن اور ترقی پسند تحریک سے بھی واسطہ تھا لہٰذا ہم نے شبابؔ صاحب کو بھی انجمن ترقی پسند مصنفین میں شرکت کی دعوت دی مگر وہ اس میں غالباً چند بار ہی بددلی سے شریک ہوئے اور انہوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

بعد ازاں ملاقاتوں کا سلسلہ بوجوہ کم ہو گیا حالانکہ ہم ایک ہی وزارت سے وابستہ تھے مگر محکمے الگ الگ ہونے سے کم و بیش ہی ملاقات ہو پاتی تھی۔ وہ ڈائرکٹوریٹ آف فیلڈ پبلسٹی سے منسلک رہے اور مَیں پبلی کیشنز ڈویژن کے ماہنامہ آجکل اور پریس انفارمیشن کے شعبۂ اُردو سے۔ تاہم اُن کی ادبی سرگرمیوں سے مَیں ہمیشہ آگاہ رہا اور اُن کے نت نئے شعری مجموعوں سے متعارف ہوتا رہا۔ غالباً وہ اپنے تمام ہمعصر شعراء سے زیادہ زود گو ہیں۔ انہوں نے اُردو کے متعدد شعری مجموعوں کے علاوہ ہندی، ہماچلی اور اپنی مادری زبان سرائیکی میں بھی اپنی شعری تخلیقات کتابی صورت میں پیش کی ہیں اور داد و تحسین پانے کے علاوہ اپنی تصانیف پر کئی انعامات و اعزازات بھی حاصل کئے ہیں۔

شبابؔ نے اوائل عمر میں ہی شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا اور اپنی ریاضت، لگن اور محنتِ شاقہ سے اس فن میں ایسی مہارت حاصل کی جس کے بغیر شاعری کے دشوار راستے پر چلنا انتہائی دشوار کام ہے۔ اُنہوں نے زبان، عروض اور فن پر مکمل دسترس حاصل کرنے کے بعد ہی اس وادیِ پُر خار میں قدم رکھا اور غور و فکر کے بعد ہی طبع آزمائی کی شروعات کی تا کہ اُن کی زبان و عروض پر کوئی حرف گیری نہ کر سکے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں استعاروں، تشبیہوں اور علامتوں کو خوبصورت اور دلکش انداز میں استعمال ہی نہیں کیا بلکہ اپنی شعری تخلیقات میں دیومالائی تلمیحوں اور تلازموں کا استعمال بھی اتنی کثرت و خوبی سے کیا ہے کہ شاید ہی ہمارے عہد کا کوئی دیگر شاعر کر سکا ہو۔ وہ حساس انسانی دلوں کی ترجمانی کرتے ہیں جو آج کے دور کی پریشانی، بدحواسی، بے چہرگی، تنہائی، بے یقینی نیز رشتوں اور تہذیبی اقدار کے انتشار کا شکار ہو چکے ہیں۔

جیسا کہ مَیں پہلے تحریر کر چکا ہوں وہ انجمنِ ترقی پسند مصنفین کے چند ہی اجلاس میں شامل ہوئے تھے اور یہ بات ان کے کلام کے مطالعے سے بھی ہم پر عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ ادب کی مختلف تحریکوں اور نظریات سے متاثر تو ضرور ہوئے ہیں لیکن کسی تحریک سے وابستہ نہیں ہوئے۔

شبابؔ صاحب نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں وافر کلام پیش کیا ہے جس میں کلاسیکیت سے جدیدیت تک کے انداز و اسلوب پائے جاتے ہیں۔ یہی نہیں انہوں نے بھی اُردو کے اکثر شعراء کی طرح زیادہ تر توجہ غزل پر ہی دی ہے اور اس میں اپنے فنی جوہر کی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ اُن کی بعض غزلیات کے کئی اشعار تو ہمیں متاثر ہی نہیں کرتے بلکہ دل پر نقش ہو کر رہ جاتے ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کئی صدیوں سے ہم شہری ہیں لیکن
لہو میں اب بھی جنگل بولتا ہے

اِک مسلسل شور کی زد میں ہے اب ذہنِ بشر
اس مشینی یگ میں آوازیں بھی پتھر ہو گئیں

کیا خبر ظالم ہوا مجھ کو کہاں لے جائے گی
شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے کی ہے منزل کہاں

کیسے عاشق تھے فقط موہوم وعدوں کے عوض
پتھروں سے دودھ کی نہریں رواں کرتے رہے

زخم پچھلی ہجرتوں کے دِل پہ تازہ ہیں ابھی
جب بھی یاد آئیں وہ گھڑیاں تیر و نشتر ہو گئیں

تپتی سڑک پہ موم کے رتھ پر سوار لوگ
انجام سے خود اپنے خبردار بھی نہیں

تمہیں بھی کل وہ تماشا نہ بخشے گا
جو خنجر آج مرے خون میں نہایا ہے

یہی نہیں نظم میں بھی انہوں نے کئی یادگار نظمیں پیش کی ہیں اور اپنے فنی کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔ موضوعاتی نظمیں کہنے میں انہیں خصوصی دسترس حاصل ہے۔ انہوں نے گوناگوں موضوعات خصوصاً وطنی، قومی اور سماجی موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے اور ان میں ادبی معیار کو بھی قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میدان میں انہوں نے اپنی فنی صلاحیتوں کے وہ جوہر دکھائے ہیں جو اُن کے کمالِ فن کے آئینہ دار ہیں۔ انہوں نے اپنے معاشرے کے مختلف مسائل پر ایسی دل پذیر اور پُر تاثیر نظمیں کہی ہیں کہ منوّر لکھنوی صاحب ایسے اُستادِ فن بھی اس میدان میں اُن کی مہارت و دسترس کے قائل ہو گئے اور انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ:

''شبابؔ کا بھی اصلی رنگ و روپ دیکھنا ہو تو آپ ان کو نظم کے آئینہ میں دیکھیں۔ جہاں دوسرے گوناگوں موضوعات پر وہ اپنے دل کی بات بہت تاثیر انگیز انداز میں بیان کرتے ہیں وہاں جب وہ اپنی پہلی رفیقۂ حیات کی جدائی کے غم میں آنسو بہاتے ہیں تو ان کے دل کی صحیح تصویر ان کے جذبات کے ذریعے ابھر آتی ہے۔ انہوں نے قوم اور وطن کے لیے بہت کچھ کہا ہے سماج کو بھی مخاطب کیا ہے۔ منظر نگاری بھی کی ہے، اور دوسری حقیقتوں کو بھی نظم کے لباس سے آراستہ کیا ہے لیکن ان کا اندازِ بیان شعری کیفیت سے خالی نہیں۔''

شاعری کے علاوہ شباب صاحب کا اہم کارنامہ اپنے اُستاد منوّر لکھنوی پر لکھا اُن کا تحقیقی مقالہ ہے جو اگرچہ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے لکھا تھا مگر اس میں انہوں نے منوّر لکھنوی صاحب کی زندگی، فن، شعری علمی و ادبی کارناموں کی ایسی مکمل تفصیل فراہم کر دی ہے جو آنے والے محققین کے لئے مشعلِ راہ کا کام کرے گی اور جس کے بغیر منوّر لکھنوی صاحب پر کوئی بھی تحقیق مکمل نہیں ہو پائے گی، بقول پروفیسر گیان چند جین:

''شباب کا مقالہ پڑھنے سے منوّر لکھنوی کی شخصیت اور ان کے متنوع کاموں سے بھرپور آگاہی ہو جاتی ہے۔ منوّر کی تصانیف اور تالیفات کو پڑھے بغیر ہی قاری ان سب کے بارے میں اتنا کچھ جان جاتا ہے جیسے اس نے واقعی ان کی ورق گردانی کی ہو۔ اتنا طمانیت بخش کام کرنے پر شبابؔ للت کو بھی احساسِ سرخروئی ہونا چاہیے۔ اس کتاب کا کمال یہ ہے کہ اسے پڑھ کر منوّر کی کتابوں کو پڑھنے کی تحریک آتی ہے۔ مقالہ نگار شاگرد کو اس سے زیادہ کیا چاہیے؟''

شبابؔ نصف صدی سے زیادہ شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں اور اگرچہ انہیں کئی انعامات و اعزازات سے نوازا جا چکا ہے مگر انہیں احساس ہے کہ ایسے امور میں نہ ہی سینئریٹی اور استحقاق ملحوظ نظر ہوتا ہے نہ ہی فنی خدمات کا یا تصانیف و تالیفات کا بلکہ اس سلسلے میں کسی مخصوص گروہ اور اہلِ سیاست کے آستانوں پر سجدہ ریزی کرنے والے حضرات کا ہی بول بالا ہے۔ اُن کی ایک غزل کا مقطع اُن کے اس روحانی کرب کا مظہر ہے۔

دنیا کبھی تو مجھ کو بھی دے گی مرا مقام
یہ بھی شبابؔ اپنا خیالی پلاؤ ہے

مَیں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی شکایات اکثر شاعروں اور ادیبوں کو ہوتی ہے اور کچھ حد تک یہ صحیح بھی ہے مگر بعض اوقات ہم ادیب اور شاعر بھی اپنے بارے میں کچھ خوش فہمی کا شکار ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ادیب کا کام اپنے ادبی کاموں کی جانب ہی توجہ دینا ہے نہ کہ انعامات و اعزازات پانے کی جہد میں۔ کیونکہ اس دور میں اکثر بے انصافی ہوتی ہی رہتی ہے اور بوجوہ بعض اوقات انعام کے مستحق حضرات کو محرومی سے ہی سابقہ پڑتا ہے؟ لہٰذا شباب

صاحب کو بھی چاہیے کہ وہ ان نام نہاد انعامات واعزازات سے بے نیاز ہوکر تخلیقی کاوشوں کا اپنا ادبی سفر جاری رکھیں اور اُردو کے ادبی سرمائے میں اضافہ کریں اور اپنے اس شعر کی عملی تصویر بنیں کہ:

جو اہلِ سیاست کی، توصیف سے حاصل ہو
اس خلعتِ زریں کو شاعر کی بلا اوڑھے

اور ہاں! اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ شباب صاحب کی نظم و غزل دونوں پر گرفت مضبوط ہے اور انہوں نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے مگر بعض جگہ اُن کی یہ طبع آزمائی انہیں عام شاعروں کی صف میں لاکھڑا کرتی ہے جو سرکاری اداروں، انجمنوں اور اکادمیوں کی فرمائش پر چند سو روپوں یا اُس موقع سے استفادہ کرنے یا اخبار یا رسالے میں شائع ہونے کے لئے اپنی منظوم تخلیق پیش کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں چاہے وہ دیوالی ہو یا محرم،، کسی رہنما کا یوم ولادت ہو یا سانحۂ ارتحال۔ اور بعض نے تو ایسا معلوم ہوتا ہے ان مواقع کے لئے نظمیں پہلے ہی سے لکھ کر رکھی ہوتی ہیں اور جوں ہی اُنہیں فرمائش یا موقع ملتا ہے وہ فوراً اسے پیش کر دیتے ہیں۔ اگر وہ اس معاملے میں عام شعراء کی اس ڈگر سے احتراز کرتے اور اپنی انفرادیت قائم رکھنے کی کوشش کرتے تو میرے خیال میں انہیں عام شاعروں کی صف سے الگ ایک منفرد مقام حاصل کرنے میں مدد ملتی کیونکہ ہر بڑے شاعر میں انفرادیت تو ہوتی ہی ہے اور انہیں ان گنت شاعروں میں بھی پہچانا جاسکتا ہے۔ چاہے وہ میرؔ و غالبؔ ہوں یا اقبال و جوش۔

○

صحرا کی پیاس شباب للت کی غزلوں اور نظموں کا پانچواں مجموعہ ہے جو پی کے پبلشر دلی کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ شباب للت تعلیمی دور سے ہی مشقِ سخن کر رہے ہیں ان کا پہلا مجموعہ ''مضراب'' کے عنوان سے ۱۹۶۱ میں شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں پتوار، پُروائیا اور منزل منزل شائع ہو چکے ہیں۔ شباب للت کی فکر اور انداز فکر گھریلو ماحول سے بہت متاثر ہے گھریلو ماحول جو خاص ہندوستانی معاشرے کا حصہ ہے۔ شباب کی شاعری میں اکثر وہ علامتیں اور تلامذے جن کا تعلق ''ہندو'' معاشرے سے ہے بڑی خوبی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً۔

تمہاری یاد کی پاکیزہ لکشمن ریکھا
مجھے بچاتی رہی ایک پاسباں کی طرح
رہنا تم آرتی لئے ساحل پہ منتظر
میں درد کے سفر سے پلٹ کر جب آؤنگا

صحرا کی پیاس میں جو تازگی اور نیاپن جو ہمیں محسوس ہوتا ہے وہ خاص طور پر ایسی ہی علامتوں کے فنکارانہ صرف سے پیدا ہوا ہے اور علامتوں کا اپنا دیومالائی اور مذہبی امیج ہے۔ اس پس منظر میں شاعر کے اپنے احساسات اور تجربات ہمیں ایک ایسی فضا میں پہنچا دیتے ہیں جہاں عشق و محبت کا ایک پاکیزہ تصور ہمارے ذہن میں ابھرتا ہے۔ اروشی، منیکا دیوتاؤں کا سنگھاسن، مورتی کی آنکھ کا جادو، کام دیو کی پھولوں جڑی کمان، ایسے ان گنت علائم اور تلازمے اس شعری مجموعے میں ملتے ہیں جن کے سہارے شباب للت نے ایسی امیجیس بنائی ہیں جو اردو کے بیشتر شعراء کے یہاں کمیاب ہیں یہی شباب کی انفرادیت ہے۔

وشنو ہو، شیو ہو، کرشن ہو درگا ہو رام ہو
دیکھا ولی نہ کوئی بھی ہتھیار کے بغیر

غزل کی روایتی رومانیت اور کلاسیکی ایمائیت سے شباب للت نے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ مجموعی طور پر جو تصویریں ''صحرا کی پیاس'' میں نظر آتی ہیں ہمیں اپنی طرف مائل کر لیتی ہیں۔

کیلاش ماہر
(دہلی، بھارت)

''خامشی کا طلسم''

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن
(گڑگاؤں، بھارت)

شبابؔ للت جانے پہچانے شاعر ہیں۔ ''مضراب'' سے ''پتوار'' تک ان کی فنی ریاضت بہت متاثر کرتی ہے۔ مجھے شباب کی غزلیں زیادہ پسند ہیں اس لیے کہ ان کی غزلیں ایک ذہنی کیفیت اور ذہنی رویے کو زیادہ اچھی طرح نمایاں کرتی ہیں۔ روایت کا احساس گہرا ہے زبان صاف اور شگفتہ۔ وہ تغزل اور شعریت سب کچھ سمجھتے ہیں۔ لمحاتی تجربے بھی اسی لیے قیمتی بن گئے ہیں۔ ذہنی اور فکری کیفیتیں چھائی ہوئی ہیں۔ تأثر اور تخیل، جذبہ اور حسّی تجربوں کے بغیر تغزل کا تصور پیدا نہیں ہوتا۔ شبابؔ کی انفرادیت کو اس پورے تخلیقی عمل میں پہچان لینا مشکل نہیں ہے۔ ان کی غزلوں میں تأثر اور تخیل کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ جذباتی کیفیتیں اور حسّی تجربے بھی متاثر کرتے ہیں۔ ان کی بعض نظمیں اردو کی اچھی نظموں میں سے شمار کی جاسکتی ہیں۔ میرا اشارہ اُن نظموں کی طرف ہے جہاں المیہ کا حُسن ملتا ہے۔ شدتِ احساس سے سانحات کے پیکر اُجاگر ہوتے ہیں۔ ''اعترافِ شکست''، ''ہچکیاں''، ''سنجوگ''، اور ''چودہ اپریل'' کا حقیقی المیہ ایک مضمحل روح اور ایک بیقرار ذہن کے اندازِ جنوں کو پیش کرتا ہے۔ اندرونی تجربوں میں ایک پورا گھر، ایک پوری سوسائٹی سمٹ آئی ہے۔

غزلوں میں جو بلاغت ہے وہ روایت کے گہرے احساس سے پیدا ہوئی ہے۔ اردو غزل کی مخصوص راوایات سے نئے شاعروں کو بلاغت اور طلسمی رمزیت کی ایک دُنیا ہاتھ آئی ہے۔ شباب اس دنیا کو پہچانتے ہیں۔ ان کے لیے بھی چونکہ وہ تجربے زیادہ قیمتی ہیں جو حسن اور عشق کے طلسمی دائرے میں پیدا ہوتے ہیں اس لیے وہ اپنی روایات سے زیادہ فائدہ اٹھارہے ہیں۔ اس طرح ان کی فکر کا دائرہ محدود نہیں ہوجاتا۔ ان کا تجربہ پھیل کر ہمارے تجربوں کو بھی اپنے قریب کرلیتا ہے۔ بزرگوں کے افکار اور تجربات کی یہی خصوصیت رہی ہے۔ چراغ سے چراغ جلاتے ہوئے وہ اس گہری حقیقت پر نظر رکھتے ہیں۔ زبان کی صفائی اور شگفتگی کی طرف اشارہ کرچکا ہوں۔ اتنی صاف زبان جدید غزل میں بہت کم ملتی ہے :

آج پھر ہم نے نوازا جام کو
آج پھر ماضی کے غم یاد آگئے
زیست کی پُر پیچ راہیں دیکھ کر
آپ کی زلفوں کے خم یاد آگئے

مے کدے میں بسر اوقات بھی ہوجاتی ہے
غمِ دوراں کی مدارات بھی ہوجاتی ہے
زندگانی میں وہ لمحات بھی آتے ہیں کہ بس
عقل منت کشِ جذبات بھی ہوجاتی ہے
غم دیے جس نے اسی جانِ تمنا کی نظر
خود شریکِ غمِ حالات بھی ہوجاتی ہے
بارِ خاطر ہے جو اے جانِ تمنا تم کو
ہم سے انجانے وہ بات بھی ہوجاتی ہے

آرزوؤں کی جہاں بن جایئے
میرے دل کی داستاں بن جایئے
چارۂ دردِ نہاں بن جایئے
میرے غم کے قدرداں بن جایئے
اس طرح بس جایئے ہر لفظ میں
میرا اندازِ بیاں بن جایئے
بند ہوجائے زمانے کی زبان
آپ میرے ہم زباں بن جایئے

کوئی سمجھائے میری آنکھوں کو
رازِ الفت کو راز رہنے دیں

اس میں بھی کوئی طنز کا پہلو ضرور ہے
کچھ مصلحت سے ذکرِ خدا کررہے ہیں آپ

عالم بغور سننے لگا میری داستان
جب میری داستاں میں ترا نام آگیا
اب میکدہ کی سمت بھی اٹھتی نہیں نگاہ
کس کا خیال آج سرِ شام آگیا
ہوش وخرد، قرار وسکوں، نقدِ جان ودل
جو کچھ بھی تھا مرا وہ تیرے کام آگیا

ہم دل سے نقوشِ غمِ جاناں کو مٹا کر
تازہ غمِ دوراں کی روایات کریں گے

شباب کے ذہنی اور جذباتی تجربوں کو روایات کی جو رشنی ملی ہے اُس کی کرنیں نمایاں ہیں۔ کسی لمحہ یکسانیت کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ رومانیت خوب

سے خوب تر کی جستجو میں اُبھرتی ہے۔ نفسی کیفیتیں بھی ہیں اور اچانک پن بھی۔ شاعر کے وجدان سے ہم بہت قریب ہوجاتے ہیں۔ شبابؔ کے تجربے پیچیدہ نہیں ہیں اور وہ اس کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ شعوری طور پر جب تجربوں کو پیچیدہ بنانے کی کوشش ہوتی ہے تو رمزی علامتوں میں کشش محسوس نہیں ہوتی۔ شباب کے تجربے سادہ ہیں۔ صاف اور سادہ تجربوں کے لیے اس قسم کے اسلوب کی ضرورت ہے۔ شباب کے ہاں سادگی بھی ہے اور پختگی بھی۔ الفاظ کے انتخاب اور تراکیب اور کنایات کے استعمال میں ان کا محتاط شعور ہمیشہ چوکنّا رہتا ہے۔ فرماتے ہیں:

چلے جایئے بس زمانے کے ساتھ
غلط بات کو بھی بس روا مانیے

وہ زخم جو علاج کی حد سے گزر گئے
تیری نظر کی ایک اشارے سے بھر گئے
جتنے جبینِ فطرتِ برہم پہ آئے بل
اُتنے ہی اور گیسوئے ہستی سنور گئے
حاصلِ زندگی ہیں وہ لمحے
جو تیری یاد میں گزارے ہیں

خود فراموشی و آوارگی و رُسوائی
کتنے افسانے ہیں منسوب مرے نام کے ساتھ
حادثہ ایک محبت کا مصائب لاکھوں
کتنے آغاز ہیں وابستہ اس انجام کے ساتھ

ہر سانس میں ہے موجۂ دریا کا پیچ و تاب
ہے تو یہ زندگی ہی مگر مطمئن نہیں

مقامِ دوست کے پانے کا ذکر ہی کیا ہے
تلاشِ دوست میں اپنی ہی کچھ خبر نہ ملی

(مضراب)

عشق کی راہوں پہ جوں جوں زندگی بڑھتی گئی
وہم سب مٹتے گئے خود آگہی بڑھتی گئی

دردحد سے سوا نہیں ہوتا
آپ کا سامنا نہیں ہوتا

وہ دن خدا نہ لائے کبھی اے وقارِ حسن!
آنسو بہا کے جب تجھے رسوا کرے کوئی

اس بزم میں مآلِ محبت کا ذکر تھا
بے اختیار آئی مجھے کوہکن کی یاد

پھر تیرے گیسوؤں کے شکن یاد آئے ہیں
دھندلا گئی ہے تیری جبیں کے شکن کی یاد

بیٹھے بٹھائے رو دیے بے اختیار ہم
آئی کچھ اس ادا سے تیری انجمن کی یاد

مرجھا کے رہ گیا ہے مرا غنچۂ امید
جب سے تیرے خلوص کا سایہ نہیں رہا

پھول کا ہے چمن میں اپنا مقام
اور کانٹے کی اپنی عظمت ہے

آدمی کو نہ جانیے معصوم
آدمی فتنۂ قیامت ہے

یہ تیری زلف بکھری یا میری ہستی کا شیرازہ
خدا کے واسطے اس سلسلہ کو مختصر کردے

ہم مسافر ہیں بہت ہی دور کے
ہم سے اتنی بے رخی اچھی نہیں

(پتوار)

ان اشعار سے شباب للت کے ذہنی رویے اور مخصوص رجحان کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ تجربوں کی تنظیم اور اندازِ بیان کی سادگی دونوں متاثر کرتی ہیں۔

''پتوار'' میں جو نظمیں شامل ہیں ان میں بدلتے ہوئے حالات کی تصویر کشی ملتی ہے۔ اقدارِ حیات کو وہ اسی طرح دیکھنے کے عادی ہیں جس طرح اردو کے ترقی پسند شعراء عموماً دیکھتے رہے ہیں۔ امید ہے کہ حقیقتوں کے یہ شاعرانہ تجربے پسند کیے جائیں گے۔ ان نظموں کا شعوری اور منطقی تجزیہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ سماجی اور سیاسی بصیرت کی وہ دھوپ بھی ملے گی جس سے ہر پہلو روشن ہے۔ شبابؔ نے ان نظموں سے ایک کام لیا ہے اور وہ یہ کہ ہندوستانی عوام کو ایک خاص جذباتی سطح پر لایا جائے۔ ان نظموں کے بنیادی خیال کا رشتہ اپنی جذباتی زندگی سے بہت گہرا ہے۔ شبابؔ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ عارضی سیاسی یا سماجی مصلحت سامنے نہ رہے۔ انہیں افادیت کا خیال ہر لحہ رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے تجربے جب تک جذبات اور احساسات سے بالکل ہم آہنگ نہ ہوں افادیت کا وہ تصور ذہن میں نہیں ابھرے گا جسے عام مادّی افادیت سے علیحدہ ادبی افادیت کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ یہ موضوعات تخلیق کے زبردست محرک بن سکتے ہیں۔ اگر شدید داخلیت پیدا ہو اور جمالیاتی اقدار بھی موجود ہوں۔

شبابؔ کی نظموں میں جو خلوص ہے اس میں سچی چاندی کی چمک ہے۔ لمحاتی واقعات پر لکھی گئی نظمیں بھی متاثر کرتی ہیں۔ ''سپاہی کی رخصتی'' ''لدّاخ اور نیفا کے شہید'' ''وقت کی آواز'' اور ''نغمۂ تعمیر'' میں شباب کے رجحان، مزاج اور

پُرخلوص انفرادیت کے دیکھا جاسکتا ہے۔

آخر میں شباب للت کے قطعات ورباعیات کے چند نمونے پیش کر کے اس مجموعے کو پڑھنے کی دعوت دیتا ہوں:

جھکی جھکی سی نگاہیں یہ خامشی کا طلسم
یہ بات بات پہ آہیں فسردگی کا طلسم
مزاجِ حسن کی کیفیت الم توبہ
الٰہی ٹوٹ نہ جائے یہ زندگی کا طلسم

غم فزا ہو گیا میرا نصیب
خاک میں کھو گیا میرا نصیب
زندگی کی گداز راتوں پر
رکھ کے سر سوگیا میرا نصیب

دل نے کیا کیا فریب کھائے ہیں
جن کے ہم ہیں وہی پرائے ہیں

کوئی ہوتا تو مل گیا ہوتا
دُور تک ہم پکار آئے ہیں

اپنی طاقت پہ نہ اترائیں حضورِ عالی
آپ نے پھیر لیں نظریں تو قیامت کیا ہے
آپ کی طفلِ تسلی کا بھروسا کیسا
آپ کے وعدۂ رنگیں میں صداقت کیا ہے

ظلمتِ غم پگھل گئی ہوتی
درد کی رات ڈھل گئی ہوتی
تم نے دیکھا نہ پیار سے ورنہ
میری قسمت بدل گئی ہوتی

شبابؔ کی شاعری آورد اور مبالغے سے پاک ہے۔ تغزل اور خوش و خلوص سے بھری ہوئی ہے۔ ''پتوار'' اور ''مضرات'' کے شاعر کی انفرادیت آپ کی توجہ چاہتی ہے۔

○

شبابؔ للت کی غزلیں کبیرؔ کے لہجے کی کاٹ رکھتی ہیں۔ وہ ارضِ پاک کے تمام مذہبوں کا احترام کرتے ہیں لیکن ہر مذہب کے نام پر ہونے والی ناانصافیوں اور زیادتیوں پر انگلی اٹھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

ابتک کے مطالعے سے یہ بات قارئینِ کرام سمجھ چکے ہوں گے کہ شباب للت کی غزلیں تمام دھرے پر کہی جانے والی ان بے شمار غزلوں سے منفرد ہیں جن کا مقدر پل دو پل ساتھ دیتا ہے اور بالآخر وہ قصۂ پارینہ بن جاتی ہیں۔ جب تک اعلیٰ اور ارفع اخلاقی، روحانی، تہذیبی اور ثقافتی اقدار کی اہمیت باقی رہیگی شبابؔ للت کی غزلیں گونجتی رہیں گی کہ ان اوصاف کی ترجمانی کرنے میں ان کا فی زمانہ کوئی ثانی نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی واضح کردوں کہ شبابؔ للت صرف دماغ کی شاعری نہیں کرتے۔ صرف تعقل کے محراب تلے ان کی ان کی اذان نہیں گونجتی، بلکہ انہیں اس بات کا بھی پورا عرفان ہے کہ شاعری اور خصوصاً غزل اگر دل کی ترجمانی نہ کرے تو نامکمل ہے۔ لہٰذا شباب للت کی شاعری غزل کے روایتی معاملات سے چشم پوشی کیونکر کرسکتی ہے۔ عشقیہ مضامین کے ضمن میں بھی وہ لکیر کے فقیر نہیں ہیں۔ اس دشت میں بھی شبابؔ بہت دور دور نکل گئے ہیں۔ کسی سطحی، وقتی جذبے کے تحت انہوں نے کوئی شعر نہیں کہا۔ عشق کے مستقل اور ازلی موضوعات پر دیرپا اور لافانی شعر کہنے والے اس البیلے شاعر کے چند رومانی اشعار ملاحظہ فرمایئے:

اس اپنی عمر کی تیکھی ڈھلان پر بھی شبابؔ
ہو رو برو کوئی چہرہ تو تکنا پڑتا ہے
وہ بدن پھول سا ہے سنتے تھے
ہاتھ میرا ہی جل گیا کیونکر
میرے ڈھلتے بدن پر جاؤ
کچھ خزانے بھی ہیں اس کھنڈر میں۔

راشد اقبال فاروقی (بھارت)

''سرابوں کا سفر''

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
(حیدرآباد، دکن)

غزل نہایت سخت جان صنفِ شاعری ہے۔ اس کی محبوبیت اور مقبولیت ہے کہ ہر دور میں اس نے مخالفتوں کا سامنا کیا، وار سہے پھر بھی اس کی طاقت وتوانائی، رونگ وروپ، نکھار و بانکپن اور آب وتاب میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کسی نے اس کی اصلاح کی مساعی کیں، کسی نے گردن زنی قرار دیا، کسی نے وحشی صنفِ سخن سے تعبیر کیا اور کسی نے کچھ لیکن غزل پر اس ساری دوڑ دھوپ کا کوئی منفی اثر مرتب نہیں ہوا بلکہ اس کے خدوخال کچھ اور ہی دیدہ زیب ہوئے۔ ویسے پہلے بھی غزل کے موضوعات ایسے محدود نہیں تھے، کم کم ہی سہی زندگی، زمین اور زمانے کی باتیں غزل میں ابتداء سے ہوتی آئی ہیں۔ بدلتے حالات میں غزل نے اپنے کینوس کو اور کشادہ کرلیا، کچھ رنگ بھرلیا۔ غزل کے کردار میں ہے بھی کچھ ایسی لوچ و لچک پر اس اُس نے محمد قلی قطب شاہ کا بھی ساتھ دیا، حسن شوقی کا بھی۔ ولی اور سراج کا بھی اور میر و مصحفی کا بھی۔ غالبؔ اور داغؔ کا بھی آزاد اور کا حسرت بھی۔ مخمور سعید اور ندا فاضلی کا بھی۔ اور آج کے جدید سے جدید شاعر کے مزاج سے بھی غزل مناسبت رکھتی ہے۔ ورنہ آج قصیدہ ہو کہ مرثیہ، رباعی ہو کہ مثنوی، لکھے جارہے ہوں لیکن ان میں وہ آن بان کہاں؟ غزل میں آج بھی حسن وعشق کی باتیں ہیں جن کی اساس پر اُس کو کبھی بدنا، کیا گیا لیکن آس پاس اور اطراف واکناف اس میں پہلے بھی سانس لتے تھے آج بھی لیتے ہیں۔ پہلے کے مقابلے میں آج زندگی میں پیچیدگیاں زیادہ ہیں۔ معاشرہ الجھنوں کا شکار ہے۔ پہلے ہمارا گاؤں ہمارا علاقہ، ہی ہماری دنیا تھی، آج ساری دنیا ایک گاؤں بن چکی ہے۔ فاصلے سمٹ گئے ہیں، دوریاں قربتوں میں تبدیل ہوگئی ہیں، آن واحد میں دنیا کے ایک گوشے کی خبر دوسرے گوشے کو پہنچ جاتی ہے۔ کہیں کچھ ہوا ہو دنیا کے کسی بھی خطہ پر اس کے اثرات یوں مرتب ہوئے ہیں جیسے یہ اسی خطے کی بات ہو۔ دیگر اصنافِ ادب میں بھی ان حالات وحوادث کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ لیکن غزل ان سب سے بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ ان کی ترجمان اور آئینہ دار بن جاتی ہے۔ عصر حاضر میں بیشتر شاعروں کی غزلیں اس کا ثبوت ہیں۔ غزل پہلے بھی اردو شاعری کی آبرو تھی، آج بھی اردو شاعری کی آبرو ہے اور یہ سدا بہار صنف آئندہ بھی اردو شاعری کی آبرو رہے گی۔ اس آبرو کو برقرار رکھنے والے شاعروں کی فہرست بلاشبہ طویل ہے۔ چنانچہ سارے شاعروں کے نام گنانے کی بجائے میں صرف ان شاعر کا نام لوں گا جس کی غزل گوئی یہاں اس گفتگو کا موضوع ہے یعنی شباب للت!

شباب للت، کچھ نصف صدی سے شاعری کررہے ہیں۔ اُن کے تاحال اردو میں (۱۱) شعری مجموعے ہندی میں (۴) اور پہاڑی میں (۲) شائع ہوچکے ہیں۔ منور لکھنوی پر اُن کا گراں قدر تحقیقی کام ہے جو کتابی صورت میں آچکا ہے اور ان کے علاوہ بھی انہوں نے طنزیہ مضامین لکھے، کئی کتابیں مرتب کیں اور کئی ترجمے کیے۔ ان کی تخلیقات میں شاعری کا حصہ بھاری ہے اور شاعری میں انہوں نے غزل کی طرف ویسی توجہ دی جیسی نظم کی طرف۔ ان کی کئی نظمیں خوبصورت اور عُمدہ ہیں۔ عام طور پر پسند بھی کی گئیں اور مجھے بھی پسند آئیں لیکن اُن کی غزلیں بھی کم نہیں۔ بلکہ میں اپنے طور پر ان کی غزلوں میں ایک کشش محسوس کی۔ انہوں نے غزلوں میں اُن سارے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے جس سے اردو غزل کا دامن بھرا پڑا ہے۔ صنف غزل کی لوچ و لچک اور اس کی وسعتوں اور پہنائیوں سے شباب للت نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور زندگی کے کیے موضوعات کو غزل کے اشعار میں مہارت اور فنکاری کے ساتھ سمو دیا ہے۔ تاہم غزل کے تعلق سے ان کا رویہ روایتی نہیں، اُن کے اشعار میں ایک آنچ ایک تیکھا پن ہے، ایک ایسی کیفیت ہے جس کو شباب للت کی شخصیت کا پرتو کہا جاسکتا ہے۔ شباب للت کا اردو کی کلاسیکی شاعری کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ وہ کلاسیکی شاعری سے غیر معمولی طور پر متاثر ہیں۔ لیکن ان کے ہاں کلاسیکی شاعری کی تقلید نہیں ملتی اس سے استفادہ ملتا ہے۔ انہوں نے کلاسکیت کو اپنے ذوقِ شعری میں جذب کرکے اسے نئی غزل کی شکل دیدی ہے اور وہ اردو کے ایسے معدودے چند شاعروں میں ہیں۔ ورنہ ہمارے بعض شاعروں نے کلاسکیت کو ایسے اپنایا کہ گویا عصریت سے منہ موڑ لیا اور اگر کلاسیت کو نظر انداز کے عصری قدروں کو اختیار کیا تو اوٹ پٹانگ کہنے لگے۔ شباب للت کے یہاں وہ جو ضبط اور گہراؤ ہے وہ صرف کلاسکیت سے استفادہ اور ہماری شائستہ اور تہذیبی اقدار سے وابستگی ہی کی وجہ سے نہیں۔ یہ ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ غزل کے یہ اشعار

میں لے سکوں بھی تو دشمن سے انتقام نہ لوں
تو بازوؤں کو میرے بے گزند کر یارب

فتورِ نفس کو حکمِ شکست یابی دے
شعورِ فکرو نظر کو بلند کر یارب

بڑی مشکلوں سے رہائی ملی
گھِرا میں انا کی چڑیلوں میں تھا

پھر نہ بے مائیگی قریں آئی
ہاتھ جب دولتِ یقیں آئی

شباب للت کی غزل سچ پوچھیے تو عصر کے شب و روز اور تصویر اور تفسیر ہے۔ اپنے دور کے خوب و زشت نشیب و فراز اور زیر و زبر پر اُن کی گہری نظر ہے، اس کو بہر کیف تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

مذہب ہمارے لیے قابلِ احترام چیز ہے۔ کبھی یہ واقعی زیادہ قابلِ احترام رہا۔ ہمارے آباء و اجداد اپنے مذہب پر سچے دل سے کاربند تھے۔ ظاہری و باطنی طور پر وہ پکے ہندو تھے، پکّے مسلمان تھے، پکّے سکھ تھے، پکّے عیسائی تھے۔ وہ دوسرے مذاہب کا دل سے احترام کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو دل سے عزیز تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد، رنج و غم اور الجھنوں اور پریشانیوں میں ایسے شریک ہوتے جیسے وہ اُن کا اپنا دکھ درد ہو۔ آج مذہب وہ مذہب نہیں۔ وجہ نفاق اور فساد ہے۔ ہم اپنے مذہب کے کم پابند ہیں، دوسرے کے مذہب کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ مسجد مندر کے جھگڑے، یہی ہمارا مذہب ہے۔ پہلے سیاست پر مذہب غالب تھا، مگر اب مذہب پر سیاست غالب آچکی ہے۔ سیاست داں خود مذہب کی ابجد سے واقف نہیں۔ لیکن اقتدار کے لیے مذہب کا استحصال کرتے ہیں، مذہب کو کھلونا بنائے ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے جو بھی برآمد ہو رہا ہے وہ آپ ہم دیکھ رہے ہیں، بھگت رہے ہیں۔ شباب للت کی غزلوں میں ایسے اشعار کی کمی نہیں چند اشعار۔

اسی بشر نے مسجد، مندر، گرجا گھر تعمیر کیے
اسی کے ہاتھوں گرجے، مسجد اور شوالے ٹوٹ چکے ہیں

بہیں گے کب تلک ندیاں لہو کی نام مذہب پر
کہاں تک ہم کو یہ دیر و حرم جینے نہیں دیں گے

وہگرو، اللہ، ایشور، گاڈ سب چُپ تھے شبابؔ
نام کے پر اُن کے لہو کی بہہ رہی تھیں ندیاں

سیاست دانوں کا مقصد اب کچھ اور نہیں۔ صرف حصولِ اقتدار رہ گیا ہے۔ کسی طرح کرسی حاصل کی جائے اور بس۔ نہ انتظامِ حکومت سے انہیں دلچسپی اور نہ عوام کی صلاح و فلاح سے۔ ہر طرف انتشار و اختلال، رشوت ستانی، اقربا پروری، منافع خوری، اسکینڈلز، گھٹالے، یہ سب اس لیے ''زندہ'' ہیں کہ ہمارے سیاست داں اور وزراء ان میں کہیں نہ کہیں ملوث ہوتے ہیں۔ انہیں جائز و ناجائز (بلکہ جائز کہاں صرف ناجائز) طریقوں سے اپنی دولت بڑھانے کی فکر ہوتی ہے۔ عوام جائیں چولہے میں۔ عوام سے بندھے ٹکے مواقع پر زبانی ہمدردی، شباب للت نے ہمارے انتظامیہ ہمارے وزراء اور سیاست دانوں کے کردار پر گہری نظر رکھی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ ہستیاں امورِ مملکت سے کتنے واقف ہیں اور عوام کے تئیں کتنے مخلص۔ کیسے چبھتے ہوتے اشعار ہیں بھاری طنز کے کاری وار۔

شکم رعایا کے فاقہ مستی کی بھٹیوں میں جھلس رہے تھے
وہ دعیدِ جمہوریے کا نیرو مزے بنسی بجا کے خوش تھا

یہ دورِ نو کے جہانگیر گونگے بہرے ہیں
فضول عدل کی زنجیر میں ہلاتا ہوں

عدل کی زنجیر کھینچوں شوق سے لیکن یہاں
گھنٹیاں بجتی ہیں فریادیں سنی جاتی نہیں

کوئی صیاد ہم اہلِ چمن کو کیا بگاڑے گا
ہمیں تو باغبانوں کا ستم جینے نہیں دیں گے

اور یہ دیکھیے ہماری قیادت اور ہمارے صاحبانِ کرسی کا کردار۔

اسی نے لوٹی تھی ایلا کی آبرو کل رات
سویرے بن کے جو مکھیا سبھا میں بیٹھا تھا

مجھے شباب للت کی جو باتیں زیادہ متاثر کرتی ہیں وہ ان کی صاف دلی اور شفاف ذہنی ہے۔ شباب للت نے ہندو اور اسلامی کرداروں، تلمیحات، علائم اور تلازموں کو بکثرت استعمال کیا ہے۔ ایسے موضوعات پر اول تو ان کے یہاں نظمیں مل جائیں گی لیکن اُن کی غزلوں سے بھی ایسے کئی اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اس سے اُن کے مطالعہ کی وسعت کا پتہ تو چلتا ہی ہے، یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ دیگر مذاہب اور عقیدوں کا کتنا احترام کرتے ہیں۔ وہ دیگر مذاہب کے کرداروں اور واقعات کو ایسے ہی عزیز رکھتے ہیں جیسے اُن کے اپنے مذہب کے واقعات اور کردار اُن کو عزیز ہیں۔ ہم ہندوستانیوں میں اگر اسی وسیع النظری، کشادہ قلبی اور دیگر مذاہب کا احترام عام ہو جائے تو یہ ملک واقعی جنت نشان ہو جائے۔ ہندومت کے بارے میں اُن کے ہاں علائم تلازمے ملیں تو ظاہر ہے تعجب نہیں ہوگا لیکن انہوں نے اسلامی تلمیحات اور حوالوں سے بھی اپنی غزلوں کو سجا رکھا ہے اور یہ محض شعر گفتن نہیں، شعر کا جزو بن کر، معنویت تہہ دار ہو جاتی ہے اور مفہوم میں توسیع بھی آجاتی ہے۔ پہلے ہندو علائم اور تلازمے چند اشعار۔

میں جہاں بھی جاؤں اس کی لکشمن ریکھا میں ہوں
ہاں کوئی کرتا ہے میری پاسبانی ہر طرف

یہ زندگی ہے کہ سیتا ہے ہے اک فریب زدہ
بھروسا کرلیا اس نے بھی ایک راون پر

پاجاؤ گے سکون کی سیتا کا تم سراغ
تم بھی اگر انا کا سمندر پھلانگ لو

اور یہ اسلامی تلمیحات وغیرہ

دین کو آبِ بقا خود رہ کے پیاسا دے گیا

درسِ جانبازی محمدؐ کا نواسا دے گیا

ہر آیتِ قرآں ہے طہارت کا خزینہ
احکام ہیں یزداں کے بگفتارِ محمدؐ

منعم سے زیادہ یہاں مفلس کی ہے پرسش
دربارِ محمدؐ ہے یہ دربارِ محمدؐ

ہم تو یہ سنتے تھے کوئی صاحبِ ثروت ہے شباب
وہ تو خواجہ! تیرے کوچے کا گدا گر نکلا

مختلف مذاہب کی اعلیٰ وارفع اقدار جب ہماری رہنما ہوں تو ہمارا معاشرہ نفرت، دشمنی، بغض، عداوت اور تعصب سے پاک صالح اور صحت مند ہوسکتا ہے، ایک مثالی معاشرہ! اچھے اور سچے فنکار سے ایسے ہی مثالی معاشرہ کی تشکیل میں معاونت کرتے، اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔ شباب للت نے بھی یہی کیا ہے۔ اور پھر اس دنیا کے ادلتے بدلتے رنگ و روپ، ٹوٹتی بکھرتی قدریں، معاشرتی بحران اور روحانی اقدار کا زوال۔ انہوں نے ایسے ایسے مناظر کو اپنی شاعری کے کیمرے کی آنکھ سے دیکھا اور الفاظ کے لینس میں قید کرلیا ہے کہ وہ یادگار بن گئے ہیں۔ یہ دیکھیے غزل کے البم سے چند تصویریں پیش کررہا ہوں۔

ہم نے سورج کی طرح جس کی پرستش کی تھی
وہ تو کم بخت اندھیروں کا سمند نکلا

یہ نئی پیڑھی خدا رکھے بڑی بے درد ہے
ماں کی ممتا باپ کی شفقت کا اس کو پاس کیا

بچالی میرے خدا نے میرے ضمیر کی لاج
نظامِ جبر کا میں بن سکا نہ کارندہ

اپنے اعمال سے تباہ تھے لوگ
پھر بھی الزام آسماں پر تھا

اس افراتفری، انتشار واختلال، اقدار کے بحران، تہذیبی سطح پر بے منظری، اس داغ داغ اُجالا اور شب گزیدۂ سحر کے باوجود شباب للت، انسان اور انسانیت سے مایوس نہیں۔ کچھ تو برطانوی سامراج کی سازشوں کچھ ہمارے قائدین کی ناعاقبت اندیشی اور کچھ ہماری بے توجہی کہ ہم غلط راہوں پر چل پڑے لیکن ان تاریکیوں میں بھی ننھی منی شمعیں فروزاں ہیں۔ انسان کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

جہاں تک تیرے اجیالے ملیں گے
وہیں تک چاہنے والے ملیں گے

یہ دنیا ہی جنت بنے گر کرے
ہراک دین کا احترام آدمی

آگ نفرت کی بجھا سکتا ہے شاعر کا کلام
یہ کرشمہ بھی زمانے کو دکھایا جائے

ملے رہبر کوئی مخلص تو شاید کارواں اپنا
تشدد کے بھیانک خارزاروں سے نکل آئے

کلاسکیت اور اردو شاعری کی روایات سے غیر محسوس طور پر اپنا رشتہ استوار رکھنے کی وجہ سے شباب للت نے جدید رنگ میں اشعار کہتے ہوئے بھی ادبی اور فنی تقاضوں اور تہذیبی اقدار کو کما حقہ ملحوظ رکھا ہے۔ ان کے پاس نہ تو کھلنڈرپن ہے۔ نہ کرتب بازی، نہ ٹیڈی ازم، بے تکے پن اور اہمال سے انہوں نے اپنی غزل کے دامن کو بچائے رکھا ہے۔ ان کے اشعار نہایت سلجھے ہوئے، دلکش اور معنویت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ میں یہاں ایسے اشعار بھی دیتا چلوں۔

بس ایک ریت کی مٹھی ہوں اس کے ہاتھوں میں
کبھی سمیٹے کبھی مجھ کو منتشر کردے

ساحلوں کی ریت پر کوئی مجھے لکھتا رہا
اور دریاؤں کے دھارے بے نشاں کرتے رہے

سرابوں کا سفر ہے زندگانی
بہت اس سے امیدیں جوڑنا مت

پڑھنا علی الصبح تیری یاد کی کتاب
سونے سے قبل شب کو تیرا نام سوچنا

کشتیاں کاغذ کی اب کہنے لگی خود کو جہاز
آنکھوں کی نالیاں بھی اب سمندر ہوگئیں

یہ الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں اور نہ جدیدیت کے نام پر تماشہ ہے بلکہ یہ تو سچی جدیدیت کے اچھے اشعار ہیں۔ حسن و عشق، گل و بلبل اور لب و رخسار کی باتیں حضرت آدم سے ابنِ دم تک ہوتی آئی ہیں اور ہوتی رہیں گی غزل تو اس کے لیے بدنام بھی ہے۔ لیکن زمانے کے تقاضوں اور لہجہ و اسلوب کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کی جائے تو اس میں دلآویزی اور دلنوازی آہی جاتی ہے۔ شباب للت کے ہاں بھی الفاظ کی کمی نہیں۔ انہوں نے حسنِ محبوب کا ذکر مختلف پیرایوں میں کیا ہے۔ اپنے محبوب کا بھی اوروں کا بھی۔ بڑے جھجکتے جھومتے انداز میں کہ فضا مخمور ہوجاتی ہے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ پوس کی برفیلی ہوا ماگھ کی بارش
بن تیرے تو کاٹے یہ مہینے نہیں جاتے

غزلخواں ہے تیری آنکھوں کا کاجل
تیری بانہوں کا صندل بولتا ہے

اک وقت تھا کہ ہم بھی مہکتے گلاب تھے
برسوں تمہارے دل کے جو گلدان میں رہے

پھول، شبنم، چاند، پیمانہ، غزل
ذکر تیرا کتنے عنوانوں سے ہے

میں تیرا پیکر سمجھ کر جھک گیا اس کی طرف
کس قدر دھوکا دیا شاخِ گلِ تر نے مجھے

اب تو کوئی یاد تک دستک نہیں دیتی یہاں
دل کا دروازہ کریں تو کس کی خاطر وا کریں

جان دیتے ہیں وہ کچے گھڑے پر تیر کر
قول سے ہٹتی نہیں پیچھے محبت والیاں

منتظر ہیں چناب کے ساحل
سوہنی لوٹ کر نہیں آئی

اوراب ایسے کچھ اشعار، جو میں اوپر کہیں درج نہیں کر سکا لیکن مجھے پسند ہیں۔ یقین ہے آپ بھی انہیں پسند کریں گے۔

یوں عمر کی ڈھلان پہ ہم تھک کے چور ہیں
جیسے کسان کھیت سے گھر لوٹتے ہوئے

مجھ کو سچی بات ہی کہہ کر یہ اندازہ ہوا
آج سچی بات کہنا کس قدر دشوار ہے

جئیں گے جب تلک ہم خواہشیں پیچھا نہ چھوڑیں گی
تمنا کا شباب آتش کدہ ٹھنڈا نہیں ہوگا

دیوتائی صفات دے کہ نہ دے
ہاں بنادے بس آدمی مجھ کو

یہ اپنی پھوٹ ہی تاریخ بن گئی اپنی
تباہ اپنا ہی گھر بار کرتے رہے

بند آدمی پر ہے سب فرار کی راہیں
خواہشوں کے زنداں سے وہ نکل نہ پائے گا

نظم اور دیگر اصنافِ سخن پر اپنی گفتگو کو کسی اور وقت کے لیے رکھتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ شباب للت غزل گو کی حیثیت سے ایک کامیاب اور اچھے شاعر ہیں۔ ان کی غزلیں، قدیم اور جدید کی اصطلاحوں سے ماوراء اپنے طور پر عمدہ اور وقیع ہیں۔ بالخصوص ہم عصروں میں شباب للت کا قد خاصا اونچا ہے اور ان کی غزل قابلِ توجہ!

☆

○

شاعرِ خوش کلام وخوش گلو جناب شباب للت سے غائبانہ تعارف تو ایک مدت سے تھا۔ رسائل وجرائد میں ان کا کلام نظر سے گذرتا رہتا تھا، میرے عزیز دوست جناب بھگوان داس شعلہ (جو دھرم شالہ سے پٹیالہ تشریف لائے تھے) اکثر ان کی تعریف بطور ایک ابھرتے ہوئے ۔۔۔ہونہار اور باشعور فنکار کے کیا کرتے تھے۔ ذاتی طور پر ملاقات کا موقعہ غالباً چودہ پندرہ برس پہلے چنڈی گڑھ کی بزمِ ادب کی ایک ماہانہ نشست میں ملا تھا۔ ان کی سنجیدہ اور پُر وقار شخصیت، خلوص اور تپاک، کلاسیکل رچاؤ اور تازگیِ فکر سے مملو سلجھے ہوئے کلام اور پاٹ دار آواز میں گمبھیر ترنم نے بیحد متاثر کیا۔

بعد ازاں ادبی نشستوں، مشاعروں اور ریڈیو کی وساطت سے انھیں سننے کے بے شمار مواقع میسّر آئے اور ہر موقع پر میں نے محسوس کیا کہ قدرت کی طرف سے شباب صاحب کو ایک ارتقاء پذیر ذہن عطا ہوا ہے جو ان کے فکر ونظر کو بتدریج وسیع ورفیع تر کرتا جا رہا ہے۔

گذشتہ چند برسوں میں شائع ہونے والے ان کے شعری مجموعوں سے بھی بدلتی ہوئی ادبی اقدار سے ان کی اثر پذیری اور جدید رجحانات ومیلانات سے ہم آہنگی کا پتہ چلتا ہے۔ چونکہ یہ اثر پذیری شعوری کوشش یا کورانہ تقلید کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ ان کی شاعرانہ بصیرت اور افتادِ طبع کے فطری عمل کا کارنامہ ہے، اس لئے ان کا کلام، عروض فن اور زبان کے اعتبار سے اس مجرمانہ غفلت کا شکار نہیں ہوا جو فیشن اور فارمولا کے طور پر عصری اقدار کو اپنانے والے اکثر سہل انگار اور جدیدیت کے انتہا پسند علمبردار برتتے ہیں۔ چند برس ہوئے ہشیار پور کے ایک مشاعرے میں شباب صاحب نے ایک غزل پڑھی جس کی ردیف ''چھتریاں'' تھی۔ اس خیال انگیز غزل کے یہ شعر میرے ذہن میں آج تک محفوظ ہیں۔

غم کے صحرا کی تپش خود جھیلنی ہوگی ہمیں
بے وفا احباب ہیں سائے سے خالی چھتریاں
آج خود ہی بے تحفظ ہیں زمانے کے خدا
وقت وہ ہے خود ہیں سائے کی سوالی چھتریاں
یہ حسیں چہرے، یہ گورے سانولے چکنے بدن
یہ غموں کی دھوپ میں کام آنے والی چھتریاں
اپنی منزل تک ابھی تو لاکھ طوفاں آئیں گے
تم بدل ڈالو ابھی سے ڈھیلی ڈھالی چھتریاں

نوبہار صابر (پٹیالہ، بھارت)

شباب للت کی منفرد تحقیق

کرشن کمار طور
(دہلی، بھارت)

اردو ادب میں پی ایچ ڈی کی غرض سے کتنے ہی ایسے مقالے لکھے جارہے ہیں۔جن میں تحفظِ ترسیل اور غیر شناسی کا عنصر شخصی اور اجتماعی سطحوں پر ذمہ داری کے احساس کی بجائے انتشار ذات اور خود پرستی کا مظہر ہوتا ہے۔ان مقالوں میں افکار ونظریات کی تشریح جو کہ بذات خود ایک رمزِ خاص کے مترادف ہے کی بجائے سطحی نظریات مرکزیت سے آشکار ہوتی ہے۔لیکن ڈاکٹر شباب للت نے زیرِ تبصرہ مقالہ جو کہ انہوں نے اپنے استاد حضرت علامہ منور لکھنوی مرحوم پر رقم کیا ہے یہ صورتِ حال ان کے علمی اور ادبی رجحان پر دلالت کرتی ہے۔

علامہ منور لکھنوی ہمہ جہت شخصیت اور شعری شعور کے مالک تھے جہاں وہ کلاسیکل شاعری کے ممتاز غزل گو تھے رباعی جیسی ہرجائی اور جان لیوا صنف پر بھی یکساں قادر تھے۔انہوں نے نہ صرف فارسی میں شعر کہے بلکہ ہندی، سنسکرت، جرمن، انگریزی وغیرہ زبانوں کے کئی شاہکار تصانیف نظم ونثر کے تراجم کیے اور بچوں کے لیے شعری اور نثری ادب بھی تخلیق کیا۔ڈاکٹر شباب للت نے اپنے فاضلانہ مقالہ میں حضرت علامہ کے شخصی اور شعری دور کی ہر جہت سے انفرادی طور پر بھی اور مجموعی طور پر بھی عالمانہ بحث کی ہے اور علامہ کی ذات اور فن کے ان مخفی گوشوں پر جو کہ عام قاری اور بعض اوقات سکہ بند اور درسی نقادوں کی نظروں سے سربستہ رہے ہیں بہ اتمام وکمال روشنی ڈالی ہے۔

تھیسس کا بابِ اول و دوئم علامہ کی سوانح حیات اور ان کے عصری حالات اور اردو سے بحث کرتا ہے۔یہ ابواب اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ ڈاکٹر شباب للت نے علامہ منور کے صاحب زادے کلدیب کمار سکسینہ کے تعاون سے انہیں مستند اور معتبر بنایا ہے اور علامہ پر آئندہ کام کرنے والوں کے لیے نہ صرف راہ ہموار کی ہے بلکہ ان کے لیے وافر اشارے بھی فراہم کردیے ہیں۔منوّ لکھنوی مرحوم نہ صرف خود استاد تھے بلکہ بڑے باپ کے بیٹے تھے۔ان کے والد ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی کا دنیائے ادب میں طوطی بولتا تھا۔موصوف نے بیک قافیہ رامائن نظم کرکے ادبی حلقوں سے خصوصی خراجِ تحسین پایا تھا۔ظاہر ہے کہ جس شخص کو شاعری وراثت میں نصیب ہوئی ہو گھر کی تمام فضا شعروں کی مہک سے معطر ہو، اس کے فطری شاعر ہونے میں کسے انکار ہوسکتا ہے۔اسی شعری ماحول نے منور لکھنوی کی کشت سخن کی آبیاری کی جس کا بیج پہلے سے ہی موجود تھا اور انہوں نے اس ننھے پودے کو ایک چھتنار درخت میں تبدیل کردیا۔

مقالہ کا باب سوئم اجتماعی خصوصیت اور تناظر کا حامل ہے کیوں کہ ڈاکٹر شباب للت نے کتاب کے اسی حصے میں علامہ منور کی شعری قادرالکلامی پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ان کی نظم، غزل اور باعی وغیرہ کو ذیلی ابواب کے ذریعے ازسرِنو یافت کیا ہے۔قرآن مجید میں مرقوم ہے کہ لازماً سب انسان ایک ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ علامہ منور نے اس قولِ برحق کی روشنی میں رواداری اور انسان دوستی کو خدا پرستی پر محمول کیا ہے اور اسے اپنی بیشتر نظموں کی اساس بنایا ہے۔لیکن علامہ منور کا اصلی جوہر ان کی رباعیوں میں آشکار ہوتا ہے جو نہ صرف خمریات اور جمالیاتی عنصر کی عکاسی ہے بلکہ مشاہدۂ حق اور فلسفیانہ مسائل کو بھی انہوں نے اپنی رباعیوں کا موضوع بنایا ہے۔وہ فوق البشر کے نظریہ کی بجائے افضل البشر اور خیر البشر کے نظریہ کے مبلغ ہیں اور اروند گھوش کے فلسفہ کی مانند برتر دماغ ہی برتر انسان میں بلکہ برتر قلب بھی برتر انسان کے مصداق ہے ان کے کلام کا ایک اہم اور غالب جزو ہے۔

بابِ چہارم علامہ منور لکھنوی کے فارسی کلام سے منعکس ہے حالانکہ ان کی فارسی غزلوں کا رنگ وآہنگ روایتی ہی سہی کہ یہ علامہ کے دور کی ایک خصوصیت تھی پھر بھی وہ اپنے ہی ذہنی اور نظریاتی اجتہاد کے باعث اپنی فارسی شاعری میں بھی اپنے مشاہدات اور تجربات کی تازہ ہوا کو قدیمی حبس زدہ فضا میں در آنے دیتے ہیں۔

بابِ پنجم علامہ منور کے تراجم جن میں شریمد بھاگوت گیتا کا ترجمہ، قرآن پاک کی سورتوں کے تراجم، انجیل مقدس کے کئی ابواب کا ترجمہ جے دیو کی گیت گووند، کالی داس کی کمار سمبھو اور شکنتلا، بھوبھولی کی مالتی مادھو، گوتم بدھ کی تعلیمات پر مشتمل ہے دھمید رٹیگور کی گیتا نجلی، وغیرہ پر مشتمل ہے۔علامہ منور لکھنوی نے ان تراجم میں بھی زبان وادب پر اپنے کمال کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ان ترجموں کے لیے جس سخن آفرینی کی خاص طور پر ضرورت تھی وہ بصد جلوۂ رنگ علامہ منور لکھنوی کے ہاں موجود ہے۔انہوں نے ترجمہ کرتے وقت جوش سے نہیں بلکہ ہوش سے کام لیا ہے اور جذبہ پر عقل کی ترجیحی عمل کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

آخری باب میں ڈاکٹر شباب للت نے علامہ منور لکھنوی کا اردو ادب میں مقام متعین کرنے کی سعی کی ہے۔سوامی دویکانند نے کہا تھا کہ برہم کو ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ شے میں موجود ہے یہ کتاب لکھ کر شباب للت نے اپنے استاد منور لکھنوی میں اپنے برہم کا تشخص دریافت کرلیا ہے۔شاید بہت سوں کو یہ بات باعثِ استعجاب وحیرت لگے کہ علامہ منور لکھنوی قدیم شاعری کے دلدار ہوتے ہوئے بھی نئی شاعری کی آبرو ثابت ہوئے۔ڈاکٹر شباب للت کا یہ مقالہ ایں ہمہ اوست نہیں بلکہ آں ہمہ وقت اور انتشار کی بجائے ارتکاز کی ایک نادر مثال ہے جس کے لیے میں ان کی تحسین کرتا ہوں۔یہ کتاب تھیسوں کے ڈھیر میں ایک انفرادی مثالیت رکھتی ہے۔

''کرشمہ دامنِ دل''

ڈاکٹر شباب بانو سرتاج

(بھارت)

ڈاکٹر شباب للت معروف ومقبول خوش فکر اور خوش گلو شاعر ہیں۔ انہوں نے شاعری کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ آزاد اور باپند نظمیں لکھی ہیں۔ تو غزلیں' قطعات اور دوہے بھی لکھے ہیں۔ ان کے شعری سفر کا آغاز ۱۹۴۱ء سے ہوا اور آج بھی وہ اسی جوش وخروش کے ساتھ منزل کی طرف گامزن ہیں۔ اس دوران ان کے کم وبیش دس شعری مجموعے شائع ہوکر مقبول ہوئے۔ شباب للت کے شعری سفر اور ان کی نگارشات کا تعارف پروفیسر ظفر احمد نظامی کچھ یوں کراتے ہیں:

''(شباب کے) تخلیقی جذبات بیدار ہوئے، کشتیِ شعر پر سوار ہوئے، مجموعوں کے ڈھیر لگا دیے۔ شیلف پہ شیلف سجا دیے، مضراب زندگی پر گیت گایا، صحرا کی پیاس کو بجھایا، برف زاروں کی آنچ سہی، ہمیشہ سچی بات کہی۔ سمندر کو پیاسا پایا، اجنبی ہوا کو اپنایا، قلم کو پتوار میں ڈھالا، تاریخ کے صفحات کو کھنگالا، پروائی میں اڑان بھری، پاشاتوں میں جان بھری، منزل منزل جاگتے رہے، تلاش میں بھاگتے رہے، زرد موسموں کا درد پہچانا، کوہساروں کا درد جانا، گرو گیتا کا پاٹھ پڑھایا، وجود وعدمِ وجود کو فلسفہ بنایا۔ منور لکھنوی کو موضوع بنایا، چاند کلوری کو متعارف کرایا، اب بھی ان کا قلم رواں ہے۔ عالمِ حرف ولفظ میں جواں ہے۔

شباب للت کی شاعری میں ادب برائے ادب زندگی کا جواز ہے تو مقصدیت اور افادیت کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔ اپنی مٹی سے وابستگی کا اظہار ہے تو اعلیٰ انسانی قدروں کے تئیں لگاؤ بھی ہے۔ وہ معاشرے کے عام آدمی کے احساسات وجذبات کی ترجمانی کرتے ہیں اور خوش آئند مستقبل کی آرزو کرتے ہیں۔ وہ عصری تقاضوں اور مسائل سے پوری طرح باخبر رہ کر نئے احساسات و تجربات کو اپنی تخلیقات میں جگہ دیتے ہیں... یعنی بقول نو بہار صابر:

شباب صاحب نے نہایت نظم وضبط اور غور وفکر سے شاعری کی ہے... روایت سے خوشگوار وابستگی، عصری حیثیت کا عرفان، متوازن لب و لہجہ، ہیئت وموضوعات کا تنوع، ڈکشن کے دائرے میں لچک دار توسیع، دیومالائی تلمیحوں اور تلازموں کا برجستہ استعمال، علامتوں، استعاروں اور تشبیہوں کی طرفہ کاری سے سحر انگیز پیکر تراشی یہ تمام محاسن اور خصوصیات ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں۔ شباب للت کا شعری سرمایہ ایک ایسا دل پذیر، دیدہ زیب گلدستہ ہے جس میں قسم قسم کے پھول شانِ بہار دکھا رہے ہیں۔''

ان تمام پھولوں میں سب سے منفرد خوش رنگ اور حسین پھول ہے شباب للت کا اپنی شاعری میں ہندو دیومالائی عناصر کا استعمال۔ ان کی شاعری کے اس پہلو کو سمجھنے سے پہلے دیومالائی عناصر کے معنی اور اہمیت پر نظر ڈالنا نامناسب نہ ہوگا۔

دیومالائی عناصر کے یا مائی تھالوجی کے معنی میں کچھ یوں دیے گئے ہیں: The concise Oxford Dictionary "My thology is a body od muths ie. traditional narrative usually involiving super natural or fancied pessons etc and embidying popular ideas on natural or social phenomena. گویا دویو مالا یا علم الاساطیر کے تحت مافوق الفطرت، تخیلات اور مثالی شخصیات یا واقعات کا بیان کیا جاتا ہے۔

The random House Dictionary of English کے مطابق متھ کے معنی کچھ یوں دیے گئے ہیں:

"Myth is a traditional or legarndary story usually concerning some super-human being or some alleged person or event with or without a determinable basis of facts or a natural explanation especially a traditional or legendary story that is concerned with dieties or demi-Goods and the creation or the world Nith its nihabitants."

دیوی، دیوتاؤں کے کارناموں سے متعلق کہانیاں یا ان شخصیتوں سے متعلق جو زمین پر دیوی و دیوتاؤں کی نمائندگی کرتی ہیں، ان کی کہانیاں دیومالائی یا اساطیری کہانیاں کہلاتی ہیں۔ نسیم حیدر رضوی اساطیری اسلوب پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اساطیر جسے دیومالا بھی کہا جاتا ہے کے مطالعے سے بنیادی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ تمام اساطیر بیانیہ ہوتی ہیں۔ ان کے قصوں میں

کہیں منطقی ربط نہیں ہوتا۔ان میں غالب عوامل ماورائے مادہ ہوتے ہیں اوران کا سراعمل انسان کی قدرت اور تدبیر کے دائرے سے باہر ہوتا ہے۔اس لیے ظلمت کے دور کا انسان جو کچھ عملاً نہیں کر پاتا اُسے تمثیل وتمثال کے طور پر پیش کر دیتا ہے۔ان قصوں میں کائنات کے نظامِ حیات اور معاشرے کے نظم وآہنگ میں کچھ ایسی ہستیوں کی دخل اندازی ہوتی ہے جو مافوق الفطرت صفات اور صلاحیتوں کی تلاش پہلے اپنی ذات میں کرتا ہے اور پھر اپنے گردوپیش پر نظر ڈالتا ہے۔اس کے مشاہدے اور مطالعے میں اسے جو کچھ بھی صفات کے طور پر نظر آتا ہے اسے تمثیلی انداز میں نقطۂ عروج پر پہونچا دیتا ہے اس طرح ہر ایک دیومالا علامتی انداز میں زندگی کے بہت سے حقائق وتجربات کو پیش کر دیتی ہے یہ اسلوب قدیم فنِ داستان گوئی کا عام اسلوب تھا جو آج تک مختلف پیرائے میں ادب وشاعری میں برتا جاتا ہے۔''

اردو شاعری میں ہندو دیومالا کا دو طرح سے استعمال ہوا ہے ... ایک طرف تو اُپنشد، پُران، وید، رامائن، مہابھارت وغیرہ مذہبی کتابوں سے راست دیوی دیتاؤں کے قصے لے لیے گئے ہیں یا پھر شعرا نے دیوی دیوتاؤں کی تمثیلات وتلمیحات اور مذہبی عقائد کے علائم اور استعاروں کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ یہ مذہبی کتابیں ہندوستانی تہذیب کا اہم حصہ ہیں۔اس لیے ان دیومالائی عناصر کا استعمال ہندو مسلم سبھی شعراء نے کیا ہے۔ابوالفیض سحرؔ اردو زبان کی سیکولر کردار کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اردو زبان وادب ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب، یہاں کے مختلف ومتنوع جہانِ رنگ وبو کی ندرتوں اور رکاہتوں کی حقیقی نمائندہ ہے۔اس لیے اس کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر سے لے کر آج کے جدید شاعر تک کے پاس بھی ہندوستان کی ہمہ گیر زندگی کے مذہب وثقافت کے دھاروں، تاریخ وتہذیب کی لہروں، وطنی وقومی احساسات وجذبات کے جیتے جاگتے مرقعے ملتے ہیں جو ہماری ہند ایرانی مشترکہ قومی تہذیب وتمدن اور شعروادب کا قابل فخر سرمایہ ہیں''۔

شباب للت کی شاعری کا فلسفہ، روحانیت، ہندوستانی فضا اور ہندوستان مزاج ہمارے اسی قومی سرمائے کا حصہ ہیں۔آزاد گلاٹی کہتے ہیں:

''روحانیت، شباب للت کے نزدیک منفی قوتوں سے نبرد آزماں ہونے اور زندگی کے صحیح مقصد ومنہاج کے تعین اور اُس کے حصول کا ایک وسیلہ ہے۔انہوں نے خاص طور پر رامائن اور مہابھارت کی تلمیحات سے فنکارانہ استفادہ کیا ہے۔اس طرح انہوں نے اپنے اشعار میں وہ ہندوستانی فضا تخلیق کی ہے جس سے ان کے کلام میں تازگی اور کشادگی کا احساس ہوتا ہے اور اظہار کے ایسے وسیلے بھی دریافت کیے ہیں۔ جو مخصوص ہندوستانی مزاج کی شناخت اور بازیافت کے لیے ضروری ہیں۔''

آر پی شرما ہرش شباب للت کی شاعری کے اسی پہلو کی نسبت فرماتے ہیں:

ڈاکٹر شباب للت کی شاعری کا سب سے نمایاں پہلو ہے اپنی غزلوں میں دیومالائی علائم وتلمیحات کا برجستہ استعمال، جو ان کی شاعری کو اپنی سنسکرتی اور اپنی زمین سے جوڑتا ہے۔''

شبابؔ للت کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور تقریباً سبھی لکھنے والوں نے شباب للت کی شاعری کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔اڑان مجموعے کے دیباچے میں نوبہار صابرؔ رقم طراز ہیں:

شبابؔ کی غزلوں میں جو چیز سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہے وہ ہے شباب صاحب کا اپنے تہذیبی، تاریخی اور اساطیری ورثے سے اکتسابِ فیض۔اپنے اشعار کی گیرائی اور گہرائی میں اضافہ کرنے کے لیے شبابؔ صاحب نے ہندو دیومالائی علائم وتلمیحات کا اس کثرت سے استعمال کیا ہے کہ

ذفرق تا بہ قدم ہر کُجا می بینم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ اینجاست''

اس مقالے کو رامائن سے اخذ کیے ہوئے حوالوں ہی تک محدود رکھا گیا ہے۔ ہر چند کہ بہت سی مثالیں رہ جائیں گی لیکن اختصار کے مدّنظر یہ ضروری ہے۔

رامائن، ہندوستانی تہذیب وادب کا اہم ترین ورثہ ہے زمانۂ قدیم سے آج تک اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے بلکہ موجودہ دور میں اس کی افادیت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔رامائن ایک ایسی تخلیق ہے جس میں زندگی کے ہر گوشے پر نظر ڈالی گئی ہے۔زندگی کا ہر پہلو اجاگر کیا گیا ہے۔زندگی کی ہر خوشی، ہر غم، ہر عمل کا ذکر ہوا ہے۔ایس نارائن، راؤ رامائن کی اہمت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

رامائن ایک اخلاقی اور مذہبی مقالہ ہے۔ایک کارآمد رہبر بھی ہے جو ایک خوشگوار زندگی گذارنے کا گر سکھلاتا ہے۔رامائن کے متن میں ریاست کے نظم ونسق اور سیاست کے رموز ونکات چھپے ہوئے ہیں۔ رامائن میں ہمیں حاکم، رعایا، والدین واولاد، بھائی بہن، بیوی، دوست، خادم، بزرگ، استاد وشاگرد غرضکہ ہر فرد کے فرائض پر سیر حاصل بحث ملتی ہے۔جس کی حیثیت آفاقی ہے۔رامائن ایک بہترین ادبی شہ پارہ ہے، اس میں زبان کی سادگی اور خوبصورتی بدرجۂ اتم موجود ہے۔جس طریقے سے رامائن کے مختلف کردار اپنی خوشی اور غم کا اظہار کرتے ہیں وہ اتنا فطری، قدرتی اور حقیقت سے قریب ترین ہے کہ اس میں ہندوستانیوں کی روزمرّہ کی بہترین عکاسی ملتی ہے''۔

رامائن کے مرکزی کردار رام ہیں۔ وہ ایک مثالی شخصیت ہیں۔

شباب للت کہتے ہیں:

وہ سیتا ناتھ خود ہی برہم ہیں لوگو
یہ سچ ہے شکل انسانی سی لگتی ہے

شری رام کے جملہ اصناف کا بیان ایس۔ نارائن۔ راؤ نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

رامائن شخصی اوصاف و کردار پر ایک شاندار مقالہ ہے۔ فیاضی، دریادلی، مہربانی، عفو، حسد و لالچ سے گریز، غصہ پر قابو، سچائی، ہمت، دلیری، بہادری، خوش بیانی، انس، اقتدار یا دولت پر گھمنڈ نہ کرنا، کسی کو حقیر نہ سمجھنا، ایفائے عہد، یہ سب ایسے اوصاف ہیں جن کا ہر انسان کو حامل ہونا چاہیے۔ شری رام ان سب اوصاف کے پیکر تھے۔

شباب اسی رام کے عقیدت مند ہیں۔ رام کی عظمت کا ان کے معجزات کا انہوں نے جابجا ذکر کیا ہے۔ گوتم رشی نے اپنی پتنی اہلیا کو شاپ دے کر پتھر بنا دیا تھا اور کہا تھا کہ رام کے چرنوں کے لمس ہی سے وہ شاپ مُکت ہوسکیں گی۔ بن باسی کے دوران اہلیا شراپ سے آزاد ہوتی ہیں اور پھر انسانی شکل میں آجاتی ہیں۔ شباب للت کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

چٹان کو چھوا تو آدمی بنا دیا
وہ معجزے لیے پھرے ہیں اپنے پاؤں میں

بنیں انسان تیرے لمسِ پا سے
چٹانیں تھیں جو تیری رہ گزر میں

ہم تھے سنگ، اُس نے جب چھوا
پیکرِ بشر میں ڈھل گئے

لمسِ پا ملے اُس کا تو یہ دیکھ لے دنیا
اَن گنت اہلیائیں ہیں اسیر پتھر میں
وہ سنگ ہوں جو بشر بن سکا نہ صدیوں تک
مِری حیات پہ اک بددعا کا سایہ ہے

رام کی ذات سے اور کئی معجزے منسوب ہیں۔ رام جب لنکا جانے کا مقصد کرتے ہیں تو سمندر راہ میں حائل ہوجاتا ہے۔ رام پل کی تعمیر کا حکم دیتے ہیں۔ بڑے بڑے پتھروں پر رام کا نام لکھ کر سمندر میں ڈالا جاتا ہے۔ پتھر ڈوبتے نہیں، تیرنے لگتا ہے اور پل تعمیر ہوجاتا ہے۔ شباب للت کا ایک شعر ہے:

شباب اس کی نوازش سے نا امید نہ ہو
جو پتھروں کو بھی تیرا سکے سمندر میں

رام کی دلیری، عزم اور ہمت سمندر پار کرکے روان کو شکست سے دوچار کرتی ہے۔ رام فتح یاب ہوکر سیتا کو لے کر اجودھیا لوٹ جاتے ہیں۔ شباب للت رام کے اسی آدرش کو ماننے کے لیے کہتے ہیں:

منتوں سے یہ دنیا راستہ نہیں دے گی
رام بن کے بھڑکا دو آگ تم سمندر میں

دشرتھ اجودھیا کے راجہ ہیں۔ وہ بڑے بیٹے رام کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ وہ اپنے اس فیصلہ میں بہت جلد بازی کرتے ہیں۔ دوسری رانی کیکئی کوئی رکاوٹ نہ ڈالے اس خوف سے بھرت کو ننھیال بھیج کر چوبیس گھنٹوں کے اندر رام کی تخت نشینی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ مگر وہ تقدیر کے لکھے کو بھول جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے مقصد میں ناکام رہتے ہیں بلکہ انہیں رام کو چودہ برس کا بن باس بھی دینا پڑتا ہے۔ وہ رام کے غم میں رو رو کر جان دیے دیتے ہیں:

آؤ بن باسی مرے مَن کی اجودھیا ہے اداس
نین بہے ہیں مسلسل مرے سرجو کی طرح

مہارانی کیکئی کی خودغرضی اور غلط خواہش نہ صرف اُسے بیٹے کی بلکہ عوام کی نظروں سے بھی گرا دیتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے بھرت کے لیے راج گدی اور رام کے لیے چودہ برس بن باس مانگ کر شوہر کی موت کا باعث بنتی ہے۔ شباب للت نے اپنے ایک شعر میں اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ رام نے اپنی فرمانبرداری سے کیکئی کا غرور خاک میں ملا دیا:

اک انتقام ہے خود صبر و ضبط رگھوبر کا
ملا ہے خاک میں کس طرح کیکئی کا غرور

سیتا ناز و نعم میں پلی تھی۔ راجہ جنک نے رام سے اس کی شادی کے وقت کہا تھا کہ ''آج سے مذہب اور سچائی کے راستے پر رام کے ساتھ چلنا، شوہر کے عقائد اور خیالات کی تائید کرنا، خوشی اور غم ایک دوسرے کا ساتھ دینا''۔ سیتا نے آپسی محبت، وفاداری اور قربانی کی مثال قائم کی، رام بن باس کو گئے تو محلوں کا عیش و آرام چھوڑ کر ان کا ساتھ دیا، عام عورت کی طرح رام کو غلط فیصلہ ماننے سے انکار کرنے، خاموشی سے حق چھینا جاتا دیکھنے پر احتجاج کرنے یا جبراً تخت و تاج چھین لینے پر مجبور نہیں کیا۔ شباب للت کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

یہ زندگی ہے کہ سیتا ہے اک فریب زدہ
بھروسا کرلیا اُس نے بھی ایک راون پر

چلو کہ ٹوٹ پڑیں اہلِ زر کی لنکا پر
کہ انقلاب کی سیتا اسی میں ہے محصور

پاجاؤ گے سکون کی سیتا کا تم سراغ
تم بھی اگر انا کا سمندر پھلانگ لو

بن باس میں جب راون سیتا کو اغوا کرلے جاتا ہے تو بھگوان رام ایک عام آدمی کی طرح ہر ایک سے سیتا کا پتہ پوچھتے پھرتے ہیں:

سیتا کی جدائی میں کیا حال تھا رگھوبر کا

انسان ہیں جنئیں کیسے ہم تم سے جدا ہو کر

رام سیتا کو راون کی قید سے چھڑا کر اجودھیا لوٹتے ہیں۔ بن باس کا عرصہ بھی پورا ہو چکا ہے مگر سیتا کی مصیبت کے دن ختم نہیں ہوتے۔ پرجا ان کی پاکدامی پر سوالیہ نشان لگا دیتی ہے:

رسوائی کا غم کیا کیجیے جگ نے کسی کو بخشا ہے
سیتا جیسی ستی پہ بھی تہمت ہی لگائی لوگوں نے

مریادہ پُرشوتم رام پرجا کی آواز پر مجبور ہو جاتے ہیں اور سیتا اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر نہیں پاتیں، رام انہیں تیاگ دیتے ہیں۔ سیتا ادھر رشی کے آشرم میں زندگی گذارتی ہیں ادھر رام ان کی جدائی میں کانٹوں پو زندگی بسر کرتے ہیں:

لگے ہے رام کو سکھ سیج کا ہر پھول انگارہ
کہ ہیں سیتا کی قسمت میں ابھی بن باس کے کانٹے

عصری حیثیت کے تقاضوں نے بن باس کے واقعے کو شباب للت سے مختلف اشعار میں کرایا ہے:

کوئی دن میں یہ رشتوں کی ایودھیا چھوڑنی ہوگی
نظر آنے لگے خوابوں میں پھر بن باس کے کانٹے

اجودھیا کے گلستانوں میں لوٹے مدتیں گذریں
مگر چبھتے ہیں تلوؤں میں ابھی بن باس کے کانٹے

کٹے جو روح کا بن باس تو وہ شخص ملے
جو دل پاس رہے اور آنکھ سے رہے دور

رامائن میں ایک باپ نے مجبور ہو کر اپنے لختِ جگر کو بن باس دیا تھا۔ لیکن دورِ حاضر میں کتنے ایسے بیٹے ہیں جو اپنے بوڑھے باپ کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔ دربدر ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ شباب للت کے یہ اشعار تلخ حقیقت کو بیان کرتے ہیں:

نئی صدی میں یہ ٹھہرا ہے فرض دشرتھ کا
کہ اپنی زندگی بن باس میں بسر کر دے
بن باس دو اب گھر کے بڑے بوڑھوں کو
اب گھر میں کوئی چیز پرانی نہ رہے

بن باس کے دوران رام سیتا اور لکشمن جنگل میں کٹی بنا کر رہتے ہیں۔ رام اور لکشمن میں سے جب کوئی شکار کے لیے جاتا ہے تو دوسرا سیتا کی حفاظت کرتا ہے۔ کے راجہ کی بہن شورپ نکھا رام اور لکشمن کو دیکھتی ہے۔ شورپ نکھا حسد اور شہوت پرستی کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ جہاں وہ سیتا کی خوبصورتی سے حسد کرتی ہے وہاں رام و لکشمن پر فدا ہو کر محبت کی درخواست کرتی ہے۔ دونوں انکار کر دیتے ہیں۔ لکشمن تو مشتعل ہو کر اس کی ناک ہی کاٹ ڈالتے ہیں۔ شباب للت ہوس کی ماری شورپ نکھاؤں سے عام آدمی کو بچنے کی تلقین کرتے ہیں:

گلا نہ چھوڑے گی یہ واسنا کی شورپ نکھا
ہزار ہم دلِ وحشی کو رام کر لیں گے

میں کوئی رام نہ تھا، عام سا بشر تھا مگر
ہوس کی شورپ نکھا تھی میرے تعاقب میں

شورپ نکھا تکلیف سے بلبلاتی اور اپنی بے عزتی سے جلتی اپنے بھائی راون کے پاس پہنچتی ہے اور اسے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اکساتی ہے۔ وہ اپنی شکایت میں مزید اثر پیدا کرنے کے لیے سیتا کی بے پناہ خوبصورتی کا ذکر کر کے راون کے دل میں سیتا کی چاہ پیدا کر دیتی ہے۔ راون نفس پرست ہے.....مغرور ہے۔ اس کی اسی شہوت پرستی کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑا۔ سونے کی لنکا راکھ ہو گئی۔ خود بھی جان سے گیا۔ شباب للت نے کئی موقعوں پر اس واقعے کو نظم کیا ہے:

ایک ہی راون تھا دل ہرگز نہ آیا راہ پر
واسنا کے پھیرے میں سونے کی لنکا جل گئی

غضب کی آگ لگی ہے بدن کی لنکا میں
یہ رنگ لایا ہے راون کی واسنا کا فتور
ظلم کی لنکا بچے گی کب تک؟ جلد کوئی
آن ملے گا راون کا چھٹ بھیارے!

راون کوئی ہر لے گیا انصاف کی سیتا
کیا پھر اسی افسانے کو دہرائے گا جنگل؟

راون سیتا کو اغوا کرنے کے لیے سازش کرتا ہے۔ مارِیچ نامی راکشس کو سونے کے ہرن کی شکل میں سیتا کے سامنے گذرنے کو کہتا ہے۔ سیتا جب سونے کے اس طلسمی ہرن کو دیکھتی ہے ہیں تو اپنی نسوانی فطرت کی تحت فوراً اسے حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے اصرار سے مجبور ہو کر رام ہرن کے پیچھے جاتے ہیں اور اس پر تیر چلاتے ہیں۔ فریبی مارِیچ تیر کھا کر انسانی آواز میں لکشمن کو مدد کے لیے پکارتا ہے۔ شباب للت اس واقعے کو اس طرح نظم کرتے ہیں:

چرانے کو انصاف کی جانکی
وہ سونے کا مایا ہرن آ گیا
نفسِ انسان ہے کہ مایا کا ہرن
ان گنت روپ یہی راکشس کے
واسنا کا سنہری طلسمی ہرن
دے گیا پاؤں کے سرخ چھالے مجھے
لاکھ دوڑو گے نہ ہاتھ آئے گا مایا کا ہرن

یوں ہی آنکھوں کو جلن پاؤں کے چھالے دیگا
لینا تھا اس سے خاص کوئی کام رام نے
مرنے سے پہلی بار جو ماریچ بچ گیا
پران دوں گا رام کے چرنوں میں جا کر
سُوَرن مِرگ بن کر نشاچر سوچتا ہے

ماریچ جب رام کی آواز میں لکشمن کو مدد کے لیے پکارتا ہے تو سیتا لکشمن کو رام کی مدد کے لیے جانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ لکشمن پر سیتا کی حفاظت کی ذمہ داری ہے اس لیے جانے سے پہلے وہ کٹیا کے آگے ایک لکیر کھینچ کر سیتا کو اسی تک محدود رہنے کے لیے کہتے ہیں۔ یہ لکشمن ریکھا قدیم زمانے سے آج تک عورت کو مصائب و مشکلات محفوظ رکھنے کی اپنی ذمہ داری نبھا رہی ہے۔ شبابؔ للت بھی اس کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں:

میں جہاں بھی جاؤں اس کی لکشمن ریکھا میں ہوں
ہاں کوئی کرتا ہے میری پاسبانی ہر طرف
تمہاری یاد کی پاکیزہ لکشمن ریکھا
مجھے بچاتی رہی ایک پاسباں کی طرح

سیتا نے لکشمن ریکھا پار کی اور مصائب و آلام کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ صبر و ضبط کی، قناعت کی سرحدوں سے پار جانے والا ہمیشہ مشکل میں پڑا:

کوئی حد ہی نہ رہی اس کی پشیمانی کی
لکشمن ریکھا سے جو ضبط کی باہر نکلا
اک نہ ایک راون اسے باہر لے گیا
صبر کی سرحد جو باہر گئیں
سرحدِ صبر و قناعت کو جو نہ پار کریں
ایسی سیتاؤں کو راون کوئی نہ ہرتا ہی نہیں

راون جب فضائی راستے سیتا کو اغوا کر کے لے جا رہا ہوتا ہے جٹایو اسے آزاد کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ راون کے مقابلے میں بہت کمزور ہے مگر رام کے تئیں اس کی عقیدت اُسے خاموشی سے یہ ظلم برداشت کرنے نہیں دیتی۔ جٹایو کی عقیدت اس کا ایثار ضرب المثل بن گیا ہے۔ شباب للت نے جٹایو کے جذبۂ قربانی کو سلام کیا ہے:

لڑوں گا ظلم سے جبتک ہیں بال و پر باقی
جٹایوں کی طرح روان سے جوجھ جاتا ہوں
اُس کی آغوش میں دم ٹوٹتا میرا بھی شباب
پنکھ اگر میں بھی کٹا سکتا جٹایو کی طرح
اس کا سر ہے فقط تیری گود کے شایاں
جٹایو کی طرح قرباں جو بال و پر کردے

رامائن میں انسانی رشتوں کے تقدس کا خاص خیال رکھا گیا ہے راجہ دشرتھ کے چاروں بیٹے مختلف ماؤں کے بطن سے ہیں مگر ان کی محبت مثالی ہے۔ بھرت نے اپنی ماں کی غلط خواہش پورا کرنے سے انکار کیا اور رام کی کھڑاؤں کو گدی نشین کر کے حکومت کا کام چلایا...... لکشمن نے بھائی کی خاطر محلوں کا عیش و آرام چھوڑا شریکِ حیات سے جدائی برداشت کی اور بھائی بھابی کی خدمت کی۔ لکشمن جتنا رام کو چاہتے تھے، رام اس سے کم انہیں پیار نہ کرتے تھے۔ رام روان جنگ میں جب لکشمن زخمی ہو کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ تب رام کی بے چینی دیدنی ہوتی ہے۔ ہنومان کے سنجیونی بوٹی لانے تک وہ سیکڑوں بار جیتے مرتے ہیں۔ شبابؔ للت کے یہ اشعار دیکھیے:

پڑا ہے کب سے صداقت کا لکشمن بے ہوش
خدا کرے کوئی سنجیونی اثر کردے
پیار سنجیونی بوٹی ہے وہ بوٹی دے دو
دل وہ لچھمن ہے جسے بس یہ دوا کافی ہے

سگریو اور بالی بھی بھائی ہیں۔ زر، زن، اور زمین نے ہمیشہ رشتوں میں دراڑ ڈالی ہے...... ان دونوں میں سلطنت اور عورت پر اختلاف ہوتا ہے۔ سگریو رام کی پناہ میں اور سرخرو ہوتے ہیں رام پیڑ کی آڑ سے بالی کو تیر مار کر ہلاک کرتے ہیں۔ بالی کو حکومت سے محروم ہونا پڑتا ہے۔

انّیائے کا بالی ہے ستم پر بھی نازاں
تیر اس کو ابھی رام نے مارا تو نہیں
رن میں بالی آچکا بن کر سگریو کی
رام کا بھی تیر ہے تیار پیڑوں کے تلے

یہ چند مثالیں تھیں رامائن سے خصوصاً شباب للت نے حوالے لیے ہیں لیکن مہابھارت سے بھی استفادہ کیا ہے اور ہندوستانی لوک کتھاؤں کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ ان کا جائزہ ایک الگ تفصیلی مقالے کی مانگ کرتا ہے۔ جس پر مقالہ نگاروں کو توجہ دینی چاہیے۔

<u>کتابیات</u>

ابوالفیض سحرؔ (۲۵۵۳): ''اردو شاعری میں ہندو دیومالائی عناصر'' اردو دنیا دہلی اگست
الیس نارائن راؤ: (۱۹۸۵) ''روزمرہ کی زندگی اور رامائن'' آج کل دہلی۔ اپریل
ڈاکٹر آر۔ پی شرما مہرشؔ : ''ڈاکٹر شباب للت اور دیومالائی تلمیحات''
نوبہار صابرؔ : (۱۹۷۵) ''پیش لفظ'' مجموعہ کلام اڑان
نسیم حیدر رضوی: ''اساطیری اسلوب کیا ہے؟'' آواز۔ آل انڈیا ریڈیو کا میگزین
ظفر احمد نظامی (۲۰۰۳): ''ڈاکٹر شباب للت، بیسویں صدی'' دہلی افسانہ نمبر اگست۔
سلیم انصاری (۱۹۹۸): ''شباب للت کا سفر'' پاسبان، چنڈی گڑھ۔ جولائی، ستمبر

☆

''فقیرِ بے نوا''

محمد شاہد پٹھان
(اودھے پور، بھارت)

رہ گزر پر پڑا ایک ہیرا ہوں میں
پارکھی ہو تو کوئی اٹھا لے مجھے

وہ نہیں پامال راہوں کا مسافر
عام راہوں سے وہ ہٹ کر سوچتا ہے

شباب للت

ڈاکٹر شباب للت ہمارے عہد کے دیر مشق اور معتبر شعراء وادباء میں شمار ہوتے ہیں۔ان کا تخلیقی سفر نصف صدی سے زائد پر محیط ہے۔نثر اور نظم دونوں میں ان کے رشحاتِ قلم قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔اردو اور ہندی کے ساتھ ہی ساتھ فارسی سے بھی شباب للت آگہی رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر شباب للت نے کسی ادبی تحریک سے وابستہ ہوئے بغیر آزادانہ طور پر اپنا شعری سفر جاری رکھا ہے۔اپنے تخلیقی سفر میں وہ ''ادب اور زندگی'' کے اٹوٹ اور خوش گوار رشتے کو سنجیدگی کے ساتھ قائم رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ غزل اور نظم دونوں اصناف میں شبابؔ للت صاحب کو یکساں قدرت حاصل ہے۔ ان کے نزدیک تخلیقی عمل ایک سنجیدہ، مہذب، تعمیری اور مثبت اندازِ فکر کی ترجمانی کا نام ہے اپنے ادبی و شعری نقطۂ نظر کی صراحت انہوں نے اپنے مضامین، دیباچوں اور اداریوں میں کی ہے۔اپنے ایک اداریے میں وہ رقم طراز ہیں:

''قلم کار اپنے طور پر گرد و پیش میں جو کچھ دیکھتا ہے اسے شدت سے محسوس کرتا ہے اور اپنے معاشرے سے جو کچھ اخذ کرتا ہے اسے وہ اپنی شعری یا نثری تخلیق کی صورت میں لوٹا دیتا ہے۔وہ سماج کی کمزوریوں اور ناانصافیوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ان تلخ حقائق اور عوامل سے پردہ اٹھانے کی کوشش بھی ادیب اور شاعر کا فرضِ منصبی ہے، جو سماج کی بداعتدالیوں، استحصال اور بے انصافیوں کو جنم دیتے ہیں۔سیاسی موضوعات بھی ہمارے شعراء ادباء کے لیے شجرِ ممنوعہ نہیں لیکن مقامِ تاسف ہے کہ اُردو زبان کی شعری تخلیقات بالخصوص غزلیہ شاعری میں اب بھی نوعِ انسان کے عصری، وطنی، سماجی اور دیگر خارجی مسائل پر قلم اٹھانے سے گریز صاف نظر آتا ہے۔اس میں ان انسانی مسائل و مشکلات کی جانب اس طرح کے اشارے کم نظر آتے ہیں جو نظمیہ شاعری میں یا ہماری زبان کے نثری ادب میں ملتے ہیں۔اردو افسانے نے البتہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس میں سماجی، معاشرتی اور عمرانی مسائل پر کھُل کر اظہار رائے کے وافر امکانات پوشیدہ ہیں اور اس جہت میں ہمارے افسانہ نگار اپنی خامہ فرسائی کا مثبت جواز پیش کر رہے ہیں، ہمارے انشائیے، طنزیہ اور فکاہیہ نگارشات بھی ان موضوعات سے کافی حد تک انصاف کر رہے ہیں۔''

''اردو رسائل کے دفتروں میں غزلوں کا ایک انبار لگا رہتا ہے...... لیکن باستثنائے معدودے چندان غزلوں کے اشعار میں ایسی کوئی مفید بات کم ہی ہوتی ہے جو سماج ملک اور انسانیت کے لیے کچھ تعمیری اور افادی پیغام رکھتی ہو یا اس کرب، گھٹن اور تناؤ کی عکاسی کرتی ہو جس سے آج کا انسان گزر رہا ہے۔ صالح ادب وہی ہے جو انسانی ذہن و روح کی بالیدگی اور ارتقاء میں معاون ہو، نوّے فیصد غزلیں داخلی اظہار اور جمالیات کی بھول بھلیاں میں کھوئی دکھائی دیتی ہیں۔لگتا ہے جیسے ہمارے غزل گو شعراء کا خارجی مسائل سے کوئی علاقہ کوئی سروکار ہی نہیں۔اِن مسائل پر شعراء کا کوئی ردِّ عمل کوئی احتجاج ان کے سلجھانے کے لیے کوئی تدارک، کوئی حل، کوئی عقدہ کشائی، کوئی مستقل شناسی، کوئی انتباہ کوئی بشارت، کوئی تلقین، کوئی ڈھارس نہیں۔ضرورت ہے غزل کو محض قافیہ آرائی کی اس دلدل سے نکالنے کی جس جھنجھلا کر ہمارے ایک تیز طرّار ناقد نے فرمایا تھا کہ ''غزل کی گردن بلاتکلف ماردینی چاہیے''۔[1]

محولہ اقتباس سے ڈاکٹر شباب للت کے ''تصورِ شعر و ادب'' پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔اپنے عہد کی غزلیہ شاعری پر ان کی تنقید بڑی حد تک مولانا حالی اور ترقی پسند نقادوں اور ادیبوں کی غزلیہ تنقید سے کافی مماثل معلوم ہوتی ہے۔غزل پر سخت تنقید کرنے والے نقادوں میں خاص کر کلیم الدین احمد، عظمت اللہ خان، جوش ملیح آبادی اور اختر الایمان وغیرہ شامل ہیں۔جنھوں نے میرے خیال میں انصاف نہیں کیا، ان کے خیالات بڑی حد تک انتہا پسندانہ اور غیر سنجیدہ ہیں۔غزل کو دراصل ''اردو شاعری کی آبرو'' یا نیم وحشی صنف گردانا اور گردن زدنی قرار دینا، یہ تمام آراء مبالغہ آمیز اور انتہا پسندانہ ہیں اور تنقید کے منصب کے خلاف ہیں۔غزل کی اپنی صنفی خصوصیات، لوازمات اور امکانات ہیں۔اس کے معیار و محک پر کھرا اترنے کے لیے اصلاً میرؔ کا جگر، غالبؔ کا ذہن اور اقبالؔ کی فکر درکار ہے۔اور جن شعراء کو قدرت نے تخلیقی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں انہوں نے واقعتاً آندھیوں میں بھی چراغ جلا کر غزل کا بھرم قائم رکھا ہے۔اقبالؔ کے بعد فانیؔ، اصغرؔ، جگرؔ، حسرتؔ موہانی، فیضؔ، فراقؔ، جذبیؔ، اور مجروحؔ سلطانپوری وغیرہ نے غزل کے مخالف ماحول میں بھی اتنی وسعت دی ہے کہ اس میں زندگی کے بوقلموں تجربات اور مسائل کا اظہار ممکن ہے۔اس لیے انہیں ہمارے کم عیار شعراء سے جو شکایت ہے وہ اپنی جگہ پر صحیح ہے۔مولانا حالیؔ بھی دراصل غزل کے مخالف نہیں بلکہ مصلح تھے۔انہوں نے جدید نظم اور جدید تنقید کی طرح سے جدید غزل کی تخم ریزی کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے ڈاکٹر شبابؔ للت غزل اور نظم دونوں صنفوں میں یکساں قدرت رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری میں حیات و کائنات کے

مختلف رنگوں، پہلوؤں اور تعلقات کو اپنے افکار کا

۱؎ اداریہ: جدید فکر و فن ص ۳، بابت اپریل-جون ۲۰۰۲ء بھاشا و سنسکرتی وبھاگا ہماچل پردیش شملہ محور بنایا ہے۔ فن اور فن کار کی حرمت و منصب ان کے نزدیک بہت بلند ہے۔ کسی بھی تخلیق اور تخلیق کار کی عظمت کا اندازہ اس کے سماجی و کائناتی سروکار سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ شباب صاحب کے درجِ ذیل اشعار بھی اسی نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

حق نوازی ہم نہ چھوڑیں گے شباب
آزمائش کی گھڑی آتی تو ہے
خون دے کر ہم قلم کاروں کے ہاتھ
فکر کی دنیا نئی آتی تو ہے

غزل میں اپنی لیے اذنِ انقلاب ہوں میں
اسی خطا کے لیے موردِ عتاب ہوں میں

میں ہوں شاعر شباب اس نئے دور کا
صاف کرنے ہیں ذہنوں سے جالے مجھے

برتر سماج سے کوئی فنکار بھی نہیں
فنکار کیا جو صاحبِ کردار بھی نہیں

جیون کے سمکھ اگر نہیں کوئی آدرش
سب محنت بیکار ہے نستھل سب سنگھرش

محنت رچی ہے میری پہاڑی سرشت میں
چلتا ہوں اس زمین پہ جو ہموار بھی نہیں

اک فقیرِ بے نوا ہوں میں شباب
روز ٹکر میری سلطانوں سے ہے

جس نے الفت کی نہ ہو فنکار ہو سکتا نہیں
آگ لگتی ہے کہیں تو دل میں اٹھتا ہے دھواں

ہمارا سحرِ سخن یہی ہے ہماری معراجِ فن یہی ہے
شعورِ انساں نکھار دینا، دلوں میں ذوقِ جمال رکھنا

قطعہ:

دے کے ذوقِ سخن مجھ کو اس نے دی ہے پیمبری مجھ کو
میری قیمت چکانا کھیل نہیں کیا خریدے گا جوہری مجھ کو

غزل کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے محبوب صنف بھی ہے اور سب سے زیادہ معتوب بھی۔ غزل کہنا آسان بھی ہے اور دشوار بھی، یہ متضاد باتیں اپنی جگہ بڑی حد تک صحیح ہیں یہی غزل کی مقبولیت کی ضامن بھی جیسا کہ ہر نو مشق غزل ہی کو اکثر تختۂ مشق بناتا رہا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہزاروں، لاکھوں غزل گو شعراء کے قافلوں میں صرف چند شعراء ہی ''تاریخِ غزل'' میں اپنا نام محفوظ کرا پاتے ہیں۔ اس اعتبار سے غزل کہنا آسان سہی مگر غزل کی دیوی کو رام کرنا اسی قدر محال ہے۔ غزل سے وابستگی شاعر کو ''تذکرہ'' میں تو شامل کرا سکتی ہے مگر ''تاریخ'' کا حصّہ بننے کے لیے یہ کافر دیوی موت العمر خونِ جگر طلب کرتی ہے۔

ڈاکٹر شباب للت غزل کی کلاسکی شعریات سے کما حقہٗ آگہی رکھتے ہیں۔ انہیں علامہ بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی جیسے استادِ فن سے شرفِ تلمذ حاصل رہا ہے۔ چنانچہ سخن کا فیضان ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ انہوں نے اسلوب اور اظہار کی سطح پر ہمارے کلاسکی سرمایہ اور اس کے توانا عناصر سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ مگر احساسات و تجربات ان کے اپنے ہیں جن میں ''ذات'' سے زیادہ حیات و کائنات کے آفاقی و خارجی مسائل و معاملات کا شاعرانہ احاطہ کیا گیا ہے۔ شباب للت صاحب چونکہ اردو ہندی اور فارسی تینوں زبان سے آشنائی رکھتے ہیں اس لیے انہوں نے حسبِ موقع مذکورہ زبانوں کی شعریات، لفظیات اور تلمیحات و اساطیر سے عمدہ مصرف لیا ہے۔ میرے خیال میں اسی وجہ سے شباب للت غزلیہ شاعری میں (جو خالصتاً ایمائی و استعاراتی اسلوب کی ترجمانی ہے) زندگی کے بوقلموں مظاہر و معاملات کو اپنے ضابطۂ سخن میں محفوظ کر لینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، مذہبی سائنسی اور مابعد الطبیعاتی غرض کہ متنوع صیغہ ہائے حیات کے معلقات و مضمرات کو شباب للت صاحب نے اپنی فکرِ رسا کا محور و مرکز بنایا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے غزل کو نظم کی وسعت و رفعت سے قریب کرنے کی شعوری کوشش کی ہے اس سعی میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر شباب کے اسلوبِ بیان میں طنز و تخاطب اور استفہام کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ''طنز'' کا نشانہ انہوں نے سب سے زیادہ اپنے دور کے سیاسی و معاشرتی مسائل اور مسائل کو پروان چڑھانے والے ذمہ دار (گنہگار) لوگوں کو بنایا ہے۔ ذیل کے اشعار سے کلامِ شباب کے مذکورہ پہلو کی نشاندہی ہوتی ہے۔

میں کہ وابستہ کسی بزمِ سیاست سے نہیں
بہہ رہا ہے خون کیوں سڑکوں پہ میرا رائیگاں

نظامِ امن کی امید ان سے کیا رکھیے
کہ ان خداؤں کی دیکھیں خدائیاں نقلی

ہیں مشکلات حقیقی تمام سو فی صد
مگر نظام کی مشکل کشائیاں نقلی

کبھی حلال کی روزی سے بچے پلتے تھے
شباب رہ گئیں اب تو کمائیاں نقلی

خصلتاً انساں ہمارے عہد کا
ملتا جلتا کتنا حیوانوں سے ہے

سفارش لائیے تو یہ کرشمہ ہو بھی سکتا ہے
لیاقت سے تو مستقبل یہاں بدلے نہیں جاتے
یہ کیسی بے بسی ہے اے وطن کیوں تیری سڑکوں پر
لہو کی بہتی ندیوں کے سماں بدلے نہیں جاتے

نہ رہتی آبرو محفوظ پھولوں اور کلیوں کی
گلستاں کے اگر وہ باغباں بدلے نہیں جاتے

دیکھیے مجبوریاں جمہور کی
تاج اک قاتل کے سر پر رکھ دیا

وہ جو فتنوں کو پسِ پردہ ہوا دیتے ہیں
ان کے چہروں سے نقاب آج ہٹایا جائے
اس کے دربار میں یہ حکم ہوا ہے جاری
دستِ تائید اٹھے سر نہ اٹھایا جائے
اس اجالے سے تو بہتر ہے اندھیرا ہی شبابؔ
گھر جلادیں جو دیے ان کو بجھایا جائے

اک عمر ہماری انہیں طوفانوں میں گزری
ساحل کے قریب اپنے سفینے نہیں جاتے

اپنوں کی ایک خطا قوموں کو لے ڈوبی شبابؔ
کتنی دیواریں ذرا سی دیر میں در ہوگئیں
ملک گیری کی ہوس نے کھائیں کتنی سرحدیں
ملّتیں کتنی اسی چکر میں بے گھر ہوگئیں

شکم رعایا کے فاقہ مستی کی بھٹیوں میں جھلس رہے تھے
وہ عہدِ جمہوریت کا نیرو مزے سے بنسی بجائے خوش تھا

مانگا ہم نے دن وہ سیہ رات دے گیا
سورج ہمیں اندھیرے کی سوغات دے گیا

جو پیڑ خشک تھے وہ اب تلک بھی سوکھے ہیں
چمن میں کہنے کو بادل چھلک چکا ہے بہت
میرے خدا کوئی جرّاح اب تو نازل کر

یہ پھوڑا گندی سیاست کا پک چکا ہے بہت

غرض کہ شاعر اپنے زمانے کے طرزِ سیاست سے مطمئن نہیں ہے، اس کے نزدیک:

ملے رہبر کوئی مخلص تو شاید کارواں اپنا
تشدد کے بھیانک خارزاروں سے نکل آئے

سیاست کے سفاکانہ رویّے کی مانند شبابؔ صاحب کو اپنے سماج میں بڑھتے ہوئے زہرِ نفاق، تعصب، ناانصافی، فرقہ پرستی، انسانی قدروں کی پامالی، عیاری، ہوسنا کی اور تمام منفی حقائق کا بھی شدید احساس ہے۔ چنانچہ متذکرہ غیر انسانی اور اقدار کش ذہنیت سے پیدا شدہ عواقب ونتائج پر شباب للت نے بڑی گمبھیرتا سے اظہارِ خیال کیا ہے۔

اس دوران شاعر کے طرزِ احساس میں وجودی رنگ ورجحان بھی ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہاں بھی طنز کے نشتر اپنا ہنر دکھاتے ہیں:

کسر تو کوئی نہ چھوڑی تھی دشمنوں نے شباب
مگر دعا سے بزرگوں کے کامیاب ہوں میں

میں بھی سچ بولنے کا گنہگار ہوں
بزدلو! زہر کے دو پیالے مجھے

محصور اک نہ اک بڑے طوفان میں رہے
ہم ساری عمر جنگ کے میدان میں رہے
کیا خبر ظالم ہوا مجھ کو کہاں لے جائے گی
شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے کی ہے منزل کہاں

جی چاہتا ہے عقل پہ منصف کی روئیے
حق اس کو دے رہا ہے جو حقدار بھی نہیں

حادثے ہر موڑ پہ ہیں گھات میں کیا کیجیے
کس قدر ارزاں ہے مرگِ ناگہانی ہر طرف

آج گلشن کے محافظ ٹھہرے
کچی کلیوں کو مسلنے والے

ہمارے واسطے اعلان نہیں سزاؤں کے
ہمیں تو ہیں جو گنہگار ہیں وفاؤں کے
چمن پرست ابھی سے چمن کی فکر کریں
ارادے نیک نہیں اجنبی ہواؤں کے

ہاتھ کچھ بلوائیوں کا تم نے روکا تھا شبابؔ
اس خطا کے واسطے تم کو ملا بن باس کیا؟

کردے وہ میری خطا کو مختصر دشوار ہے
کاٹ کر بن باس میں لوٹ آؤں گھر دشوار ہے

چہرے سے لے گیا میری پہچان چھین کر
ناسازگار وقت وہ صدمات دے گیا

کامیابی کی دلہن غیر کے دامن سے بندھی
جیت کر بلاشبہ سوئمبر نکلا

ہم نے سورج کی طرح جس کی پرستش کی تھی
وہ تو کم بخت اندھیروں کا سمندر نکلا

منصب خاص کے ٹھہرے حقدار
وقت کے ساتھ بدلنے والے

تمام گاؤں کی وہ آبرو سے کھیل گئے
پہن کے آئے تھے جو مکھوٹے پارساؤں کے

وقت کے سخت ہاتھوں میں ایک گیند ہوں
جس طرف بھی وہ چاہے اچھالے مجھے

دستک ہزار دیتی رہی مسئلوں کی دھوپ
وہ عیش کوش اپنے شبستان میں رہے

نئی رتوں کی ہوا لے اڑی لباس مرا
بجا ہے مجھ پہ تہمت کے بے حجاب ہوں میں

ہمارے عہد کی تاریخ ہم لکھیں تو کیا لکھیں
ستم کے واقعاتِ خونچکاں بدلے نہیں جاتے

وہگرو، اللہ، ایشور، گاڈ، سب چپ چاپ تھے
نام پر ان کے لہو کی بہہ رہی تھیں ندیاں

غزلیہ شاعری کی طرح سے شبابؔ للت کی نظمیہ شاعری، رباعی اور قطعات میں بھی اپنے عہد کے بدلتے ہوئے انسانی کردار، ٹوٹتے ہوئے رشتے اور دم توڑتی ہوئی انسانی واخلاقی اقدار کا اظہار واضح طور پر ہوا ہے۔ ذیل میں چند نظمیں اور رباعیات بطور مثال شامل ہیں۔

(۱) ہم نے دیکھا ہے ہمیشہ کہ وہی لوگ شبابؔ/ جن کی ہوتی ہیں وفاداریاں اپنی مشکوک/ اپنے باطن کی خباثت کو/ چھپانے کے لیے/ انگلیاں اٹھاتے ہیں وفاداروں پر/ اہلِ اخلاص ووفا سے/ یہی ہوتو ہے سلوک (منافق)

(۲) وہ لوگ/ اندر سے کتنے پست قد ہیں/ کھوکھلے ہیں/ ہم جنہیں اب تک سمجھتے تھے/ ہمالہ کی طرح رفعتِ نشان، اُجلے/ سیمرو کی طرح/ پاکیزہ و محکم۔ قد آور پاک دامن/ ضبط واستقلال کے پتلے/ ہماری سادہ لوحی کی نگاہوں میں/ جو کل تک بھیشم تھے/ لمپٹ دوشاسن کے بن گئے، کیونکہ/ گھڑی بھر میں/ کہ تھی بس دیر اک موقعہ ہی/ ملنے کی/ ذرا سی آزمائش میں/ چورا ہے بیچ/ بھانڈا اِن سرفرازوں اور/ اونچی ناک والے/ ان رعایا کا جب پھوٹا (بونے)

(۳) ز.....زبان ٹیڑھی ہے جس کی/ جس کو غیبت اور بدگوئی کی عادت ہے/ اسے اچھا بشر تسلیم کرلیا/ حماقت ہے/ منافق حرف زن، چغلی کا عادی/ جو بشر ہوگا/ اسے خود کے سوا اچھا نظر آتا نہیں کوئی...../ مرے مالک/ مجھے ایسے منافق کی/ رفاقت اور صحبت سے بچائے رکھ/ زبان سے کام لیتا ہے ماچس کا (خدا بچائے)

رباعیات

حالات عجب موڑ لیے جاتے ہیں
ہم جبر کے سائے میں جیے جاتے ہیں
ملتی تھی سزا موت کی ہتھیاروں کو
قاتل کو اب انعام دیے جاتے ہیں

ہنگامہ نیا اک اٹھا کر چھوڑا
ہاں بھائی کو بھائی سے لڑا کر چھوڑا
کرسی کے لیے کیا دلوں کو تقسیم
کس موڑ پہ تم نے ہمیں لاکر چھوڑا

دھوکے دیے ہر بار سوئمبر نے مجھے
جے مالا نہ پہنائی مقدر نے مجھے
آئینہ ہوں فطرت ہے میری حق گوئی
رکھا نہ کہیں کا مرے جوہر نے مجھے

دل پر جو گراں ہے وہ گرانی نہ رہے
پرکھوں کی یہاں کوئی نشانی نہ رہے
بن باس دو اب گھر کے بڑے بوڑھوں کو
اب گھر میں کوئی چیز پرانی نہ رہے

غرض کہ ڈاکٹر شباب للت ایک حسّاس اور کریم النفس تخلیق کار ہیں۔ انہوں نے حیات وکائنات کے گوناں گوں مسائل وامور کو اپنے فکر وفن کا خاص موضوع بنایا ہے۔ حقیقت پسندی اور بے باکی ان کی شاعرانہ شخصیت کی نمایاں خوبی ہے۔ زندگی کی جن ناہمواریوں اور منفی عناصر کو انہوں نے اپنے شعری اظہار کا محور بنایا ہے۔ ان کا تدارک وانسداد تو ظاہر ہے ایک قلم کار کے بوتے سے باہر ہے، تاہم شیطانی ذہنوں کے ظالمانہ اور وحشیانہ وطیرے کے

خلاف اپنی زبان، ذہن، قلم اور فکر کا استعمال و اظہار کرنا فن کار کا فرضِ منصبی ہے چنانچہ شباب للت گویا ہیں کہ:

ہمارے صبر کا اب اور امتحان نہ لے
ہمارے صبر کا ساغر چھلک چکا ہے بہت
یہ آگ تیرے محل تک کہیں نہ جا پہنچے
دلوں میں غیظ کا شعلہ بھڑک چکا ہے بہت

فصیلِ شہرِ تباہ پر یہ کٹے ہوئے جن کے سر ٹنگے ہیں
یہی وہ ٹولہ تھا بے کسوں کا کہ لہو کل جو نہا کے خوش تھا

رباعی

سر اپنا ہتھیلی پہ ہو چاہے دھرنا
اظہارِ صداقت سے نہ ہرگز ڈرنا
شاعر ہوں میں، ایماں میری حق گوئی
آتا ہے مجھے فرض پہ اپنے مرنا

شباب للت کو فکر و خیال کی قوت اور کرشمے کا عرفان ہے، لہذا وہ فرماتے ہیں:

آگ نفرت کی بجھا سکتا ہے شاعر کا کلام
یہ کرشمہ بھی زمانے کو دکھایا جائے

ڈاکٹر شباب للت ہر چند کہ مذہباً ہندو ہیں مگر خدائے واحد پر ان کا ایمان مسلّم ہے۔ وہ بنیادی طور پر توحید پسند انسان اور فن کار ہیں۔ دنیا کے آشوب اور نگاہوں سے نجات پانے کے لیے وہ اپنے تخلیقی لمحات میں بارگاہِ ایزدی میں دست بدعا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کی غزل اور نظم میں ایک طرح کا ایمان اور ایقان خیز دعائیہ لہجہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ شباب للت قادرِ مطلق کی کارسازیوں پر مکمل ایمان رکھتے ہیں ان کی شاعری کے دعائیہ اسلوب کے پیشِ نظر کہا جاسکتا ہے کہ ویدوں، اپنشدوں کے ساتھ ساتھ ان کے مطالعے میں قرآنِ کریم کی یہ آیت ''وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ'' (ترجمہ: اور تمہارے رب نے فرمایا ہے مجھ سے دعا مانگا کرو گا۔ المؤمنون ۶۰) بھی رہی ہے۔ شباب للت کی درجنوں منظومات اور صدہا اشعار میں بارگاہ الٰہی میں دعا، التجا، تشکر، عفو اور توکل و استغنیٰ کے احساسات اور جذبات کا اظہار دیکھنے کو ملتا ہے:

وہ نام پاکیزہ و مبارک، جو ہر گھڑی ہے ترا محافظ
ہر ایک شمشیر کے مقابل، شباب تو اس کی ڈھال رکھنا

شباب اس کی نوازش سے ناامید نہ ہو
جو پتھروں کو بھی ترا سکے سمندر میں

رہی ہے میری محافظ وہ ایک شفیق نگاہ
سفر میں، سیر میں، خلوت میں، بزم میں گھر میں

میرے حق میں مجھ سے بہتر سوچتا ہے
وہ خدائے خلق پرور سوچتا ہے

اک دستِ غیب ان سے بچاتا رہا مجھے
بے رحم حادثات جو امکان میں رہے
بخشندہ و رحیم ہے وہ ذات تو شباب
ہاں جھول کچھ ہمارے ہی ایمان میں رہے

منظومات:

خدائے پاک ہے تو مالکِ سیاہ و سفید
تو لازوال ترا آدانت ہے ناپید
تو ہے وہ قادرِ کل جس نے اپنی قدرت سے
طرح طرح کے ہر اک شے میں رنگ بھر ڈالے
کرشمہ یہ بھی ترا تھا کہ جسم پر میرے
سیاہ بال تھے جتنے سفید کر ڈالے
مرے خدا مرے معبود ذاتِ بخشندہ
یہ معجزہ بھی دکھانا تو اپنی قدرت سے
سیاہ نامۂ اعمال میرا پیش ہو جب
سفید اس کو بھی کر دینا اپنی قدرت سے
گناہ گار کی یہ آخری تمنا ہے
سیاہ کار کی یہ آخری تمنا ہے
اپنی آخری تمنا

اے غریبوں کے خدا/ مالکِ ہر دوسرا/ اپنے بے لاگ قلم سے میری پیشانی پر/ تو نے جو میرا مقدر لکھا/ اس سے آسودہ ہوں مسرور ہوں میں/ تیرا ممنونِ کرم ہوں ربی/ تیری تحریر کے صدقے، تیری رحمت پہ نثار/ مفلسی تو نے مقدر میں لکھی میرے اگر/ ہوں بہت شکر گزار/ میں نے پھیلائی تھی جو خالی ہتھیلی اس پر/ تو نے محنت کی مشقت کی لکیریں رکھ دیں/ مجھ پہ ممنوع کیا یہ رزق حرام/ انتہا تیری نوازش کی ہے یارب تو نے/ پر زہ اس نظم کا نہ بنایا مجھ کو/ شرطِ لازم ہو جہاں قتلِ ضمیر/ ایسے شعبے کا میں کارندہ نہیں ہوں/ جس میں دہشت و جبر و تشدد ہوں روا/ سینہ زوری کا جہاں/ بول بولا ہو شب و روز/ دونوں جہانوں کے خدا/ شکر سو بار ترا.....(نوشتۂ تقدیر)۔

(iii) جس کے سینے برے/ تعبیر سے ناآشنا ہیں/ سیکڑوں، رنگین، مدھر، کومل، سنہرے خواب/ میں بیشتر دیکھے/ مگر اب تک پہن پائے نہ وہ/ جامہ حقیقت کا/ یہ ناکامی سی ناکامی/ مقدر کی یہ سازش/ اُف یہ محرومی/ مگر آتا نہیں حرفِ

شکایت میرے ہونٹوں پر/کرم مجھ پر مرے خالق کا/ یہ بھی کم نہیں یارو/کہ جو سپنے بھیانک/ اور دہشت ناک میں آج تک دیکھے/ خدائے پاک نے ان کو/حقیقت میں نہیں بدلا۔ (تعبیر)

(iv) .....آسمانی باپ کا کیا ہے/ کہ وہ تو/ قادرِ مختار و مطلق ہے شبابؔ/ اس کا کرم ہے بے حساب و بے مثال/اس کو سبھی کہتے ہیں ربّ ذوالجلال/ اور ہم ناچیز بندے/فطرتِ سفلی کے قیدی اور پابندِ حواس/ ہم کے ہیں مجبور و پابند و غلام/ کچھ سمجھ سکتے نہیں/اس ذاتِ مطلق کا نظام/ ہم کہاں سے پائیں گے/اس ذاتِ بخشندہ کے اوصافِ جمیل/جس کی رحمت کی نہ کوئی حد/ نہ اندازہ/ نہ ہے کوئی عدیل۔

(اور ہم ناچیز بندے)

رباعیات:

شب رنج و مصیبت کی گزرتی ہے کہاں
چڑھ جائے ہے یہ آندھی تو اترتی ہے کہاں

شامل نہ ہو جب تک وہ نگاہِ بخشش
بگڑی ہوئی تقدیر سنورتی ہے کہاں

وہ ظلمتِ شب، دن کی تب و تاب بھی ہے
وہ ساز بھی ہے، نغمہ بھی مضراب بھی ہے
تقدیر مسافر کی ہے اس کے بس میں
ساحل بھی، سفینہ بھی وہ گرداب بھی ہے

من حیث المجموع کہا جا سکتا ہے کہ شبابؔ للت تخلیقی طور پر زرخیز ذہن اور بالیدہ ذوق کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنا طویل شعری سفر سلامت روی اور تازہ کاری کے ساتھ طے کیا ہے۔ غزل اور نظم دونوں اصناف میں انہوں نے اپنی تخلیقی توانائی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ عمر کے اس پڑاؤ پر بھی ان کے ذہن و فکر میں ماندگی کے اثرات نمایاں نہیں ہو سکے ہیں۔ ان کا اشہب قلم اب بھی زندگی کی نئی راہوں پر گامزن ہے۔ ان کے آئینہ خانۂ سخن میں معاصر عہد کی متنوع کیفیات جلوہ فگن ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر شبابؔ للت کے درجِ ذیل اشعار قاری سے صحیح طور پر مکالمہ قائم کرتے ہیں۔

پڑھ سکے تو پڑھ مرے دل کی کتاب
جو مرتب ترے افسانوں سے ہے

ہمارا سحرِ سخن یہی ہے، ہماری معراجِ فن یہی ہے
شعورِ انساں نکھار دینا، دلوں میں ذوقِ جمال رکھنا

○

جب ہم ڈاکٹر شباب للت صاحب کی شعری تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ شباب للت زمانۂ طالبِ علمی ہی سے میدانِ شاعری میں لگن اور محنت سے گامزن ہیں ان کی زندگی اُردو ادب کی خدمت کے لیے وقف ہے۔ وہ اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ان کی ذہنی پرورش ایک صحت مند ادبی ماحول میں ہوئی اور وہ علامہ منشی بشیشر پرشاد منوّر اور پدم شری جبا جو ملیانی جیسے باکمال اہلِ فن اور اہلِ قلم کے دامنِ فیض سے وابستہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام بیان صحت مند روایات کا آئینہ دار ہے وہاں اُن کے کلام میں جا بہ جا فنی لوازمات بھی موجود ہیں جس سے کلام اور نکھر گیا ہے اسی طرح وہ ان تمام خوبیوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے جن سے شاعری اپنی عروج تک پہنچتی ہے۔ اس صورت میں ایک شاعر پہچان قائم کرتا ہے۔ میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی قدرتی صلاحیت ہے جس نے ان کی رہنمائی بھی کی اور آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی دیا۔ اسی کے سبب آج وہ اس مقام پر ہیں جہاں وہ نوآموز شعراء کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ جب ۱۹۶۱ء میں ان کا سب سے پہلا شعری مجموعہ ''مضراب'' منظرِ عام پر آیا تو اس پر مختلف رسائل میں کیے گئے تبصروں سے یہ تاثر ملتا تھا کہ یہ مجموعہ ادب میں اضافہ ہے۔ مذکورہ مجموعہ میں شامل کلام میں صرف مضمون آفرینی ہی نہیں تھی بلکہ ایک اسلوب بھی تھا جو ہر شاعر کو میسر نہیں ہوتا۔ ان کے کلام میں زبان و بیان کی خوبیاں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس خیال سے اردو مسلمانوں کی زبان ہے، زبان کے پھیلاؤ اور ترقی کے سلسلہ میں بڑا منفی کردار ادا کیا ہے۔ یہ رجحان فرقہ پرستی سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ہاں ایک بات جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، شبابؔ للت صاحب کے دل میں بھی اس بات کی کسک موجود ہے۔ انہوں نے ایک جگہ اس کا ذکر بھی کیا ہے:

غیر مسلم ہو کے بھی عاشق ہوئے اردو پہ ہم
زندگی بھر اس حماقت پر ہمیں رونا پڑا

عرش صہبائی (جموں، کشمیر)

''ایمان کی قدریں''

(شباب صاحب کے نظمیہ کلام سے مختصر انتخاب)

عطیہ سکندر علی
(سکھر)

نئی نسلوں سے شکوہ

زیارت گاہ پر بہرِ زیارت سینکڑوں زائر
دلوں میں بھر کے اِک طوفانِ بے پایاں عقیدت کا
ارادت، آستھا، وشواس، شردھا کی
جلا کر شمع سینوں میں
چمک آنکھوں میں لے کے نورِ ایماں کی
بشوقِ والہانہ آن پہنچے ہیں۔۔۔۔

چلو ان سادہ دل، ایماں زدہ، معصوم انسانوں
عقیدت مند لوگوں
بھولے بھالے ان مُریدوں کو
کرم کانڈوں کے چکّر میں پھنسا کر
اسطرح جی بھر کے لُوٹیں دونوں ہاتھوں سے
نچوڑیں ان کو لیموں کی طرح
ایسے
کہ ان کی نورِ ایماں سے دمکتی رُوح کے اندر
عقیدت، آستھا، وشواس، شردھا کی
ذرا سی بھی رَمق باقی نہ رہ جائے
رقم باقی نہ رہ جائے
ذرا بھی ان کی جیبوں میں
کرایہ گھر تلک کا بھی نہ چھوڑیں
ان کے بٹوے میں
کہ دوبارہ کبھی یہ زندگی بھر
اس زیارت گاہ کی جانب قدم رنجہ نہ فرمائیں
نہ پھر تیرتھ نہائیں۔۔۔

تعجّب ہے۔
کہ دھرم، ایمان، مُکتی، شانتی، نروان
کے ان ٹھیکے داروں کو
لُٹیروں کو،
یہ شکوہ ہے۔
''زوال آنے لگا ہے دھرم پر
ایمان کی قدریں وطن سے مٹتی جاتی ہیں
سناتن سبھیتا سے رام جانے
دُور تر کیوں ہوتی جاتی ہیں
نئی نسلیں۔۔۔؟''

○

زندگی ایک سمجھوتا

زندگی نام ہے بے نام سے سمجھوتوں کا

دشمنوں سے کبھی سمجھوتہ کبھی یاروں سے
گاہے دلپسندوں سے تو گاہے دل آزاروں سے

کبھی ماحول کی گرمی سے کبھی سردی سے
کبھی حالات کی دشواری و بیداری سے

غیر آسودہ تمناؤں سے سمجھوتہ کبھی
جابر و سنگدل آقاؤں سے سمجھوتہ کبھی

کبھی حاکم سے، ملازم سے کبھی سمجھوتہ
پُر ضرر ربط و مراسم سے کبھی سمجھوتہ

کبھی سنگین روایات کی پابندی سے
گاہے مجبوری سے تو گاہے رضامندی سے

بھائیوں کی کبھی اَولاد کی ناخلفی سے
کبھی آقاؤں کے ہاتھوں ہوئی حق تلفی سے

کبھی شوہر، کبھی بیوی کی دلآزاری سے
کبھی بے شرم عزیزوں کی غلط کاری سے

کبھی سمجھوتہ رعونت بھرے نقّادوں سے
کبھی مجبوری میں خود ساختہ اُستادوں سے

کبھی ہم عصر ادیبوں کی خود آرائی سے
کبھی نقادّوں کی تھوپی ہوئی رُسوائی سے

کسی اُستاد کی دانستہ گراں گوشی سے
کسی شاگرد کی احسان فراموشی سے

کبھی ہمسایۂ کم ظرف کی عیّاری سے
سینہ زوری سے شقاوت سے ستم گاری سے

کبھی سمجھوتہ بداندیشوں کے دشنام کے ساتھ
گردشِ وقت سینہ بختیٔ ایام کے ساتھ

کبھی مہنگائی سے قلّت سے کبھی سمجھوتہ
کبھی توہین سے، ذلّت سے کبھی سمجھوتہ

زر طلب اہلِ غرض سے ہے کبھی سمجھوتہ
ڈاکٹر سے تو مرض سے ہے کبھی سمجھوتہ

طاقت وزر کے خداؤں سے کبھی سمجھوتہ
اُن کے چمچوں کی جفاؤں سے کبھی سمجھوتہ

ناپسندیدہ مسائل سے کبھی سمجھوتہ
کسی عاقلِ، کسی جاہل سے کبھی سمجھوتہ

چور بازاری سے، رشوت سے کبھی سمجھوتہ
کج نظر اہلِ سیاست سے کبھی سمجھوتہ

کبھی سمجھوتہ ہے نیتاؤں کی مکارّی سے
پنڈتوں کی کبھی مُلاؤں کی عیّاری سے

کام چوروں کے بہانوں سے نہ ہونا برہم
مفت خوروں کے بیانوں سے نہ ہونا برہم

کُفر سے تو کبھی ایمان سے ہے سمجھوتہ
کبھی اللہ کبھی شیطان سے ہے سمجھوتہ

اے مِری نسل کے شائستہ چلن انسانو
بات کڑوی ہے مگر اسکو حقیقت مانو

دارِ حالات پہ لٹکے ہوئے منصوؔر ہیں ہم
ہر قدم پر کسی سمجھوتے پہ مجبور ہیں ہم

زندگی نام ہے بے نام سے سمجھوتوں کا

☆

شکرانۂ محبت

والدین محنت سے
پیار سے محبت سے
شوق اور شفقت سے
چاؤ اور چاہت سے
اپنے ننھے بچوں کو
لاڈلوں دُلاروں کو
بولنا سکھاتے ہیں
اور وہ سعادت مند
نورِ چشم برخوردار
لاڈلے جواں ہو کر
والدین کو اپنے
دم بدم سکھاتے ہیں
بس ہمیشہ چپ رہنا

○

خود فریبی

لڑا کو دو فریقوں کو بہم
ملتا ہے جن کو اقتدار و منصب عالی
ہے جن کی زندگی جھگڑوں پہ قائم
ان سے یہ امید رکھ لینا
کہ وہ جھگڑے مٹائیں گے
عداوت و فتنہ و شر سے وہ
خلقت کو بچائیں گے
فقط اک خواب دیوانے کا ہے
کوری حماقت
خود فریبی اور خوش فہمی

○

ارتکاز

مختلف پچیس جگہوں پر
گڑھے چھ سات فٹ گہرے
بڑی محنت سے کھودے
پھر بھی ہاتھ آیا نہ پانی
تب مقام اِک سرسری چُن کر
گڑھا چالیس فٹ گہرائی کا اک رفتہ رفتہ
ہم نے کھودا۔۔۔اور
پانی چیر کر دھرتی کا سینہ
ایک فوارے کی صورت
پھوٹ نکلا

روح کی تہذیب کی خاطر
بہت کافی ہے گر پڑھ لیں
صحیفہ ایک ہی بس
ایک ہی تصنیفِ اقدس
غور سے، یکسوئی سے، صدق و عقیدت سے
کریں تفہیم اُسکی دھیرے دھیرے

روح کی تہذیب کی
تطہیر کی خاطر
تلاوت دس کتابوں کی
گرنتھوں کی
ضروری تو نہیں یارو

○

سفر تمام ہوا

کیسے کٹا نہ پوچھ، کڑی دھوپ کا سفر
دن ڈھل چلا قریب ہے اب زندگی کی شام
اک لمحہ بیٹھنے کو نہ مل پائی کوئی سیٹ
بس میں کھڑے کھڑے ہی سفر ہو گیا تمام

تقدیر لکھنے والے سے اتنا تو پُوچھ لوں
دینا تھا گر مجھے یہی ذلّت بھرا سفر
پھر کیوں نہ جار حانہ خصائل دئے مجھے
لے لیتا غاصبوں سے میں حق اپنا چھین کر

کیوں تو نے یہ شرافت کردار بخش دی
کیوں عجز وانکسار مجھے کر دئے عطا
دیتا نہ چین سے میں حریفوں کو بیٹھنے
کیوں جدوجہد کا نہ دیا مجھ کو حوصلا

اچھا تھا بخش دیتا مجھے سنگلاخ دل
پسماندگی کو جو نہ سمجھتا کبھی کلنک
احساسِ کمتری نہ جسے یوں کچوٹتا
دیتے چبھن ذرا بھی نہ حق تلفیوں کے ڈنک

انیائے جونک بن کے لہو چاٹتا رہا
شوشن کی سرد آگ میں جلتا رہا شعور
اپنی صلاحیت ہی بنی میری فردِ جُرم
اوصاف تھے جو میرے وہ سمجھے گئے قصور

شاید اسی میں ہوگی کوئی مصلحت نہاں
دل کو اِسی جواب سے بہلا رہا ہوں میں
اربابِ اختیار کے وعدے فریب ہیں
معلوم ہے فریب مگر کھا رہا ہوں میں

کیسے کٹا نہ پوچھ کڑی دھوپ کا سفر
دن ڈھل چلا قریب ہے اب زندگی کی شام
اک لمحہ بیٹھنے کو نہ مل پائی کوئی سیٹ
بس میں کھڑے کھڑے ہی سفر ہو گیا تمام

تعبیر

حسیں سپنے مرے
تعبیر سے نا آشنا ہیں۔۔۔
سینکڑوں رنگیں، مدُھر، کومل، سنہرے خواب
میں نے عمر بھر دیکھے
مگر اب تک پہن پائے نہ وہ
جامہ حقیقت کا
یہ ناکامی سی ناکامی
مقدّر کی یہ سازش
اُف یہ محرومی
مگر آتا نہیں حرفِ شکایت میرے ہونٹوں پر

کرم مجھ پر
مرے خالق کا یہ بھی کم نہیں یارو
کہ جو سپنے بھیانک
اور دہشت ناک میں نے اب تلک دیکھے
خدائے پاک نے اُن کو حقیقت میں نہیں بدلا

○

زخموں کے ذائقے

زخم غیروں سے کھائے ہوئے
سہ تو لیتا ہے مجروح انسان
چپ چاپ ہی
رکھ کے سینے پہ پتھر
ہاں مگر کوئی حساس انسان جب
گھاؤ اپنوں سے کھاتا ہے کوئی
تو بے ساختہ
بلبلاتا ہے، سر نوچتا ہے

○

ماہیے

چٹھّی ہے تری آئی
دل کے آنگن میں
گونج اُٹھی ہے شہنائی

○

بادام لگے پکنے
چُھٹّی آ بالم
ہم راہ لگے تکنے

○

دُکھ تیرا نہ میرا ہے
بھوگا جو ہم نے
کاغذ پہ بکھیرا ہے

○

تُو پاک فرشتہ ہے
جانِ وفا تجھ سے
سوجنموں کا رشتہ ہے

○

جو بن تھا ،اُمنگیں تھیں
ڈور تھی آشا کی
سپنوں کی پتنگیں تھیں

○

شملے کا دسمبر ہے
رات کٹے کیسے
پردیس میں دلبر ہے

دے گا نہ ہمیں جینے
روگ محبت کا
بولا ہے نجومی نے

○

لگی عشق کی بیماری
بھگتی بھُول گئے
مارے گئے برہم چاری

○

سوگند ترے سرکی
تیرا بدن گوری
ہے دھوپ دسمبر کی

○

پھر یاد تری آئی
صبر کے خرمن پر
اک برق سی لہرائی

○

پھر تیرا خیال آیا
دل میں ہُوک اٹھی
اشکوں میں اُبال آیا

○

بے وجہ تُو روٹھ گیا
دل کی رگ رگ میں
اِک نشتر ٹوٹ گیا

جو نذرِ صنم ہونگے
خونِ جگر سے وہ
اشعار رقم ہونگے

○

یہ جو پیار کے رشتے ہیں
بخشش ہیں رب کی
قسمت کے نوشتے ہیں

○

کیا سانولی صورت تھی
چھِن گئی جو مجھ سے
مرے دل کی ضرورت تھی

○

نین اُس سے ملاآئے
دل کو سُندر سا
اک روگ لگا آئے

○

برسات کی بھادوں کی
بُھولی نہ جیون بھر
وہ رات مُرادوں کی

○

ہیرے کی انگوٹھی ہے
جس کے لیے مجھ سے
گوری مری روٹھی ہے

''عکسِ وحدت ورسالت''

ڈاکٹر شباب للت

شاعری کا دائرہ کار صرف غم جاناں اور غم دوراں کی ہی عکاسی نہیں۔غزل ہو یا نظم یا اور کوئی شعری پیکر، محض ذہنی عیاشی ہی اس کا مقصد اور فریضہ نہیں۔ فنکاروں کے اس عمومی رُجحان پر سوالیہ نشان لگاتے ہوئے شاعرِ مشرق اقبال نے فرمایا تھا:

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

بے مصرف اور بے وجہ شعر گوئی کو فیض احمد فیضؔ نے بھی ''نقشِ فریادی'' میں تضیع اوقات قرار دیا۔شاعری حکایات لب ورخسار اور کشمکش روزگار کی عکاسی کے علاوہ بہت کچھ ہے اور ''اس بہت کچھ'' میں انسانیت کو دو قدم آگے بڑھانا، مذہب اور اخلاق کی اعلیٰ اور صالح اقدار کا فروغ وبقا، ابلاغ وترسیل بھی شاعر اور ادیب کے اہم فریضوں میں شامل ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''عکسِ وحدت و رسالت'' کے مصنف عمران عظیم مقبول ومعروف شاعر اور ادیب ہیں ان کی شاعری اور تنقیدی مضامین کے نصف درجن سے زیادہ مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے وہ ایک کامیاب وکیل ہیں اور پٹیالہ ہاؤس کورٹ نئی دلّی میں قانونی پریکٹس کر رہے ہیں۔آپ ممتاز اور پختہ مشق شاعر سعید احمد نیّر گنگوہی کے فرزند ارجمند ہیں اور ایسے علمی و دینی خاندان کے چشم و چراغ ہیں جس کا رشتہ کتاب اور سنت سے استوار ہے۔لہٰذا انہوں نے اپنے توشۂ آخرت میں کچھ جوڑنے کے ساتھ ساتھ اہلِ ایماں کے سرمایۂ عقیدت وارادت میں اضافہ کے لئے اللہ تعالیٰ کے صفاتی اسما کو رسولِ اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے صفاتی ناموں کو ان کے مفاہیم کے ساتھ کمال سلیقے اور نفاست سے سلیس اردو کے شعری پیکر میں ایک گلدستہ کی صورت میں نذرِ قارئین کیا ہے۔اس کارِ فیض کے لیے انہوں نے دوہا کی عام فہم اور غنائیت سے لبریز صنفِ سخن سے کام لیا ہے جو خالص ہندوستانی صنفِ شاعری ہے اور صدیوں سے ہندوستانی شعرا کا وسیلۂ اظہار رہی ہے۔جن میں مہاکوی تلسی، ملک محمد جائسی، سورداس، کبیر، رس کھان اور رحیم خانخاناں کے اسمائے مبارک نمایاں ہیں اور یہ صنف آج اُسی احترام واشتیاق سے اردو شعرا کا وسیلۂ ابلاغ بن رہی ہے، جس سے اردو فارسی شاعری کی صنفِ غزل کا جادو آج ہندی کے کویوں کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

خدائے تعالیٰ رحیم بھی اور غفور بھی، رؤف بھی اور کریم بھی، قدیر بھی ہے اور علیم بھی، وہ ذاتِ واحد حلیم بھی ہے، رزاق بھی اور قسیم بھی۔ان گنت ہیں اُس کی صفات اور اس کے القاب وخطاب۔اللہ کے ۱۰۸ صفاتی ناموں کو عمران عظیم نے کس عقیدت و عجز و نیاز کے ساتھ بیان کیا ہے چند مثالوں میں ملاحظہ کیجیے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام ہے ''حکمہ'' اسے دوہے میں شاعر کیسے وضاحت کے ساتھ سلیس الفاظ میں بیان میں لایا ہے:

حکمہ ہے ذات خدا خلقت ہے محکوم
بندھے ہیں اس کے ضبط میں مہر و ماہ و نجوم

مولیٰ کی خطا بخشی، عفو و درگزر ایک مثبت اور حوصلہ بخش وصف ہے، آخرت میں بھی خدا یعنی مادّی زندگی کے بعد اپنے بندوں کی فروگزاشتیں اور افزاشیں معاف فرما کر اپنے قرب میں جگہ عنایت فرمائے گا۔عمران کے دوہے میں صفاتی نام ''عفُو'' کا بکھان دیکھئے اور ''محیی'' اور ''صبور'' کا بھی۔

عاصی کو بھی بخش دے عفو ہے وہ رحمان
دل سے گر توبہ کرے گنہ گار انسان

رب ہے مُحیی، موت کے منہ سے سکے نکال
چاہے تو مُردے کی بھی سانسیں کرے بحال

صبر و تحمل کے سبب اُسکا نام صبور
غصّہ لالچ ہے مرے رب کو نامنظور

کلمۂ مقدس میں لفظ لا الٰہ سے اللہ کے جلالِ جبروتی اور ہیبت کا اظہار مقصود ہے تو رحمٰن رحیم سے یہ ترغیب کہ بندہ کو خدا تعالیٰ سے خوف وامید دونوں رکھ کر خالص دل سے خالق کی محبتِ فطری کو دل میں رکھنا ہے اور درجہ بدرجہ ترقی کر کے عشق ومحویت کے مقام پر پہنچنا ہے۔

کلمۂ مبارک میں رسول اللہؐ کا نام بھی شامل کیا گیا ہے۔''اللہ کے تصوّر کے ساتھ محمدؐ صاحب کا تصوّر بھی ہمارے دل کے سامنے آجاتا ہے۔''۔ پھر توحید کہاں رہی؟ (کتاب مصابیح الاسلام، مصنفہ گنگا پرشار اُپادھیائے، ص ۲۷۷) اسلامیات اور اُم الکتاب قرآن مجید کے عقیدت مند محقق اور عالم مالک رام کے مطابق ''یہ اعتراض بہت لوگوں نے کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس اعتراض کی بنیاد ہی غلط اور قلتِ تدّبر کا نتیجہ ہے۔کلمہ خدا یا رسولؐ کو سنانے کے لیے نہیں پڑھا جاتا بلکہ یہ تو اپنے ایمان کا اعلان ہے۔کلمہ جزو عبادت نہیں ہے بلکہ یہ صرف پڑھنے والے کی اعتقادی کیفیت اور جماعتی تعلق کی شہادت ہے۔ جب کوئی آدمی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتا ہے تو اس بات کا اشتہار دے رہا ہے کہ میں آج سے خدا کے سوا کسی اور معبود کی عبادت نہیں کروں

گا یہاں تک کہ محمد کی بھی نہیں کیونکہ وہ بھی صرف اس کے رسول ہیں نہ کہ معبود۔ یہ توعین توحید پر ایمان اور ایقان کا اعلان ہے۔ اس میں شرک کہاں سے آ گیا؟ پس اسلامی کلمہ کا مقصد یہ تھا کہ کہیں مسلمان بھی امم سابقہ کی طرح اپنے نبی کو معبود نہ بنالیں۔ معاذ اللہ! یہ گویا توحیدِ خالص کا اعلان ہے''۔

انجمن ترقی اردو ہند کے پرچہ ''ہماری زبان'' میں اس امر متنازعہ پر طویل بحث چھڑی ہے کہ مالک رام نے اسلام قبول کرلیا تھا۔

طلوع اسلام سے لے کر آج تک ادبا و شعرا نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰؐ کی توصیف میں رطب اللساں رہے ہیں۔ بقول جذب

شان و عظمت وحدت محمد الرسول اللہ
کائنات کی عظمت ، محمد الرسول اللہ
کیوں کسی کے دل کو ہو اُن کے در سے ناکامی
سب کے واسطے رحمت محمد الرسول اللہ

لہٰذا حمدِ رب العالمین کے بعد حضورؐ سرکار مدینہ کی صفاتِ مبارکہ کے اعتراف میں صلوٰۃ وسلام ونعت میں بہت کچھ کیا گیا ہے۔ فارسی شاعر عقیدتاً کہتا ہے:

ہزار بار بشویم دہن زمشکِ گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبی ست

وہی حضور جن کے حق میں ''وما ارسلنک الّا رحمتہ اللعالمین'' کی آیت نازل فرما کر خود اللہ تعالیٰ نے گویا سب سے پہلی نعت ارشاد فرمائی۔ مرزا غالبؔ بھی فارسی شاعر کے ہم نوا ہو کر فرماتے ہیں:

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

لہٰذا عمران عظیم بھی حضورؐ کی دعوت وسیرت ہی کو انسانیت اور امتِ توحید کے لیے ایک پائیدار اور دستور العمل مانتے ہیں۔ نبی مکرمؐ کے اسوۂ افضل واعلیٰ، ان کی صفات، برکات اور کمالات کا بیان ان کے لیے ایک فریضۂ منصبی اور کارِ ثواب ہے جس کی تکمیل وتعمیل انہوں نے حد درجہ عقیدت سے تمام فنی لوازمات کو بروئے کار لاتے ہوئے ان دوہوں میں کی ہے۔ حضورؐ کے صفاتی ناموں کو سلیس اور عام فہم زبان ومحاورہ میں ڈھال کر ان کے مفہوم اور عظمت کے ساتھ منسلک کر کے بیان کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔ جیسے ''مبین''، ''ماح'' ''مصری'' کے تشریحی روپ کو کیسے دوہے کے قالب میں سمویا گیا ہے:

چندا سورج سے سوا میرے نبیؐ مبین
اُن کے اُسوہ کو بنا جیون کا آئین

ماح نیک وزشت سے کریں ہمیں آگاہ
اپنائیں ہرگز نہ ہم راہِ کذب وگناہ

مصری اقدس نبیؐ کا تھا کیا انصاف
توبہ کی عاصی نے تو اُسکو کیا معاف

عمران عظیم کی یہ مخلصانہ اور نیاز مندانہ تخلیقی کاوش ایک اجتہاد بھی ہے اور اردو شاعری کی صالح اور صحت مند روایات کو برقرار رکھنے اور آگے بڑھانے کا عمل بھی۔ یہ ''زاہدِ تنگ نظر'' کی تبلیغی لفاظی اور گرم گفتاری نہیں بلکہ مومنوں کے دلوں میں جذبۂ نیاز وسپردگی، عشقِ خدا ورسول کو بیدار تر کرنے کی سعی احسن ہے۔ عمران مذہبی ہے، متعصب نہیں۔ ان کے خاندان کے ساتھ مجھ ناچیز کے نصف صدی کے مراسم اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ دین رسولؐ کے ساتھ مستحکم وابستگی کے ہم دوش قوم پرستی، وطن پرستی، مذاہب کی تعظیم، قومی یک جہتی اور بھائی چارہ ان کا شیوہ رہا ہے۔

عزیزم عمران عظیم کی اس تبرک مآب پیشکش کا منشا ومقصد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور محبوب کبریاؐ کے ان صفاتی ناموں کی تقدیس وعظمت، جذب واثر قاری کے ذہن پر سلاست سے واضح ہو سکے اور ان کے معانی ومفاہیم کی تفہیم کے لیے اسے کسی ذہنی جمناسٹک سے نہ گزرنا پڑے۔

یہ فقیر حقیر تہ دل سے دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ اور محبوبِ خدا رسول اکرمؐ کی بارگاہ میں پیش کیا گیا عزیزم عمران عظیم کا یہ ہدیۂ نیاز قبول ومستجاب ہو اور پروردگار انہیں اس کے اجر وثواب، رحمت وبرکات سے نوازے! آمین!

○

شباب للت اردو کے جانے پہچانے اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ زیر نظر مجموعے سے پہلے موصوف کے چھ مجموعے اردو میں اور ہندی میں شائع ہو کر خواص وعوام سے شرفِ قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اور ہما چل زبان کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ مجموعوں کی تعداد سے شباب صاحب کی زود گوئی کا اندازہ تو ہوتا ہے لیکن یہ بڑی بات ہے کہ اس کے باوصف ان کے کلام میں آورد نہیں ہے۔ اپنے پہلے مجموعے ''مضراب'' سے لے کر ''دائروں کا سفر'' تک شباب صاحب نے طویل تخلیقی سفر طے کیا ہے اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ ان کے اسلوب اور طرزِ ادا میں بھی تبدیلیاں واقعی ہوئی ہیں۔ لیکن ہر طور ان میں کلاسیکی رچاؤ بھی ضرور ہے۔ نئے لب ولہجے کا رکھ رکھاؤ اور سلیقہ بھی ان کے یہاں نئے اور کھردرے خیالات بھی ایک خاص نغمگی اور لَے کے ساتھ اظہار فرماتے ہیں۔

رزاق ارشد (بھارت)

ظرافت اور صحت معاشرہ

ڈاکٹر شباب للت

انسان کو خدائے تبارک وتعالیٰ نے اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا ہے۔ اسے حیوانِ ناطق کہا جاتا ہے کہ یہ کوئی نہ کوئی زبان بولی یا بھاشا بول کر اپنے منشائے دِلی اور ضروریات کا اظہار کرسکتا ہے۔ دوسرے انسانوں سے گفتگو کرسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اسے حیوانِ ظریف بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ ہنس سکتا ہے، مسکرا سکتا ہے۔ تازہ ترین ریسرچ نے تو یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ چمپنیز (بن مانس) بھی باہم مذاق کرتے اور ہنستے ہیں۔ انسان حیوانِ ظریف ہے تو کچھ دیر مذاق وتفنن ہنسی، قہقہہ، تبسم، لفظی چھیڑ چھاڑ، چُہل، جملہ کشی، لطیفہ گوئی اسے غم و کرب سے نجات ہی نہیں دیتے بلکہ تکالیف ومصائب سے نبرد آزما ہونے کے لیے تازگی، ولولہ، فرحت، حوصلہ، جوشِ عمل عطا کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ

ہر مصیبت کا دیا ایک تبسم سے جواب
اس طرح گردشِ دوراں کو بھلایا میں نے

ہنسنا ہنسانا انسان کی ذہنی تکان اور علالت کا علاج ہے بلکہ اہلِ نظر کا کہنا ہے

بے آب آئینے کو اُٹھاتا نہیں کوئی
روتے ہوؤں سے آنکھ ملاتا نہیں کوئی

حسنِ اتفاق سے اُردو کی ظرافت اور مزاح کا نظم ونثر دونوں اصناف میں شری گنیش ایک ایسے قلم کار سے ہوا جو ابتدا میں بہت مشکل گو، فارسیت زدہ اور فلسفیانہ شعور کا حامل تھا۔ اگرچہ مزاح کا ہلکا پھلکا رنگ امیر خسرو کی شعری کاوشوں میں بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے، اور بعد میں جعفر زٹلی کی ''زٹلیات'' انشا کی ریختی، سودا کی ہجو میں بھی نمایاں ہے، لیکن اس کا شائستہ شوخ اور رنگین اظہار موصوف قلم کار مرزا غالب کے خطوط اور غزلیہ اشعار میں قاری کو دعوتِ تبسم دیتا ہے۔ آج بھی اردو ادب کی اس عظیم شخصیت کا میدانِ ادب میں بین الاقوامی سطح پر لوہا مانا جاتا ہے۔ کلامِ غالب کے تراجم دنیا کی مختلف بھاشاؤں میں ہو چکے ہیں۔ غالب نے شاعری اور خطوط میں اپنی بذلہ سنجی اور خوش طبعی سے تبسم وتفریح کے دلآرا گلزار کھلائے ہیں۔ غالب خود پر بھی تمسخر کے وار کرسکتا ہے اپنے محبوب دلربا وگلفام حسینوں پر بھی۔ وہ کٹھ ملاؤں اور مذہب کی غلط تاویل کرنے والے، گندم نما جَو فروش پارساؤں سے بھی ٹھٹھول کرتا ہے اور اُن کے اصل چہروں سے نقاب اُٹھاتا ہے۔ دیکھئے چند اشعارِ غالب:

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

رات پی زمزم پہ مَے اور صبحدم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

غالب معاشرے اور دنیائے حسیناں کا تماشہ بیں سہی لیکن وہ خود بھی تماشا بننے کا اور اپنا ہی مذاق اڑانے کا ظرف بھی رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

غالب جب گلفام پری چہرہ غزالوں سے دل لگی فرماتے ہیں تو کیا کیا گُل کھلاتے ہیں دیکھئے:

غنچۂ نا شگفتہ کو دُور سے مت دکھا کے یُوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یُوں

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

اُنیسویں صدی کے ظرافت نگار شعرا ریختی واسوخت، غزل، ہزل، ہجو، کہہ مُکرنی، صوتی تکرار وغیرہ کے ذریعہ شیخ وواعظ، محتسب، برہمن، اُپدیشک، ناصح وپارسا کے لتّے لیتے تھے یا اپنے ادبی حریفوں کے۔ یا وہ اپنے محبوب سے مزاحیہ چھیڑ چھاڑ کو موضوع بناتے تھے۔ بیسویں صدی میں خطوط، خاکہ نگاری، نظم، مزاحیہ کالم نگاری، صحافت اور کارٹون نے ماضی کی روایاتِ سخن کی جگہ لے لی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی مشرقی تہذیب کے رکھوالے تھے۔ دینی اور سماجی

روایاتِ قدیم کے علم بردار۔ اُنہوں نے انگریزی تعلیم، تہذیب وتمدن پر اپنی شاعری میں جی کھول کر طنزیہ تبصرہ آرائی کی۔ انہوں نے شیخ برہمن کی دقیانوسیت اور باہمی سرپھٹول کو بھی موضوعِ تمسخر بنایا۔ جیسے اُن اشعار میں:

ہوئے اسقدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال
خفیہ پولس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اُجالے میں چُوکتا بھی نہیں

شیخ اپنی رگ کو کیا کریں ریشے کا کیا کریں
مذہب کے جھگڑے چھوڑیں تو پیشے کا کیا کریں

دورِ حاضر کے شعرا میں یوں تو بیسیوں شعرائے اُردو نے طنز ومزاح کو اپنا موضوعِ تخلیق بنایا۔ رفتگان میں حاجی لقلق، بوم میرٹھی، چرکیں، عُریاں، فکر تونسوی، دلاور فگار، ہری چند اختر وغیرہ نمائندہ شعرا رہے۔ شاد عارفی، شہباز امروہوی، سید ضمیر جعفری، راجہ مہدی علی خاں، اُستاد رام پوری، ہلال رضوی، محمد جعفری وغیرہ نے اس رنگِ سخن میں اپنی خوب پہچان بنائی۔ آج کا مزاح نگار کہیں الفاظ کی نشست وبرخاست، کہیں الفاظ کے صوتی تکرار، ذومعنیت، ہجو ملیح اور طنز واستہزا سے اور کہیں اساتذہ کے اشعار کی پیروڈی کر کے اپنی شعری تخلیقات میں مزاح کا بھرپور رنگ بھرتا ہے۔ کہیں محاورات وضرب الامثال میں تحریف کر کے یا الفاظ کی ترتیب بدل کر۔ اب طنز ومزاح کے نئے موضوعات، حالاتِ حاضرہ، سماجی مسائل، سیاسی ماحول، معاشرے کی بدعتیں، عوامی مسائل، کردار اور چلن کی کمزوریاں، مکروفریب وغیرہ بن گئے ہیں۔ شاعر کی آج کے معاشی اور اخلاقی مسائل پر بھی تیکھی نظر ہے۔ شاد عارفی فرماتے ہیں:

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھِری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

ہندوپاک کے سیاسی ماحول کا کیا نقشہ کھینچا ہے اُنہوں نے اپنی اس غزل میں:

اینٹ کی خاطر مسجد ڈھادی ہم نے بات کہاں پہنچادی
شیخ و برہمن دونوں ننگے پردے کی دیوار گرادی
سلجھانے کی بات بنا کر داڑھی چوٹی میں اُلجھا دی
ہمسایوں کو ذہن میں رکھ کر اپنے گھر میں آگ لگا دی
اُس نے جب سو تیر چلائے میں نے ایک غزل چپکا دی

جوشؔ ملیح آبادی کے ہاں بھی ضمنی طور پر مزاح کا رنگ ملتا ہے۔ ایک رباعی دیکھئے شراب کے مخالفوں کے لیے:

کیا شیخ ملے گا لن ترانی کر کے
توہینِ مزاجِ زندگانی کر کے
تُو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے اُنہیں
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

ہر چند اختؔر بھی مذہب کے بزعم خود مبصروں اور ٹھیکے داروں کی حقیقت کو مزاحیہ انداز میں یوں منکشف کرتے ہیں۔

ملے گی شیخ کو جنّت مجھے دوزخ عطا ہوگا
بس اتنی بات ہے جس کے لیے محشر بپا ہوگا
سکونِ مستقل، دِل بے تمنا، شیخ کی صحبت
یہ جنّت ہے تو اس جنت سے دوزخ کیا بُرا ہوگا

با ادب رِندو کہ میخانے میں آج
شیخ صاحب کی سواری آئیگی
نیک بندے ہر بُرائی کر چکے
اب گنہ گاروں کی باری آئیگی

ہندوستانِ عظمت نشان کی تقسیم کے بعد دو آزاد پڑوسی ملکوں ہندو پاکستان کی سیاست میں جو خودغرضی مفاد پرستی اور عوام کی خدمت کے نام پر عوام کے بجٹ کے بے رحمانہ لوٹ کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں اُن پر صحرائی سانبھری نے مولانا حالؔی سے معذرت کے ساتھ اُن کی مشہور تصنیف ''مسدّسِ حالی'' پر پیروڈی لکھی ہے جس کا عنوان ہے ''مسدّس بدحالی'' اس کے دو تین بند ملاحظہ کیجیے:

یہ کھدّر کے لیڈر یہ ٹاٹوں کے لیڈر
وظیفوں کے لیڈر الاٹوں کے لیڈر
الیکشن کے رسیا، پلاٹوں کے لیڈر
وزارت کے رنگین ٹھاٹوں کے لیڈر
یہ ماہر ہیں اس درجہ اپنے ہنر میں
غمِ قوم کھاتے ہیں ہر شب ڈِنر میں
کہیں ہے وزارت بنانے پہ جھگڑا
قیادت سے چونچیں لڑانے پہ جھگڑا
کہیں بینک بیلنس بڑھانے پہ جھگڑا

الیکشن کا قرضہ چُکانے پہ جھگڑا
یہ مرتے ہیں عہدوں پہ قربان ہوکر
یہ جیتے ہیں دست و گریبان ہو کر

کبھی قومی اور معاشی مسائل کو سامنے رکھ کر شاعر حاکم ومحکوم دونوں کو اپنے فرائض کا احساس کرانے کے لیے ملک وقوم کو پستی سے نکالنے کے لیے ظریفانہ رنگ میں دعوتِ اصلاح وعمل دیتا ہے۔ دیکھئے سید ضمیر جعفری کیا فرماتے ہیں غزل میں:

شوق سے لختِ جگر نورِ نظر پیدا کرو
ظالمو! تھوڑی سی گندم بھی مگر پیدا کرو
ارتقا تہذیب کا یہ ہے کہ پھولوں کی جگہ
کیاریوں میں پیاز، گملوں میں مٹر پیدا کرو
شیخ مُلّا محتسب ناصح، کہو کس کی سُنیں
یارو کوئی ایک مردِ معتبر پیدا کرو

کبھی شاعر حقیقی مسائل پر ظریفانہ تبصرے کرتا ہے تو کبھی اپنے خیالی اور تصوراتی نظام سے کوئی کردار، کوئی واقعہ کوئی عجوبہ گھڑ کر کوئی مفید پیغام ظریفانہ پیرائے میں دے جاتا ہے۔

ضمیر جعفری ''عورتوں کی اسمبلی اور وزارت'' پر اپنی طویل نظم میں کیا گُل فشانیاں کرتے ہیں اُن کے چند مصرعے دیکھئے، اسمبلی کا منظر ملاحظہ فرمایئے:

مسائل پہ یوں گرم گفتار ہیں یہ
کہ بس لڑنے مرنے کو تیار ہیں یہ
فسوں کار ہیں سب طرحدار ہیں یہ
برابر برابر کی سرکار ہیں یہ

نہ یہ سُن رہی ہے نہ وہ سُن رہی ہے
یہ دل بُن رہی ہے وہ جاں بُن رہی ہے

کہیں شاعر ہجو ملیح کے ذریعے سامنے کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر فرسودہ رسم و رواج گھسی پٹی سوچ اور عقائد پر اظہار خیال کرتے ہوئے تلخ حقیقتوں کو ظرافت کی چاشنی لگاتا ہے۔ اُستاد رام پوری کا قطعہ ملاحظہ ہو۔

زمینی حور کوئی چُست ملبوسات میں نکلے
اُسے جائز کبھی تہذیب کے بانی نہیں کہتے
اگر بازار میں ننگے کھڑے ہوں کوئی سادھو جی
اُسے روحانیت کہتے ہیں عریانی نہیں کہتے

کبھی شاعر پیروڈی سے کام لے کر یا اساتذہ کے یا اپنے سنجیدہ اشعار کے آخر میں ٹیپ کا مصرع لگا کر مزاح پیدا کرتا ہے اور محفلِ سخن کا رنگ یکا یک بدل دیتا ہے۔ اثر امروہوی فرمارہے ہیں۔

پھٹے دامن کا اِک اِک تار بیٹھا سی رہا ہوں میں
معاذ اللہ کتنی مشکلوں میں جی رہا ہوں میں
ستارے ڈوبتے جاتے ہیں بیڑی پی رہا ہوں میں

پرچم امروہوی اپنے انداز میں خود کو تمسخر کا ہدف بناتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

کہتے رہو چُراتا ہے مسجد سے جوتیاں
میں تو نماز پڑھنے کو جاؤں گا، روک لو
جتنا کہو گے میرا ترنّم خراب ہے
اُتنا ہی چیخ چیخ کے گاؤں گا، روک لو

درجِ بالا قطعہ سے روشن ہے کہ دنیائے ادب اور اُس کے آداب و انداز بھی ظرافت نگاروں کی زد سے محفوظ نہیں رہتے۔ اس طرح کے خالص ادبی طنزیہ محاکے دیکھنے ہوں تو نظم ''شاعر نما ابن الوقت'' کے ایک دو بند دیکھئے، یہ نظم اظہار ملیح آبادی کی تخلیق ہے۔

شعر یہ کہتے ہیں بس محفل میں گانے کے لیے
اپنی کم بینی و کم فہمی چھپانے کے لیے
احمقوں کے قلب پر سکّہ بٹھانے کے لیے
چار پیسے اہلِ دولت سے کمانے کے لیے

قافیوں کے یہ پجاری یہ ردیفوں کے غلام
علم سے آتش بجاں ہیں جہل سے ہیں شادکام
تال وسُر کی وادیوں میں ڈالتے ہیں یہ خیام
جو ادب میں ہے روا اِن کی شعریت میں حرام

ہاں نظر کچھ ہلکی موسیقی پہ ان کی ہے وسیع
کوئی ہے ان میں مکیش اور کوئی ہے ان میں رفیع

حصولِ رزق کے لیے یہ کھوٹا سکّہ اگر چل جائے تو وارے نیارے۔ بڑھتی بیکاری بھی وطنِ عزیز میں ایک تشویش ناک مسئلہ ہے۔ دیکھئے خنجر بریلوی اس کی نمبیھر تاکس انداز میں بیان کرتے ہیں:

بُلا کے علم کی بابت جو پوچھا خنجر سے
تو چیئرمین سے بولے کہ بی اے بی ٹی ہوں
کہا ذریعۂ روٹی؟ تو مسکرا کے کہا
غمِ حیات کے جنکشن پہ ہیڈ ٹی ٹی ہوں

جیسا اُوپر عرض کیا جاچکا ہے ادبی دُنیا پر بھی شاعر پھبتی کسنے سے نہیں چُوکتے۔ خالص ادبی مزاح کی یہ تصویر دیکھئے دلاور فگار کی نظم ''شاعرِ اعظم'' کے چند منتخب مصرعوں میں:

''چہارسُو''

کل اِک ادیب و شاعر و ناقد ملے ہمیں
کہنے لگے کہ آؤ ذرا بحث ہی کریں
کرنے لگے یہ بحث کہ اب ہندو پاک میں
وہ کون ہے کہ شاعرِ اعظم جسے کہیں
میں نے کہا جگرؔ تو کہا ڈیڈ ہو چکے
میں نے کہا جوشؔ، کہا قدر کھو چکے
میں نے کہا فراقؔ کی عظمت پہ تذکرا
بولے فراقؔ شاعرِ اعظم؟ اڑا را؟
میں نے کہا ساحرؔ و مجروحؔ و جاں نثارؔ
بولے کہ شاعروں میں نہ کیجیے اُنہیں شمار

اگرچہ دلاورؔ فگار مرحوم کی بیشتر نظمیں اپنی جگہ شاہکار ہیں، لیکن اس نظم میں جہاں نقادوں کی کج بحثی اور پُرغرور ذہنیت پر چوٹ کی ہے، وہاں انہوں نے خود کو بھی معاف نہیں کیا۔ ویسے ہمارے یہاں ایسے ایسے نقاد بھ موجود ہیں جو کتاب کو پڑھے بغیر اُس پر تبصرہ کر دیتے ہیں یا اُس کا فلیپ میٹر لکھی دیتے ہیں۔ نظم کے آخری دو تین شعر ملاحظہ کیجیے:

میں نے کہا یہ جو دلاور فگار ہیں
بولے کہ وہ تو طنز و ظرافت نگار ہیں
میں نے کہا کہ طنز میں اِک بات بھی تو ہے
بولے کہ اُسکے ساتھ خرافات بھی تو ہے
میں نے کہا تو کس کو میں شاعر بڑا کہوں؟
کہنے لگے کہ مجھ کو بھی حیرت ہے کیا ہوں

یہ محض چند نمونے ہیں۔ اُردو شاعری میں ظرافت کے دفتر کے دفتر لکھے گئے ہیں کہ مزاحیہ ادب کچھ لمحوں کے لیے انسان کے مزاج سے کبیدگی، ناخوشی، شکستہ دلی اور رنجیدگی کی پرچھائیوں کو ہوا میں معدوم کر دیتا ہے اور اُس کی ذہنی صحت و تازگی کو بحال کر دیتا ہے۔ معاشرے اور سیاست کے غلط روّیوں، زیادتیوں اور ناانصافیوں میں اصلاح کے امکانات فراہم کرتا ہے۔ اس میں پوشیدہ مقصدیت جادو کا سا اثر رکھتی ہے۔ سماجی اور سیاسی بدعنوانیوں پر احساسِ ندامت و عبرت پیدا کر کے تنقید و تزکیہ و ترمیم کے سامان فراہم کرتا ہے۔

''ستاروں پہ کمند''

۴ر مارچ ۲۰۱۳ء کی شام برکلن کی میڈیکل سوسائٹی نے ''یومِ معالجاں'' منایا جس میں پیشۂ طب کی خدمات کو سراہا گیا۔ برکلن ہسپتال اور اس کے میڈیکل سٹاف کی شمولیت اور ایک کشمیری نژاد پاکستانی ڈاکٹر عبدالرحمٰن کو سوسائٹی کی جانب سے دو اعزازات سے نوازا گیا جو اس میڈیکل سوسائٹی کی تاریخ میں پہلی ایسی مثال ہے۔ چیف میڈیکل آفیسر گیری سٹون نے اپنے تعارفی جملوں میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن کے بارے میں بتایا کہ وہ گزشتہ چالیس برس سے اس ہسپتال سے (بحیثیتِ ماہر امراض خون اور کینسر) منسلک ہیں اور ان کی کارکردگی نہایت مثالی ہے۔ کئی برسوں سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن میں ہمارے ہسپتال کے میڈیکل سٹاف کی نمائندگی کر رہے ہیں اور اندرونِ ہسپتال وہ مختلف حیثیتوں سے اپنی خدمات پیش کرتے آئے ہیں۔ آج کل وہ میڈیکل بورڈ کے چیئرمین اور پروفیشنل سٹاف ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔ اس حیثیت سے وہ ہسپتال کے ٹرسٹی ہونے کے باعث شہریوں کے طبی معاملات اور ضروریات کے ترجمان بھی ہیں۔ اس پیشہ اور علاقہ میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن کی خدمات چار دہائیوں پر محیط ہیں اور ان کا اعتراف ہمارا فرض ہے۔

میڈیکل سوسائٹی کے منتخب صدر ایڈالف مائیر نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن کو ''محسنِ انسانیت'' کا ایوارڈ پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایوارڈ ہماری سوسائٹی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ دیا جا رہا ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ اس کے لیے ہمیں ڈاکٹر عبدالرحمٰن جیسا معزز ڈاکٹر میسر آیا ہے۔ یہ اعزاز انہیں صرف ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک ہمدرد اور مکمل انسان ہونے کی حیثیت سے دیا جا رہا ہے۔ یہ ڈاکٹر بھی ہیں اور ڈاکٹروں کے استاد بھی۔ اس کے علاوہ یہ ایک مذہبی شخصیت بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، سماجی کارکن بھی ہیں، رضا کار بھی ہیں اور خدمتِ خلق میں بھی پیش پیش ہیں۔ انہیں اپنی کمیونٹی میں عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور یہ مختلف مذاہب کے لوگوں میں باہمی تعاون اور ہم آہنگی کا کام بھی اپنی نئی تنظیم کے تحت کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس تنظیم کے پہلے اجلاس میں ایک یہودی نمائندے کی حیثیت سے ناساکا لیسیم میں موجود تھے جہاں مختلف مذاہب کے لوگوں کو مدعو کر کے امنِ انسانیت کی بات کی گئی تھی۔ میڈیکل سوسائٹی کی موجودہ صدر محترمہ لیزا اینگ نے ایوارڈ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالرحمٰن کے بارے میں مزید کہا کہ یہ پہلے ایشیائی ڈاکٹر تھے جو ۱۹۹۱ء میں ہماری میڈیکل سوسائٹی کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ ہمارے پیشے میں اور ہماری تاریخ میں انہوں نے کئی ایسے نقوش چھوڑے ہیں جن پر کاربند ہو کر ہم کامیاب ہو رہے ہیں اور جو پائندہ رہیں گے۔ ان دو ایوارڈوں کے علاوہ اس تقریب میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن کو ریاستِ نیویارک اور امریکی کانگرس کے منتخب عہدیداروں کی جانب سے سات اعزازی سرٹیفکیٹ (پراکلامیشنز) بھی پیش کیے گئے۔

صاعقہ مقبول (اسلام آباد)

شکریہ میرے مہرباں!!

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

قریب قریب ہر روز جولیاوارڈ اپنی عیادت اور مزاج پرسی کے لئے آنے والوں کو طرح طرح کے دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کرتی کہ یہ جو اس نے مرنے کا فیصلہ کیا ہے وہ درست ہی نہیں، باجواز ہی نہیں، بلکہ نظریہء ضرورت کے عین مطابق ہے۔ان دلائل کی تعداد میں روز بروز اضافہ جاری تھا۔ آج تک جتنے دلائل اس نے آزمالئے ان کی تعداد سو تک تو پہنچ گئی ہوگی۔لیکن کبھی ملنے والوں یا قرابت داروں نے اس کی کسی بھی دلیل کو تسلیم کرنا تو درکنار توجہ سے کان دھرنے کے لائق بھی نہیں مانا جیسے ہی وہ بات شروع کرتی لوگ اس کے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر اس کا منہ بند کر دیتے تھے یا اپنے کانوں میں انگلیاں ڈالنے لگتے۔

ادھر جولیاروز بروز اپنے اس ارادے میں اٹل ہوتی جاتی کہ اسے جلد از جلد عدالت سے رجوع کر کے خودکشی کرنے کی قانونی اجازت حاصل کرنی چاہیے۔اس کا مذہب خودکشی کی اجازت نہیں دیتا تھا۔اس نے چند ایک پادریوں سے اچھی طرح بحث مباحثہ کر لیا تھا۔اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ دوسرے مذاہب کا موقف بھی خودکشی کے معاملے میں ایسا ہی ہے۔

جب اس نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کا خیال کیا تو اس کی ایک دوست نے ہنستے ہوئے کہا''جولی!ایسا لگتا ہے تمہیں کہیں سے کوئی فالتو رقم مل گئی ہے اور تم اس کو فضول خرچ کرنا چاہتی ہو۔اگر واقعی ایسا ہے تو تم مجھ مسکین کو عیش کرادو۔''

''ایملی میری جان،کیسی فالتو رقم،کیسی فضول خرچی،اب تو یہی وِش کرو کہ عدالت میری درخواست مان لے۔'' اتنا کہہ کر جولی کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا اور وہ آواز سے رونے لگی۔ایملی بھی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور اس نے جولی کے چہرے کو اپنے آنسوؤں سے دھو دیا۔کچھ وقت ان دو جسموں نے ایک دوسرے کو یگانگت کی سرشاری میں ڈبویا پھر جدا ہو گئے۔ایملی اپنی دنیا میں لوٹ گئی اور جولی اپنے بیمار جسم کے زنداں میں۔

ڈاکٹر ہی نہیں خود جولی بھی جانتی تھی کہ اس کا مرض اے ایل ایس لا علاج ہی نہیں ترقی پذیر بھی ہے۔وہ اس کے جسم کے اندر اور باہر کو مغلوب، بے جان اور بے حس کرتا ہوا آہستہ آہستہ نیچے سے اوپر کی جانب رینگ رہا ہے۔اس جسم کے ساتھ وہ گھنٹوں اکیلی پڑی رہتی۔اس کے پیارے اس سے دور ہوتے جا رہے تھے۔لیکن اس کا جسم اسے چھوڑنے پر مائل ہی نہیں ہوتا تھا۔جولیا اور اس کے جسم میں بہت پرانا اور مضبوط یارانہ تھا دونوں ایک دوسرے کے ہر اچھے اور برے راز سے واقف تھے اور پردہ دار بھی۔لوگ دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔جولیا نے دنیا کو اپنے بدن سے دیکھا، چھوا، چکھا، سونگھا اور محسوس کیا تھا۔ بیماری کی گرفت میں آنے سے قبل وہ بدن ہی تو تھی۔اسکول کی نمبرون ایتھلیٹ، والی بال کی سب سے اچھی کھلاڑی اور ٹیم کی کپتان۔کالج اور یونیورسٹی کی مایہ ناز کھلاڑی اور کلر ہولڈر جیتے ہوئے کپوں اور ٹرافیوں سے اس کا کمرہ بھرا ہوا تھا۔ اس کے بدن نے اس کو فخر و امتیاز کی بلندیوں تک پہنچایا تھا۔اچھی ایتھلیٹ اور کھلاڑی لڑکیوں کے بدن اکثر مردوں جیسے ہونے لگتے ہیں لیکن کیوبک کی اس قاتلہ کے بدن نے ایسا نہیں کیا اس کا ایک ایک عضو، ایک ایک رواں، عورت ہونے کا ثبوت دینے کے ہر مرحلے پر بھی نمبرون رہا۔لذت لینے میں بھی اور لذت دینے میں بھی۔جولیا نے اپنے ناف سے نیچے والے بدن کا خیال کر کے ایک پھیکی ہنسی کو اپنے لبوں سے گالوں تک پھیلتے محسوس کیا اور اس طرح اپنے آپ پر طنزیہ خود ترسی کرتے ہوئے اپنے بالائی بدن کو برہنہ کر کے اپنی ہتھیلیوں سے محسوس کرنے لگی۔اس کا پیٹ ابھی تک چپٹا تھا اس کی جلد زندہ اور ملائم تھی کمر پتلی تھی۔گدگدانے پر اس کی کمر جواب بھی دیتی تھی۔کمر سے پیٹ، پیٹ سے پسلیوں اور پسلیوں سے سینے تک جاتے جاتے اس کی ہتھیلیاں اس کے شاندار بدن کے لمس کا ذائقہ لیتی ہوئی اوپر سفر کرتی رہیں پھر اچانک اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔اور اس غنودگی میں ملفوف حالت میں اس نے اپنے بالائی جسم سے کہا۔

''مجھے خوش فہمی کے جال میں نہ پھنساؤ میں جانتی ہوں تم مرنا نہیں چاہتے۔تمہیں اچھی طرح معلوم ہوگا تمہارا نچلا حصہ جیتے جی مر چکا ہے۔''

''جولیا ڈیئر تم صحیح کہتی ہو میرا آدھا نچلا ساتھی بیماری کے آگے ہتھیار ڈال چکا ہے۔بیماری کسی انتہائی عیار دشمن کی طرح اپنے بے آواز قدموں کے ساتھ اس کو انچ انچ فتح کر چکی ہے۔لیکن یہ جو تم کہتی ہو میرا نچلا بدن مر چکا ہے میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔اعضا کا سن ہو جانا، از خود حرکت کے لائق نہ ہونا بیماری کا ثبوت تو قرار دیا جا سکتا ہے۔لیکن موت کا نہیں۔یہ اور اس طرح کی دوسری علامات، بیماری کی علامات ہیں، موت کی علامات نہیں۔'' اس کے بالائی بدن نے اس سے کھلا اختلاف کیا۔

''یہ جو میری حالت ہے وہ موت سے بھی زیادہ بدتر ہے۔آخر تم سمجھتے کیوں نہیں۔؟'' جولیا بالائی بدن سے جھگڑنے لگی۔

''میں تمہاری اذیت کو سمجھ رہا ہوں لیکن تم اس نکتے پر بھی تو سوچو کہ نچلے دھڑ کو موجودہ صورتِ حال تک پہنچنے میں کتنی مدت لگی۔؟''

بدن نے اس کو وقت کی جانب متوجہ کرنا چاہا جو فرد کی زندگی کا پیمانہ بھی ہے۔

'' مدت لگی۔۔۔۔ ہاں مدت لگی۔۔قریباً چار سال۔۔۔ میری تکلیف کا آغاز شاید ۲۰۰۷ میں ہوا اور یہ ۲۰۰۱ کا فال ہے۔لیکن اب جو بیماری نے میرے ایک ہاتھ اور کلائی پر حملہ شروع کیا ہے۔تو کیا میں مزید چار سال کی مدت میں اس لائق رہ سکوں گی کہ اپنے بارے میں کچھ کر سکوں۔میرے اس مردہ جسم کی دیکھ بھال کون کرے گا'' جولیا وارڈ غیض میں آ کر بولی۔

''وہی کرینگے۔۔وفاقی حکومت کے لوگ، وفاقی پارلیمان والے، قانون بنانے والے، تمہاری خواہشِ مرگ کی تکمیل میں قانونی رکاوٹیں ڈالنے والے لوگ ہیں۔'' بالائی بدن نے جولیا کو لاجواب کرنے کی کوشش کی۔

''خوب خوب۔۔گویا میں اس رینگنے والی موت کے ہاتھوں تل تل مروں۔ان کے بھروسے جو صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں''

اسے یہ تو یاد نہیں کہ غنودگی کے دوران اس کا مکالمہ (خود اس کے اپنے) بالائی جسم سے کتنی دیر تک جاری رہا لیکن یہ ضرور یاد رہا کہ ساری بات چیت کسی حتمی فیصلے تک نہیں پہنچی۔

غنودگی سے باہر نکلنے کے بعد اس نے اپنی ۱۶ سالہ بھانجی کو اس غنودگی اور غنودگی کے دوران ہونے والی بحث اور دلائل کا مختصر جائزہ لکھوا دیا جو اس نے اے ایل ایس کلب کے اراکین کو ای میل سرکلر کے طور پر روانہ کر دیا۔

اس کو کلب کے اراکین کی جانب سے جلد ہی ای میل ملنا شروع ہو گئیں۔

۱۔ڈیئر جولیا وارڈ بہادری سے رہو۔ہر سال دنیا کے ہزاروں عورت اور مرد اس بیماری سے دوچار ہو رہے ہیں تو کیا ہر ایسے بیمار کو مرنے کا حق دے دیا جائے؟

مخلص

۲۔عزیزی تم نے اگر ابھی تک کیمرج یونیورسٹی کے پروفیسر اسٹیفن ہاکنگ کے بارے میں نہیں جانا ہے تو کسی سے کمپیوٹر پر نکلوا کر معلوم کر لو اپنے وقت کے اس ذہین ترین آدمی (وہ زمین کے سیاہ غاروں Black Holes) اور کائنات کی پیدائش کے بھید کو دریافت کرنے کے قریب پہنچ گیا تھا لیکن اے ایل ایس اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔

تمہارا بہی خواہ

۳۔کتنی عجیب بات۔۔۔مرض کی شناخت کے چار برس بعد تمہارا ہاتھ اب متاثر ہونا شروع ہوا ہے جب کہ یہ مرض سب سے پہلے ہاتھ میں اپنی علامات ظاہر کرتا ہے۔ بیماری علامات کی زبان میں بات کرتی ہے۔اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر تمہاری بیماری کسی اور زبان میں بات کرتی محسوس ہو رہی ہے۔کیا کہتے ہیں دوسرے اراکین کلب بیچ اس مسئلے کے۔

تمہاری۔۔۔۔

مندرجہ بالا تین ای میلز کے علاوہ باقی تذکرے کے لائق نہیں تھیں

جولیا وارڈ نے بالآخر اعانتی خودکشی (Assisted Suicide) کی درخواست کے ساتھ عدالت سے رجوع کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کلب کو اسی ضمن میں ایک مراسلہ بھی روانہ کر دیا۔ساتھ ہی روڈری کوئز کیس کے بارے میں تفصیلات اکھٹی کروا کر اس وکیل کا پتہ بھی چلوایا جس نے بیس برس قبل روڈری کوئز کی درخواست کی پیروی کی تھی اگرچہ وہ یہ کیس ہار گیا تھا۔بیماری سے قبل روڈری کوئز ایک مثالی جوان عورت تھی۔وہ گھڑ سواری میں امتیاز کی حامل تھی۔وہ جب گھوڑے کی پیٹھ پر چھلانگ لگا کر بیٹھتی تو وہ گھوڑا یا گھوڑی اس کی دونوں رانوں کے بیچ ہونے پر ناز کرتے۔

اس دوران ایک مسلمان اسکالر نسرین نے اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔جولیا نے قدرے پس وپیش کے ساتھ وقت دے دیا۔وہ بھی بیشتر ترقی یافتہ ملکوں کے عیسائیوں کی مانند ہر مسلمان مرد، عورت کو القاعدہ کا دہشت گرد سمجھنے لگی تھی۔وقت مقررہ پر نسرین اس سے ملنے پہنچ گئی۔ہائی، ہیلو کے بعد نسرین بولی''۔۔۔میں تمہاری بیماری کے متعلق بہت کچھ جانتی ہوں۔میں جانتی ہوں ڈاکٹروں کے مطابق اے ایل ایس لاعلاج اور روز افزوں بیماری ہے جو انسانی اعضاء، جوارح اور بدن کے خلیات اور ریشے مفلوج کرنے کے ساتھ برباد بھی کر دیتی ہے پھر بھی میں تم تک آئی ہوں کہ تمہارے قریب ہو کر میں تمہارے لئے دعا کروں اور تم میرے لئے۔''

نسرین کی درخواست سن کر وہ بولی''نسرین میں شکر گزار ہوں کہ تم وقت نکال کر مجھ جیسی ناکارہ عورت سے ملنے آئی ہو۔لیکن میں نہیں سمجھتی مجھے تمہاری دعا سے چنداں فائدہ ہوگا کیونکہ تم خود جانتی ہو کہ میرا مرض لاعلاج ہے، دواؤں اور دعاؤں کی پہنچ سے باہر۔۔۔البتہ میں تمہارے لئے دعا کرنے کو تیار ہوں۔۔۔تمہیں کیا ہوا ہے۔''

''دیکھو جولیا وارڈ دعاؤں کی ہر شخص کو ضرورت رہتی ہے۔بعض اچھے لوگوں نے کہا ہے بیمار کی دعا میں بڑا اثر ہوتا ہے سو میں نے تم سے دعا کی گذارش کی۔اب مجھے اس کی اجازت دو کہ میں امراض اور ان کی شفا کے بارے میں ہم مسلمانوں کا عقیدہ پیش کروں جس کی بنیاد پر میں تم سے ملنے آئی ہوں۔''نسرین نے محبت بھرے لہجے میں کہا جو ترس کھانے والا نہ تھا۔

'' او مائی گاڈ! کیا تم مجھے یہ کہنے جا رہی ہو کہ میں مسلمان ہو جاؤں۔'' جولیا بیزاری سے بولی۔

''تم اطمینان رکھو میں چاہ کر بھی تمہیں ایسا مشورہ نہیں دونگی۔میں تو بیماری اور شفایابی کے بارے میں تمہیں اسلام کا عقیدہ بتاؤنگی اور بس تمہاری مرضی تم اس پر کان دھرو یا رد کر دو۔''نسرین نے یقین دلایا۔

''اگر ایسا ہے تو کہہ ڈالو میں سن رہی ہوں۔'' جولی نے بیزاری سے کہا

'' اسلام کے عقائد کی رو سے خدا ہی بیماروں کو شفا دیتا ہے

۔۔۔جس کو چاہتا ہے۔ پیغمبر اسلام نے بھی دوائیں استعمال کی تھیں۔ دوائی کا استعمال سنتِ نبوی ہے۔ کوئی مرض لا علاج نہیں سوائے موت کے۔ اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ دعائیں مانگنا بیکار نہیں جاتا۔ بعض اوقات جو مانگو نہیں ملتا تو اس کے بدلے میں کچھ اور اس سے بہتر مل جاتا ہے۔ موت کی دعا مانگنا منع ہے۔ خودکشی حرام ہے۔''

جیسے ہی نسرین نے بولنا بند کیا جولی اس سے مخاطب ہوئی۔

''نسرین جو کچھ تم نے کہا میں نے سن لیا۔ بہت بہت شکریہ۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ اب مجھے اکیلا چھوڑ دو اور ہاں اپنا خیال رکھنا۔''

نسرین خدا حافظ کہہ کر چلی گئی لیکن اس کو جاتا دیکھ کر جولی ایک عجیب احساس سے دوچار ہوئی نسرین کوئی اور نہیں وہ خود ہے۔

زندگی بھر وہ مذہب سے دور رہی تھی۔ چرچ سے بھی جہاں تک ممکن ہو۔ لیکن ان دنوں مذہب بلکہ مذاہب نے اس کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ چرچ سے ایک پادری مارکوئس ہفتے میں ایک دن عام طور پر پیر کی شام اسے بائبل میں سے کچھ اقتباسات پڑھ کر سناتا اور جنت کی بشارت دے کر رخصت ہو جاتا۔ آئے دن کسی نہ کسی مذہب کے پیر فقیر بنا وقت لئے ہی اس پر مسلط ہو جاتے۔ عدالت میں رجوع کا فیصلہ میڈیا میں آیا تو ایک بھکشو نما فقیر اس کے پائنتی آ کھڑا ہوا اور بولا ''بیٹی خودکشی تیرا حق ہے۔ عدالت و دالت چھوڑ اور چپ چاپ اپنے آپ کو ختم کر لے۔ موت کی اذیت منٹوں کی ہوتی ہے۔ ایک سانس سے دوسری سانس تک کی مختصر مدت۔''

اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ کہتی، سنتی وہ فقیر جس طرح بغیر اطلاع آیا تھا، بغیر اجازت رخصت ہو گیا۔ جولی کا ذہن جنگِ عظیم دوم کے دوران اس وقت کے سب سے بڑے بحری جہاز کی غرقابی کی طرف گیا جس کی چمنی میں ایک جاپانی پائلٹ نے اپنا طیارہ گھسیڑ دیا تھا اور پھر چھوٹے بڑے بے شمار واقعات جاپانیوں کی خودکشی کے اس کے ذہن میں تازہ ہو گئے جو اس نے ڈائجسٹ پرچوں میں پڑھ رکھے تھے۔

ایک عجیب فیصلہ جو جولیا وارڈ نے اپنے مقدمے کے سلسلے میں لیا تھا وہ یہ تھا اس نے اپنی درخواست کی پیروی کے لئے اس وکیل کا انتخاب کیا تھا جس نے بیس برس پہلے روڈی کوئز کا کیس ہارا تھا جب کسی نے وکیل کے اس انتخاب کے معاملے میں اس سے تمسخر کیا ''لوگ باگ ایسے وکیلوں کا انتخاب کرتے ہیں جو مقدمہ جیت کر مشہور ہوئے اور تم اس وکیل کو مقرر کر رہی ہو جو کیس ہار کر مشہور ہوا۔'' تو اس نے فوراً جواب دیا ''میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں وکیل ملارمے میرا کیس جیت کر رہے گا۔

''وہ کیسے۔؟'' اعتراض کرنے والے نے تعجب سے پوچھا۔

''وہ اس طرح کہ مقدمہ ہارنے کے بعد روڈی کوئز کی اعانتی خودکشی کی درخواست کے سلسلے میں وہ اپنے موقف کے پیش کرنے اور دلائل میں وقوع پذیر ہونے والی کمزوریوں سے ضرور واقف ہو گیا ہوگا اور میری درخواست کے معاملے میں ان کو دہرانے کی ہرگز غلطی نہیں کرے گا۔ اس کے علاوہ پچھتاوے کے ساتھ اس نے ضرور کچھ ایسا بھی سوچا ہوگا۔

''کاش میں یہ کرتا اور وہ نہ کرتا۔ جو ہر شکست خوردہ آدمی سوچتا ہے۔'' جولی نے ہارے ہوئے وکیل کے انتخاب کے سلسلے میں اپنا دفاع کیا۔

جولیا وارڈ کی وکیل ملارمے سے ملاقات کچھ ٹھنڈی رہی۔ وکیل نے اس کو بتایا ''ان بیس برسوں میں روڈری کوئز کے کے مقدمے کے بارے میں کوئی قانونی پیش رفت نہیں ہوئی۔ فیڈرل پارلیمان نے اپنے قانون میں جزوی تبدیلی کی بھی اجازت نہیں دی۔ میں نے روڈری کوئز کے معاملے میں اس قانون کے انٹرپریٹیشن (تفہیم و تاویل) اور اپلیکیشن (استعمال) کا کوئی نکتہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ بالآخر معاملہ فیکٹس پر آ ٹکا۔ اور جیسے ہی فیکٹس کی اساس پر میں نے کیس کو کھڑا کیا تو روڈری کوئز عدالت کی نظروں میں ایک عام معذور مریضہ قرار دی گئی اور نتیجے کے طور پر درخواست خارج کر دی گئی۔''

وکیل کہتا رہا اور جولی سنتی رہی اس کے کان وکیل کی آواز کو سن رہے تھے۔ اس کی آنکھیں اس کو دیکھ بھی رہی تھیں۔ زندگی کے جس مرحلے پر وہ پہنچا دی گئی تھی اس مرحلے پر پانچوں میں سے دو یا تین حواس معمول سے زیادہ تیز ہو جاتے ہیں۔ وکیل نے اپنی بات ختم کی اور اس کے بستر اور بدن کو بار بار دیکھنے اور اپنی ٹھوڑی سہلانے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو جولی کی آنکھوں سے دوچار ہونے نہیں دیا۔ وہ ایک مخروطی چہرے والا خوصورت فرانسیسی بوڑھا تھا جس پر کیوبک اور قدیم مونٹریال کی چھاپ پڑی تھی۔

''اب اگر میں اعانتی خودکشی (Assisted Suicide) کے لئے عدالت سے رجوع ہوتی ہوں تو کتنے فی صد امکان ہے۔؟ جواب دینے کے لئے آپ اپنا وقت لے سکتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ آج ہی۔۔۔'' جولی نے اپنے ہر لفظ پر زور دے کر استفسار کیا۔

وکیل ملارمے نے اس کا فقرہ پورا ہونے نہیں دیا اور بولا ''نہیں نہیں مجھے وقت نہیں چاہئے۔ میں تمہارے سوال کا جواب اسی وقت دے سکتا ہوں۔ تمہارا کیس قانون کے نکات پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس کا ایک فیصد بھی امکان نہیں ہے۔ حالات (فیکٹس) پر ہی کچھ امکانات بن سکتے ہیں۔ میڈیکل بورڈ تشکیل دلوایا جا سکتا ہے۔ اس کی رپورٹ پر پانچ سے پچاس فیصد کے درمیان کامیابی کی توقع بھی کی جا سکتی ہے۔ صورتِ حال روشن نہیں ہے لیکن وہ جو یہ کہا جاتا ہے کہ دور بہت دور تاریکی کے آخری سرے پر کسی روشن لکیر کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔'' ملارمے نے یہ سب کہہ کر پہلی مرتبہ جولی سے آنکھیں چار کیں۔

''ری ٹین چارجز کا چیک۔۔۔؟'' جولی نے وکیل کی آنکھوں میں اپنی بڑی بڑی آنکھیں ڈال کر پوچھا۔''

''نہیں ابھی نہیں مجھے مقرر کرنے میں آپ اپنا وقت لے سکتی ہیں۔جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔'' وکیل ملارمے بغیر ریٹے نر لئے رخصت ہو گیا۔شاید وہ جولیاوارڈ کو رسان کے ساتھ سوچنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔جولی کے اندر سے گریہ آنکھوں تک آ کر رک گیا۔اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے سارے بدن کا جائزہ لیا۔یہ احساس اس کو ہمیشہ عجیب لگتا۔کہ جس بدن کو اس نے شاذ شاذ ہی کسی کمزور لمحے میں کسی کی دست برد کے لئے کھولا اور عام حالات میں کڑی حفاظت کی،اس پر اے ایل ایس کل وقتی قابض ہے۔

بالآخر جولیا وارڈ نے وکیل ملارمے کو ریٹین (مقرر) کرلیا۔اور جیسا کہ وکیل نے پہلے ہی خدشہ ظاہر کیا تھا آٹوا (Ottawa) کی مرکزی عدالت عالیہ نے جولیاوارڈ کی اعانتی خودکشی کی درخواست کو قانون کی اساس پر غور کے لائق تسلیم کرنے سے انکار کر کے رد کردیا۔

''دنیا بھر میں ہزاروں مریض اے ایل ایس میں مبتلا ہیں۔کیا ان سب کو اعانتی خودکشی سے دوچار کرنا قصّابانہ اقدام نہ ہوگا۔؟''

جج نے جولیا وارڈ کے وکیل سے طنزیہ استفسار کیا جس پر وکیل ملارمے کو ایک خاموش سامع کا رول ادا کرنا پڑا۔میڈیکل بورڈ کی تشکیل اور اس کی رپورٹ کے حصول کے ضمن میں عدالت عالیہ نے مناسب احکامات جاری کر دیئے۔عدالتِ عالیہ کے حکم سے تشکیل کردہ میڈیکل بورڈ میں کینیڈا،امریکہ،یو کے کے علاوہ فرانس کے چوٹی کے ایسے نیورو فزیشن شامل کئے گئے تھے جو اے ایل ایس کی تحقیق اور علاج کے سلسلے میں جانے مانے تھے۔

اس میڈیکل بورڈ نے دو سے تین ہفتے کی مہلت طلب کی۔بورڈ کو یہ بھی اختیار دیا گیا تھا کہ کسی بھی اہم نکتے پر متفقہ نقطۂ نظر نہ ہونے کی صورت میں بورڈ کا کوئی بھی رکن اختلافی نوٹ درج کرسکتا ہے۔

ایک ڈاکٹر کے اختلافی موقف اور وضاحتی نوٹ کے ساتھ رپورٹ عدالت عالیہ کے تین رکنی بنچ کے زیرِ غور آئی۔

رپورٹ میں پندرہ میں سے چودہ اراکین کا متفقہ موقف درج ذیل تھا۔

۱۔مریضہ جولیاوارڈ مرض اے ایل ایس میں مبتلا ہے۔
۲۔مرض کا آغاز قریباً چار سال قبل ہوا ہے۔
۳۔مریضہ کی ٹانگیں کام نہیں کر رہی ہیں۔
۴۔مریضہ کا دماغ ٹھیک ٹھیک کام کر رہا ہے۔

بورڈ کے صرف ایک رکن کے اختلافی موقف کے مطابق ''مریضہ کا بالائی جسم مرض سے متاثر نہیں معلوم ہوتا۔چار سال کی مدت گزرنے کے بعد ہاتھوں میں ہلکی سی علامات ظاہر ہوئی ہیں۔یہ ایک غیر معمولی صورتحال ہے۔جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اگر ایک فیصد بھی اس کا امکان ہو کہ مریضہ اے ایل ایس میں مبتلا نہیں ہے تو اسکو ''انڈر آبزرویشن'' رکھا جانا چاہئے۔مریضہ میں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی قوتِ ارادی ہنوز موجود ہے۔وہ اعانتی خودکشی کی خواہاں محض اس سبب سے ہوگئی ہے کہ ڈاکٹروں نے اسکو اے ایل ایس کا شکار بتا دیا ہے جو ایک لاعلاج مرض ہے۔

وکیل ملارمے کی ساری کوششیں ایک مرتبہ پھر بے کار ثابت ہوئیں۔ایک مرتبہ پھر عدالتِ عالیہ نے درخواست خارج کر دی البتہ یہ گنجائش رکھی کہ چھ ماہ بعد اس کی نظرثانی کی درخواست پر غور کیا جا سکتا ہے۔

اس رات نیند کی گولیوں نے بھی جولی کو غفلت سے ہمکنار نہیں کیا۔وہ آواز کے ساتھ اور کبھی بے آواز روتی رہی۔اور سوچتی رہی کہ ''اگر کوئی ہے جو خلق بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے تو کیوں جولی کو اپنی زندگی کا خود خاتمہ نہیں کرنے دیتا۔۔۔؟ وہ جو بھی ہے اگر شفا دینے والا ہے تو اس کو اس مرض سے کیوں نجات نہیں دلا دیتا۔اے ایل ایس جو ڈاکٹروں کے بقول اس کی جان لے کر ہی جائے گا۔وہ جو بھی ہے کیوں چاہتا ہے جولیاوارڈ اپنے نصف مردہ دھڑ کے ساتھ بستر پکڑے ہوئے اس وقت تک اپنی سانسیں گنتی رہے جب تک اے ایل ایس اس کے پورے بدن کو عضو عضو، خلیہ خلیہ، ریشہ ریشہ ختم کر کے اس کا خاتمہ کرے۔'' اس نے خدا کے بارے میں اپنی گستاخانہ سوچ کو صدا میں بدلا،تا آنکہ نینداس کے مفلوج ہوتے ہوئے بدن پر مسلط ہوگئی۔

اس رات جولیا وررڈ نے خواب دیکھا یا یہ کہ اس کے اندر سے نسرین باہر نکلی،اس کے بدن پر ہلکے ہلکے ہاتھ پھیرا اور واپس اس کے اندر چلی گئی۔

پھر صبح ہوئی۔موسمِ سرما کے اختتامی ہفتے کی ایک روشن صبح۔سورج اس کے کمرۂ خواب کی کھڑکی سے اندر گھسا چلا آ رہا تھا۔کھڑکی کے آدھے کھلے، آدھے بند بلائنڈس نیم برہنہ حالت میں حائل کھڑے،سورج کا راستہ روک رہے تھے۔جولیا کے دل نے اس سے کہا'' جولیا وارڈ اٹھ اور کھڑکی کے سارے بلائنڈس کھول دے۔اپنا پیرہن اتار پھینک اور اپنے آپ کو سورج اور اس کی دھوپ کے حوالے کردے۔''

وہ بستر سے تو اٹھ نہ سکی لیکن اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ برسوں کے بعد اس کے نچلے بدن نے ایک جھرجھری سی لی۔اس کا دایاں ہاتھ اس ڈوری کی جانب بڑھا جس کو کھینچنے سے اس کی خدمت گار خاتون کو طلب کرنا ممکن ہوتا تھا لیکن اس نے اپنا ہاتھ روک لیا اور بستر پر پڑی رہی۔بستر پر لیٹے لیٹے اس نے اپنے دائیں پیر کی بڑی انگلی کو جنبش کرتے دیکھا۔کچھ ہی دیر بعد اس کے داہنے پیر کا پورا پنجہ حرکت میں آیا۔

''نسرین تم نے دیکھا میرے پیر کا ایک پنجہ جنبش کرنے لگا ہے۔'' جولیاوارڈ نے اپنے اندر والی نسرین کو بتایا۔اور گریہ اس کے سینے سے حلقوم تک بھر آیا۔

''شکریہ میرے مہرباں! میرے خالق! میرے مالک! مجھے زندہ رکھنے کا۔۔۔شکریہ!!'' گریہ سے لبالب بھری آواز میں وہ ملتجیانہ گڑگڑائی۔

بڑا دل

وقار بن الٰہی

(اسلام آباد)

یہ تقاضا اُس نے پہلی بار ماں کے منہ سے سنا تھا۔عمل تو خیر کیا کرنا تھا کہ بچپن بڑوں کی باتیں سن کر عمل کرنے کا زمانہ نہیں ہوتا۔کانوں کے درمیان جیسے آر پار سوراخ تھے'ایک طرف سے بات سنی تو وہ جھٹ سے دوسرے سوراخ سے باہر نکل گئی لیکن تقاضا تھا کہ عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی چلا گیا۔پہلی بار ہوا' یوں کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیل کر واپس آیا ہی تھا کہ ماں نے اُسے مرچیں لانے بازار دوڑا دیا تھا واپس آیا تو دونوں چھوٹے اُس کے حصے کے بھی مُرمُرے چَٹ کر گئے تھے۔اُسے غُصہ تو آنا ہی تھا کہ کھیل کے بعد بھوک ستا رہی تھی اور منہ مارنے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔جی تو یہی چاہا کہ چھوٹوں کے ٹینٹوے دبا دے لیکن ماں نے ترت ہی اُسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''ایسا کیا کر دیا ہے بھائیوں نے جو تیری آنکھوں میں خون اُتر آیا ہے؟''

''دیکھ تو ماں' کس بے شرمی سے میرے حصے کے مُرمُرے بھی کھا گئے ہیں۔میں اس بھوک کا کیا کروں۔؟'' ماں نے اُسے وہیں ٹوک دیا۔

''تو کیا ہوا' تیرے ہی چھوٹے بھائی ہیں نا' تو بڑا ہے' ذرا اپنا دل بڑا کر لے' بھوک جاتی رہے گی۔۔'' ماں کی یہ منطق اُس روز ہی کیا کبھی بھی اُس کی سمجھ میں نہ آئی۔بھلا دل بڑا کرنے سے بھوک کیسے نہیں ستائے گی۔پانچویں درجے میں پڑھتے ہوئے اُسے یہ تو معلوم تھا کہ سینے کے بائیں طرف پسلیوں کے نیچے ایک شے دھڑکے چلی جاتی ہے جسے گوشت کا لوتھڑا بھی کہتے ہیں لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اِس لوتھڑے کو بڑا یا چھوٹا کیسے کیا جا سکتا ہے۔۔اُس وقت تو اُسے کچھ نہ سوجھا اور وہ چھوٹے کو گھورتا' اُسے دو چار گھونسے رسید کرنے کی خواہش کو دباتا پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔لیکن بعد میں یہ جملہ جیسے زندگی بھر اُس کے ماتھے پر چپک کر رہ گیا۔

اُسے یہ بھی یاد تھا کہ ایک بار ابّا کے واپس آنے میں خاصی دیر ہو گئی تھی تو امّاں نے اُن کے پیچھے جانے اور اُن کی خیریت جاننے کے لئے اُسے بھیجنا چاہا تھا۔وہ ڈیوڑھی تک تو پہنچ ہی گیا تھا لیکن پھر جانے کیا ہوا، کوئی جن تھا یا بھوت کہ اچانک اوٹ میں سے نکلا اور پھلانگتا ہوا باہر گلی میں اوجھل ہو گیا۔وہ ٹھٹکا' پہلے قدم رُکے' پھر چیخ حلق میں سے نکلی اور وہ دھپ سے وہیں دہلیز پر بیٹھا رہ گیا۔ارے' دل تو اِس تیزی سے دھڑک رہا تھا' لگتا تھا جیسے ابھی سینے کی تیلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔اُس کے سارے جسم پر دل کی دھڑکن ہی چھائی ہوئی تھی۔چیخ سن کر امّاں بھاگی ہوئی آئیں' اُسے زمین پر یوں بکھرا ہوا پا کر جیسے سب کچھ بھول گئیں۔بازوؤں میں بھر کر بولیں۔

''کیا ہوا میرے لعل کو؟'' لعل کے ہوش ٹھکانے آنے میں دیر لگ گئی۔جب ہکلاتے ہوئے کچھ نہ کچھ بیان کر چکا تو اماں نے مسکرا کر اُسے چوما' پیار کیا اور بولیں۔

''بلی تھی پگلے' تو ایسے ہی ڈر گیا ہے۔'' اُسے یقین نہیں آ رہا تھا' ماں کے بازوؤں میں گھر کر بھی وہ کانپے جا رہا تھا۔بے یقینی سے بولا۔

''نہیں اماں۔وہ۔وہ'' بھلا بلی کیسے اتنی بڑی ہو سکتی ہے؟ میں نے پردہ پھڑ پھڑاتے ہوئے خود دیکھا ہے۔'' امّاں اب ہنس دیں۔

''واہ میرے شیر' ذرا سی بلی سے ڈر گیا ہے۔اتنا چھوٹا دِل؟۔'' وہ امّاں کی بات سن کر بلبلا ہی تو اُٹھا لیکن احتجاج میں جان نہیں تھی۔

''امّاں۔۔!''

بات شاید آٹھویں جماعت کے نتیجے کی تھی کہ چھوٹا اچھے بھلے نمبروں سے پاس ہو گیا تھا۔وہ گھر لوٹا' تو اُس نے ڈیوڑھی میں نیا سائیکل اسٹینڈ پر کھڑا دیکھ لیا تھا۔اس نے رُک کر دیکھا بھی' شک نے سر بھی اُٹھایا لیکن پھر جیسے اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دے کر ہی مطمئن ہو گیا۔نہیں ایسے نہیں ہو سکتا۔اندر جا کر وہ دوسروں کے ساتھ مبارک سلامت کا تبادلہ کر چکا' مٹھائی اپنے منہ میں ٹھُسوا چکا تو امّاں نے جیسے بارود کو آگ دکھا ہی دی۔

''تیرے بھائی نے کیا شاندار نمبر لئے ہیں۔ابّا نے نتیجہ سنتے ہی سائیکل کا سودا کرا دیا حالانکہ اس نے تو تقاضہ بھی نہیں کیا تھا۔۔'' وہ صرف ماں کے منہ کی طرف دیکھ ہی سکا' اس کی نگاہیں اُس بلی کی طرح لگ رہی تھیں' جس کے بچوں میں سے اُس کا شکار چھین لیا گیا ہو۔حق تلفی' زیادتی' خجالت کیا نہیں تھا اُن نگاہوں میں۔لیکن وہ منہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔جانتا وہی تھا کہ اُس نے آٹھویں کے امتحان میں چھوٹے سے کہیں زیادہ نمبر لئے تھے۔اپنی جماعت میں اوّل آیا تھا' اُس وقت گھر والوں نے تھوڑی بہت مٹھائی ہی محلے میں بانٹ کر جیسے شرط پوری کر لی تھی۔اور انعام و اِکرام' تو کسی کو کیا پڑی تھی کہ وہ اِس خرچے کا سوچتا بھی۔۔۔اُس کے لئے تو ایک رٹا رٹایا جملہ ہی کافی تھا۔

اسکول سے نکل کر کالج پہنچا تو یہ تہمت اُس کے پیچھے پیچھے وہاں بھی پہنچ گئی۔بلکہ جس بات کو وہ تہمت سمجھتا تھا' اب اُس کی ہیئت بدل گئی تھی۔چھوٹے بھائیوں نے پر پُرزے تو اسکول میں ہی نکال لئے تھے اور اسے دھوبی پٹڑا دینے کی فکر میں رہا کرتے تھے لیکن کالج پہنچنے کے بعد وہ اُن کے

ہاتھوں بے بس ہو کر رہ گیا۔ دل بڑا کرنے کا نعرہ یہاں بھی لگتا تھا لیکن اب صورت قدرے کیا بالکل بدل گئی تھی۔ اب امّاں کا فرمان یہی تھا

''تمہارے چھوٹے بھائی ہیں' اُن کی دیکھ بھال تمہارا فرض ہے۔'' اب وہ اس فرض کو کیسے نبھاتا کہ دونوں چھوٹے اور ہر کام کرتے تھے' نہیں کرتے تھے تو پڑھائی اور ڈانٹ اُسے ہی پڑتی تھی کہ بڑا بھائی ہونے کے ناطے وہ اُن کا خیال نہیں رکھتا۔۔ اُنہیں بھی جیسے کھُلی چھٹی ملی ہوئی تھی۔ جانتے تھے وہ کچھ بھی کر گذریں' نزلہ بڑے پر ہی گرے گا۔ چنانچہ دنگا فساد اور نتیجے میں مرہم پٹی کا سلسلہ ضرور چلتا تھا۔ تنگ آ کر ایک دن اُس نے ماں کے گھٹنے پکڑ لئے۔

''ماں۔۔ مجھے۔۔ پتہ ہوتا تو میں کالج کا رُخ بھی نہ کرتا۔'' ماں کو کیا پتہ کس طوفان کی آمد آمد ہے۔ اپنے لہجے میں منوں مٹھاس اور محبت بھر کر بولیں۔

''کیوں بھئی۔ میرے بیٹے کو کیوں پچھتاوا ہو رہا ہے؟''

''امّاں۔۔ ان دونوں کو دیکھو نا' پڑھتے پڑھاتے یہ کچھ ہیں نہیں' آئے روز دنگا فساد میں اوّل لیکن بدنامی میرے حصے میں آتی ہے۔ ہر کوئی کہتا پھرتا ہے۔ 'بڑے بھائی کی موجودگی کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔' اب امّاں' میں ہر کسی کو کیسے سمجھاؤں کہ۔۔۔۔'' امّاں نے مسکرا کر اُس کا سر سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اس کے زخموں پر پھاہا رکھنے لگیں۔

''یقین کرو' میں اُنہیں سمجھاتی رہتی ہوں' بُرا بھلا بھی کہتی ہوں لیکن بچے ہیں' چھوٹے ہیں۔ اُنہیں یہ سہارا بھی ہے کہ بڑا بھائی موجود ہے' وہ سنبھال لے گا۔'' اُسے ماں کے مرہم سے سکون نہیں ملا۔ آج اس کا دل جیسے باغی ہو رہا تھا۔

''نہیں امّاں' اُنہیں تو بڑے بھائی کا سہارا ہوگا' مجھے بتاؤ نا' میں کس کا سہارا لوں۔'' ماں نے اندازہ کر لیا تھا' اب یہ طفل اِن تسلیوں سے نہیں بہلے گا۔

''میں تمہارے ابّا سے نہیں کہنا چاہتی۔ وہ تو بات بات پر بھڑک اُٹھتے ہیں۔ خود ہی اُنہیں سمجھاؤں گی۔ بس تو حوصلہ رکھ اور۔۔ دل بڑا کر۔۔ تیرے ہی بھائی ہیں' تیرے ہی بازو ہیں۔ بس انہیں ذرا بڑا ہو لینے دے' آپی آپ سمجھ جائیں گے۔۔'' اب وہ اِس کا کیا جواب دے۔ آج کیا وہ تو کبھی بھی امّاں کو جواب نہیں دے سکا تھا۔۔ چھوٹا اُس سے یہی کوئی ڈیڑھ برس چھوٹا تھا اور تیسرا بمشکل تین برس کم ہوگا۔ اُس کا جی تو چاہا امّاں سے کہے کہ ابھی وہ اور کتنے بڑے ہوں گے جو بُرے بھلے کی اُنہیں تمیز آئے گی لیکن پھر یہ سوچ کر چُپ ہو رہا' کہیں امّاں بُرا نہ مان جائیں اور امّاں کا بُرا ماننا اُسے کسی قیمت منظور نہیں تھا۔

کالج سے نکل کر اس نے تو جا یونیورسٹی میں پناہ لی' چھوٹا بھی یونیورسٹی میں ہی داخل ہوا تھا لیکن فاصلہ تھوڑا ہی طے کر سکا۔ ایک بی بی جیسے اُسی کی انتظار میں بیٹھی تھی۔ اُسے داخل ہوتے دیکھ کر یوں اُچک کر لے گئی' جیسے چیل گوشت کا ٹکڑا جھپٹا مار کر لے جاتی ہے۔۔ بڑا ایک دن گھر واپس آیا تو ماحول سے محسوس ہوا' کوئی بڑا اور سنجیدہ مقدمہ پیش ہے لیکن جج صاحب کسی طرح قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ چھوٹا پہلے تو مجرم بننے کی ایکٹنگ کرتا رہا۔ پھر جب اُسے بھی یقین ہونے لگا' گھی سیدھی کیا ٹیڑھی انگلیوں سے بھی نہیں نکلے گا تو وہ بھی اکڑ گیا۔ ماں کو آنسو بہانے میں ہی خیریت نظر آئی کیونکہ ابھی تھوڑی دیر میں گرتی عمارت کا سارا ملبہ اُسی پر گرنے والا تھا۔ البتہ سب سے چھوٹی ایک بہن تھی' صرف اُسی کے لبوں پر تیرتی مسکراہٹ اور آنکھوں سے بہتی خوشی دکھائی دے رہی تھی۔ بڑے نے اِس نئی افتاد کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن جب کچھ بھی پلے نہ پڑا تو ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

''کوئی مجھے بھی تو بتائے' بات کیا ہے؟'' پہلے باپ اور پھر ماں نے اُسے جیسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ اُسے شک گذرا کہیں سب لوگ بغیر کسی وجہ کے ہی تو نہیں ہلکان ہو رہے؟ پھر جب یہی نظریں چھوٹے کے مطمئن چہرے پر جا کر رُک گئیں تو اُس کی جان میں جان آئی۔ والد نے نہیں' امّاں نے پہل کی۔ آواز میں پریشانی تھی' لرزش بھی' کچھ کھو جانے' کھونے' چلے جانے کا غم بھی۔۔

''یہ چھوٹا۔۔ چھوٹا۔۔ یونیورسٹی میں کسی ساتھی۔۔ کے ساتھ شادی کا کہہ رہا ہے۔۔ اس کے ساتھ پڑھتی ہے۔۔ وعدے وعید تو ہو چکے' اسی لئے کہہ ہی نہیں رہا' ضد کر رہا ہے۔ ضرورت بھروسے کی ہے جو ماں باپ ہی فراہم کر سکتے ہیں۔'' اب نظریں بڑے کے چہرے پر جم گئیں۔

''تم ہی اِسے سمجھاؤ نا۔؟'' وہ اُسے کیسے سمجھا سکتا تھا۔ پھر بھلا عشق کے معاملے میں آج تک کوئی سمجھانے سے بھی سمجھا ہے۔ سمجھانے والا لاکھ سر پھوڑے' آگ سر پھوڑنے سے نہیں' اپنی چاہنے والی کے ساتھ شادی سے ہی بُجھ سکتی ہے۔ بڑے نے نظریں جھکا لیں اور فرش کو دیکھنے لگا جو اُس لمحے بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔۔ والد کے چہرے پر روایتی جلال ہی جلال تھا' باپوں کے پاس جلال کے علاوہ اور ہوتا بھی کیا ہے اور امّاں۔؟ لگتا تھا' ابھی رو دیں گی۔ ایسے موقعوں پر باپ کے روپ میں بڑے بڑے پہلوانوں کو مائیں ہی چت کرنے کا کام سرانجام دیتی ہیں۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی کبھار پہلوان داؤ پیچ میں ماؤں کو بھی مات دے جاتے ہیں۔ یہاں ماں کو اور تو کوئی بہانہ ہاتھ نہ آیا' تنکے کے سہارے کے لئے ہی ہاتھ پاؤں مارنے لگیں۔ مخاطب وہ چھوٹے سے ہی تھیں۔

''بڑا بھائی ابھی بیٹھا ہے اور چھوٹا چلا ہے شادی رچانے۔'' امّاں کے لہجے میں کچھ تھا ہی نہیں' کوئی اُس کا جواب کیا دیتا۔ چھوٹے نے ایک ہی وار کیا۔

''مجھے اِس سے غرض نہیں کہ کوئی کیا کہتا اور کرتا ہے۔ نکاح کے لئے کل میرے ساتھ چلئے' نہیں تو میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا اور بھائی! بھائی کا کیا ہے۔ وہ۔۔'' اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور باہر نکل گیا۔ بڑا ڈُبک گیا' جیسے

جانتا ہو' چھوٹے نے کیا کہنا ہے۔کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی تو وہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکے گا۔

اگلے روز والد تو سارا ملبہ ماں کے سر پھینک کر گھر سے ہی نکل گئے۔۔شکوہ ایک ہی ہوتا ہے کہ ماں نے لاڈ کے لوٹے لُوٹھ کا کراولا دکو مادر پدر آزاد کر دیا اور لوٹا بنا دیا ہے۔لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرے کہ بڑوں کی آمد پر کوئی توجہ دینے پر شاذ و نادر ہی آمادہ ہوتا ہے۔البتہ اصل محبت اور شفقت کا آغاز بعد میں آنے والوں سے ہی ہوتا ہے۔یہاں بھی یہی ہوا۔چھوٹے نے بھائیوں کے علاوہ ایک دو دوستوں کو ساتھ لیا۔دلہن کے گھر جا کر دو نہیں تو تین بار قبول بول کر اپنی دلہن کو ساتھ لیا اور لوٹ آئے۔۔لڑکی کے ماں باپ بھی عجیب تھے' پُوچھا ہی نہیں' کوئی بڑا بھی ہے یا نہیں اور ہے تو کہاں ہے؟ کوئی نہیں آیا تو کیوں نہیں آیا؟؟ جانے ماں باپ بیٹی کو بوجھ کے علاوہ کوئی اہمیت کیوں نہیں دیتے۔ماں بیچاری روایتی طور پر دو پاٹوں کے بیچ پسنے کو تیار بیٹھی تھی۔۔اس نے بہو کو سینے سے چمٹایا' پیار کیا' اپنی شادی کا ایک آدھ گہنا پہنایا' اور پھر خاندان بھر کے لئے پکانے ریندھنے کے لئے رسوئی میں گھُس گئی۔نئی نویلی دلہن جانے کس مٹی کی بنی تھی' اپنے آپ ہی گھر بھر میں گھومتی پھرتی رہی۔ہر ایک کونے سے ایسی واقف تھی جیسے پیدا ہی اِسی گھر میں ہوئی ہو۔شام گھِرے سُسر گھر میں داخل ہوئے تو سر گرا کر' معصوم سی شکل بنائے' اجنبیت کا نقاب اوڑھے فرش کو یوں گھورنے لگی جیسے اِس سارے قضیے میں وہی ایک پاک دامن ہے۔سُسر نے اخلاقاً سر پر ہاتھ پھیرا اور اندر کسی کمرے میں غائب ہو گئے۔۔اتنے میں بڑا گھومنے پھرنے کے بعد گھر میں آ گھُسا' دلہن پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ماں کے چہرے کا لکھا پڑھنے لگا۔ماں نے سرگوشی کی۔

''والد ابھی ابھی آئے ہیں اور اندر کمرے میں گئے ہیں۔تم ذرا۔۔''اُس نے ماں کے سامنے ہکلانا شروع کر دیا۔

''امّاں' شیر کے سامنے جانے نہیں' گھٹنے ٹیکنے کے لئے بھی میں ہی رہ گیا ہوں۔نہ بابا نہ' مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔'' ماں گڑگڑائی۔

''بیٹا تو نہیں بات کرے گا تو اور کون کرے گا اور وہ سُنیں گے بھی کس کی؟'' بڑا ایک بار پھر لیت و لعل کرنے لگا تو ماں نے اپنا آخری حربہ استعمال کر ڈالا۔

''دیکھ نا' تو ہی میرا شہزادہ ہے۔تو بڑا ہے اور وہ بھی تیری ہی بات سنتے اور مانتے ہیں۔شاباش میرا بچہ۔تو بڑا ہے اور تیرا دِل بھی بڑا ہے۔' میں جانتی ہوں' تو کیا سوچ رہا ہے۔۔پر'' بڑے کو یوں لگا جیسے ماں نے نہیں' بھڑ نے اُسے کاٹ لیا ہو۔احتجاج کے لئے وہ پلٹا لیکن ماں کے چہرے پر لیٹی سماجت کو دیکھ کر ایسا چُپ ہوا' جیسے منہ میں زبان ہی نہ رکھتا ہو۔اُس روز اس کا جی مچل اُٹھا تھا' کاش! وہ کہہ سکتا' یہ بڑا ہونے کا طعنہ بار بار تو نہ دیا کریں۔۔اب اگر وہ سب سے پہلے آیا ہے تو اس میں اُس کا کیا دوش۔اس کے ذمہ دار بھی ماں باپ ہی تھے۔۔

چھوٹے کو گھر بسائے بمشکل چند ہی ماہ گذرے تھے کہ تیسرے کو خانہ آبادی کی سوچوں نے گھیر لیا۔لیکن اُس کی بار جیسے کوئی انہونی ہوئی ہی نہیں' یہاں تک کہ والد جو منجھلے کی دفعہ بندوق نہیں تو پستول چلانے کی دھمکی بھی دبے لفظوں میں دے چکے تھے اب کی بار ضرورت پڑنے پر زیادہ سے زیادہ غلیل کا سہارا ہی لیتے۔۔لیجئے' اللہ بھلا کرے اِن چھوٹوں کا' اُنہوں نے ماں باپ کو کئی جھنجھٹوں سے بچا لیا تھا۔میاں بیوی اندر ہی اندر خوش بھی تھے۔ہاں! کبھی کبھی اپنے آپ کو مجرم سمجھتے تو صرف اِس لئے کہ بڑے کا معاملہ ابھی وہیں کا وہیں تھا۔اُس نے خود دلچسپی نہیں لی نہ ہی ماں باپ نے کوئی دھیان دیا۔نہ وہ بولا نہ بزرگوں نے اس کی ذات کو کوئی اہمیت دی۔۔اصل میں چھوٹوں نے اتنی عجلت میں سب کچھ کر ڈالا کہ بڑا اگر ماں باپ کا ہاتھ نہ بٹاتا تو ان بیڑیوں نے پار نہیں اُترنا تھا۔

اُس کا اِس آمد و رفت میں کوئی ہاتھ تھا یا نہیں' لیکن سچ تو یہ ہے کہ بڑا ہونے کی وجہ سے کم اور بڑا دل رکھنے کی وجہ سے اُسے بہت مار سہنا پڑی۔کبھی کبھار وہ سونے سے پہلے تکیئے پر سر رکھ کر سوچتا بھی تھا کہ اُس کا بنے گا کیا لیکن پھر بڑا بننے اور بڑا دل رکھنے کے شور میں ایسا نشہ تھا کہ وہ ایک بار پھر اِس ہیر پھیر میں اُلجھ جاتا۔ماں باپ دونوں بیٹوں سے فارغ ہوئے تو اُنہیں سب سے چھوٹی بیٹی نظر آ گئی جو عام بیٹیوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دیکھتے ہی دیکھتے بانس کی طرح لمبی ہوئی تھی۔اور حسبِ توقع ماں باپ کو نظر بھی اُسی وقت آئی جب اس بانس کو کسی کے حوالے کرنا بہت ضروری تھا۔نگاہیں پھر بڑے پر ٹِک گئیں' وہ اگر ماں باپ کی مدد کو نہیں آئے گا تو اِس مشکل وقت میں بوڑھوں کے ہاتھ کون تھامے گا۔۔بڑے نے انکار بھی نہیں کیا۔

چھوٹی کی رخصتی کے بعد ماں کو اچانک خیال آیا' بڑے کا گھر فوراً بس جانا چاہیئے۔شاید پچھتائی بھی' ایسا اب تک ہوا کیوں نہیں۔دل ہی دل میں جانتی بھی تھی کہ بڑے کا گھر کیوں نہیں بس سکا لیکن زبان سے اِقرار کون کرتا' فائدہ بھی کیا تھا۔البتہ والد نے ایک آدھ بار دبے لفظوں میں یہ ضرور کہا تھا کہ بڑے کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔اگر وقت پر اُس کی شادی ہو جاتی تو اُس کے بچے اُس کے بازو بن چکے ہوتے۔ماں نے جب اپنی پڑوسن کی بچی کو ہی پسند کر ڈالا تو چھوٹے نے ضرور احتجاج کیا۔

''ماں کیا کرتی ہیں آپ بھی۔اُس لڑکی کو آپ نے غور سے دیکھا ہے۔بھائی سے بڑی نہیں تو عمر میں برابر ضرور ہوگی۔وہ تو ابھی سے بوڑھی دکھائی دیتی ہے۔''

''کیا انٹ شنٹ بک رہے ہو۔اس کی شادی نہیں ہوئی' اس لئے بڑی لگتی ہے۔وہ تمہارے بھائی سے زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت چھوٹی ضرور ہے''۔

''نہیں امّاں! آپ بھائی سے ضرور پوچھ لیں۔ہو سکتا ہے' اُنہیں

اعتراض ہو۔''

''اعتراض۔۔نہیں میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔''

''امّاں' پوچھ لینے میں کیا حرج ہے''

''نہیں: میں اُسے جانتی ہوں۔میرے بیٹے کا دل بڑا' بہت بڑا ہے' وہ اپنی ماں کی بات کبھی نہیں ٹالے گا۔'' واقعی اُس نے ماں کی بات نہیں ٹالی اور امّاں کا دیا ہوا تمغہ اپنے سینے پر سجائے چپ چاپ قاضی کے سامنے تین بار قبول کا لفظ ادا کر دیا۔۔پر جانے کیوں' اُس کا دل دھڑکا' نہ دلہن کے ساتھ مل کر بیٹھنے پر اُس کا خون سر کی جانب دوڑا۔شاید ایسی کیفیات کے لئے اس کا رَخشِ عمر کئی حدیں پار کر چکا تھا۔

شادی خانہ آبادی کے بعد بڑے کو یہی محسوس ہوا جیسے ایک فرض تھا' جسے پورا کیا گیا ہے۔اِس کے علاوہ دوسرے فرائض بھی تھے جو پورے ہو رہے تھے یا ادا کئے جا رہے تھے۔چھوٹے پہلے تو ایک عرصے تک علیحدہ ہونے کے بارے میں سوچنے کو بھی تیار نہ تھے۔اگر کبھی بھولے سے بھی اُن کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل جاتی تو بیویاں اُن کے وہ لتے لیتیں کہ مری ہوئی نانی بار بار یاد آتی اور آئے چلی جاتی لیکن جب اُنہوں نے بھانپ لیا کہ اب وہ علیحدہ رہ سکتے ہیں تو وہ کسی دوسرے کو اپنے حصے کے نوالوں میں شریک نہ کرنے کی غرض سے اپنے اپنے ٹھکانوں کو سدھار گئے۔یوں بھی اُنہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ تِل بالکل ہی خشک ہو چکے ہیں اور لاکھ نچوڑیئے' کچھ برآمد نہیں ہوگا۔۔جاتے جاتے ماں باپ کے لئے وہ حکم جاری کرتے گئے۔

''ہمیں اوّل تو کوئی تجربہ نہیں' ہو بھی تو بھائی' بھابھی آپ کی ہم سے بہتر اور اچھی طرح دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔کبھی ضرورت پڑے تو یاد کر لیجئے گا' ہم حاضر ہو جائیں گے'' بھائی' بھابھی جیسے پیدائش سے پہلے ہی اس کام کی تربیت لے چکے تھے۔

بڑا ایک شام تھکا ہارا دفتر کی جھک جھک کے بعد گھر لوٹا تھا اور ماں کی پائنتی بیٹھا کوئی بات کر رہا تھا کہ اچانک اُس کی نظریں اپنے دائیں پاؤں کے ٹخنے پر جا پڑیں۔چونک ہی تو اُٹھا۔نظریں پھسلتی ہوئی باقی پاؤں کا طواف کرنے لگیں۔عورت تو تھا نہیں' جو پاؤں کو یوں سُوجا اور بھاری ہوتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو جاتا۔اُس نے دوسرا پاؤں آگے بڑھایا' غور سے اُسے دیکھا' اُس کی حالت بھی ویسی ہی تھی۔دونوں پر ورم تھا' ٹخنوں پر زیادہ' پاؤں کے بقیہ حصوں پر قدرے کم۔۔لیکن دونوں پاؤں قدرے پھولے ہوئے دِکھائی دے رہے تھے۔دل کی ایک آدھ دھڑکن ہی غائب ہوئی۔پھر یہی سوچ کر کہ وہ صبح سے اِن پاؤں کو لٹکا کر ہی تو بیٹھا رہا ہے' جیسے مطمئن ہو بیٹھا۔اُس نے پہلے پانی گرم کروایا' اُس میں تھوڑا سا نمک ڈال کر' پاؤں ٹب میں ڈبوئے نہیں بس پانی کی تپش محسوس کرنے کی کوشش کی' آہستہ آہستہ تیزی برداشت ہونے لگی تو اُس نے پاؤں ڈبو دیئے۔بڑا مزہ آیا' یوں محسوس ہوا جیسے گھٹنوں تک تھکن اُتر گئی ہو' لیکن سوجن نے اُترنے کا نام بھی نہیں لیا۔۔اُس کا ارادہ تھا' اگلے روز پاؤں لٹکا کر نہیں بیٹھے گا لیکن اگلا روز آیا' وہ دفتر پہنچا تو کام نے ایسا گھیرا کہ سارے ارادے ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔

چند روز اور گذر گئے۔وہ ایک بار پھر دفتر سے واپسی پر ماں کے پاس بیٹھا اِدھر اُدھر کی ہانک رہا تھا کہ اُس کی نظریں غیر ارادی طور پر اپنے پاؤں کی طرف اُٹھ گئیں۔سوجن اپنی جگہ پر موجود تھی۔اس نے ذہن پر زور ڈال کر یاد کرنا چاہا' صبح جب اُٹھ کر دفتر کے لئے تیار ہوا تھا تو اُس نے پاؤں کا جائزہ لیا تھا یا نہیں۔اور اگر لیا تھا تو اُس وقت۔۔۔۔لیکن صبح کیسی حالت تھی' ذہن کسی نکمے طالب علم کی سلیٹ کی طرح صاف تھا۔یہی طے کر پایا' اگلی صبح ضرور دیکھے گا لیکن۔۔۔آج' اس وقت وہ ٹخنے کی سوجن کو انگوٹھے سے دبا کر تو دیکھ سکتا تھا۔۔واقعی گڑھا اتنا بڑا اور گہرا تھا کہ وہ پریشان ہو اُٹھا۔وہ اپنے فلسفوں اور تشخیص میں ہی اُلجھا رہے گا تو ہو سکتا ہے' بہت دیر ہو جائے۔۔۔۔۔پہلے بیوی اور پھر والدین سے مشورہ کر ہی لیا' سب کا یہی خیال تھا' کوئی ایسی فکر کی بات نہیں۔دو ایک روز دیکھا جائے' نہیں تو ڈاکٹر سے مل لیں گے' ایسی جلدی بھی کیا ہے۔۔

کئی روز نہیں مہینے گذر گئے اور ایک شام سارے بہن بھائی کسی بچے کی سالگرہ منانے کے لئے اکٹھے ہوئے تھے کہ بڑے نے کھانے پینے کی ڈھیروں چیزوں میں سے کسی کو بھی ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا۔چونکنے کی بات تو خیر نہیں تھی کہ بڑے کا جواب واضح تھا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اصرار پر طبیعت میں در آنے والے چڑچڑے پن سے سارے چونک اُٹھے۔

''بھوک کیوں نہیں' آپ دن بھر بھوکے رہ کر ابھی تو دفتر سے واپس آئے ہیں۔دن کو کچھ کھایا تھا کیا؟'' بڑے نے ذہن پر زور ڈالا۔پھر بولا۔۔

''نہیں تو۔دفتر میں تو۔۔میں تو کئی روز سے کچھ بھی نہیں کھا رہا۔بس جی نہیں چاہتا۔گھر آکر بھی لگتا ہے جیسے میں زبردستی لقمے منہ میں ٹھونسے جا رہا ہوں۔۔'' چھوٹے سارے ہی اُس سے ہمدردی جتا کر اور اُسے صحت کا خیال رکھنے کی تلقین کر کے چلے گئے تو بیوی اُسے زبردستی ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔گھنٹوں انتظار کے بعد آدھی رات کے قریب اُس کی باری آئی تو ڈاکٹر نے' جسے گھر جانے کی جلدی تھی' حسبِ توقع اپنے پیڈ پر تین چار ٹیسٹ لکھ دیئے۔اور وہ مسکراتا ہوا بیوی کے پیچھے پیچھے گھر لوٹ آیا۔

''لے بھلے مانس' علاج کروالے۔چھ سو روپے فیس دی ہے نا' ملا کیا' یہ کاغذ کا پرزہ جس پر مزید خرچے کے لئے گورکھی لکھی ہے۔ہو گیا تیرا دل مطمئن؟۔''

اگلی شام ٹیسٹ بھی ہو گئے اور مزید ایک دن ٹھہر کر وہ ایک بار پھر ڈاکٹر کی انتظار گاہ میں دوسرے مریضوں کے بیمار اور صحت مند چہرے پڑھ رہے

تھے۔ان کی باری آئی اور ڈاکٹر کے سامنے پیش ہوئے تو ڈاکٹر نے دوسرے ٹیسٹ تو خیر سرسری سے دیکھ لئے لیکن تسلی نہ ہوئی تو اُس نے ٹیسٹوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست اُن کے ہاتھوں میں تھما دی۔۔وہ جھنجھلایا تو بہت لیکن شیر کے منہ میں اپنا سر ڈال ہی چکا تھا' رونے پیٹنے کا فائدہ؟

اسے یاد آیا' والد کے ایک ڈاکٹر دوست ہوا کرتے تھے۔سارے امراض کا علاج وہی کیا کرتے تھے۔زیادہ سے زیادہ ایک آدھ دوا بازار سے خریدنے کی تلقین کرتے' ورنہ عام طور پر لال رنگ کا محلول دیا کرتے تھے' بوتل بھی اپنے پاس سے دھو دھلا کر دیتے اور معاوضے کے لئے۔۔بس دو نہیں تو چار روپے ہی وصولتے تھے۔پتہ نہیں' اُنہیں کِس کی نظر کھا گئی کہ بیٹھے بٹھائے رُخصت ہوگئے۔وہ زندہ ہوتے تو کِسی اور کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

وہ سوچتا' قصور مریضوں کا بھی ہے۔ایک تو ڈاکٹر کے پاس اُسی وقت پہنچتے ہیں جب پانی سر سے اوپر جا چکا ہوتا ہے۔پھر کِسی ایک ڈاکٹر پر بھروسہ بھی نہیں کرتے۔ڈاکٹر کو بھی اپنا جانگیہ ہی سمجھتے ہیں' ایک نہیں دھُلا ہوا تو دوسرا سہی۔اور ڈاکٹر۔۔۔اُسے مریض سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں دیتے۔مریض داخل ہی بداعتمادی کے ساتھ ہوتا ہے اور ڈاکٹر کا رویہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے وہ مریض اپنے بعد آنے والے کا راستہ روکے کھڑا ہے۔۔

چند ایک عزیزوں اور بہت سے دوستوں کے بتائے ڈاکٹروں کے پاس جانے' اُن کی اِنتظار گاہوں میں اِنتظار کرنے' اُن کی بے توجہی کے باوجود دواؤں کی لمبی چوڑی فہرستیں لے کر دکانوں پر جیب اُلٹنے پر بھی جیسے وہ بڑے دل کا نہیں تو کم از کم بڑے پن کا ضرور ثبوت دے رہا تھا لیکن بات بن نہیں رہی تھی۔ڈاکٹروں کے جب نسخوں کا ڈھیر لگ گیا' دواؤں کے خالی اور بھرے ڈبے سارے گھر میں بکھر گئے اور کالے اور سرخ شربتوں کی زیادہ تر بھری بوتلیں یہاں وہاں لڑھکتی نظر آنے لگیں تو اُس کی طبیعت اُکتانے لگی۔یہ کیا بات ہوئی کہ ایک نہیں دسیوں ڈاکٹروں کے چہرے دیکھ چکا' ادویات کے ذائقے چکھ چکھ کر نڈھال ہو چکا تو اُس نے ایک شام بیٹھ کر اپنے آپ سے پوچھا۔

'آزمانے کو وہ ہر حیلہ آزما چکا ہے' لیکن کوئی دوا کارگر ہی نہیں ہوتی۔ٹخنوں کی سوجن بڑھ کر پاؤں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے اور بھوک ۔۔۔شاید ہفتوں بعد چند لقمے اُٹھانے کی طلب ہوتی تھی۔اب وہ کرے تو کیا کرے۔' اب اُس کا اُٹھنے اور چند قدم اُٹھانے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔دفتر میں اور گھر میں وہ ہر وقت اور ہر جگہ اُکتایا اُکتایا' کھویا کھویا' اُکھڑا اُکھڑا دکھائی دیتا تھا۔

پھر جانے کِس نے اُسے ایک نئے ڈاکٹر کا پتہ دیا جو حال ہی میں طبی تعلیم مکمل کرنے اور تھوڑا بہت تجربہ حاصل کرنے کے بعد واپس آیا تھا۔اپنی روداد ذرا تفصیل سے بیان کی۔حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ڈاکٹر بڑی توجہ سے ساری رام کہانی سنتا رہا۔اِطمینان سے رپورٹوں کا جائزہ لیتا رہا۔پھر سر کھجا کر اُس نے صرف اِتنا مشورہ دیا۔

''کل چھاتی کا ایکسرے کروا کر مجھے دکھایئے۔'' بڑا جھنجھلایا تو بہت کہ ہر دوسرے ڈاکٹر کی طرح یہ بھلا مانس بھی ٹیسٹوں کا نیا سلسلہ شروع کروا رہا ہے لیکن کیا کرتا' ادا کی گئی فیس کا بھرم رکھنے کے لئے اُسے یہ کڑوی گولی بھی نگلنا پڑی۔اگلے روز وہ ایکسرے لے کر پھر سے اِنتظار گاہ میں ایک نشست کے ساتھ چپک گیا۔

باری آئی' ڈاکٹر کی آنکھوں میں شناسائی چمکی۔اُس نے ایکسرے کا لفافہ اُن کے سامنے رکھ دیا۔ڈاکٹر ایکسرے کو روشن شیشے پر لٹکا کر دیکھنے لگا' تو دیکھتا ہی رہا۔پھر ڈبے کا سوئچ آف کر کے اُس سے ایک نہیں بیسیوں باتیں پوچھتا رہا۔کبھی پاؤں کی سوجن کو دیکھتا' کبھی بھوک کے بارے میں بات کرتا اور یہ قصہ ختم ہوتا تو طبیعت کے چڑچڑے پن کو چھیڑ بیٹھتا۔جب یہ مشق بھی ختم ہوگئی تو اس نے اپنے پیڈ پر دواؤں کی لمبی فہرست لکھی اور اُس کے حوالے کر کے بولا۔

''تشویش کی کوئی بات نہیں' آپ یہ دوائیں باقاعدگی سے استعمال کرتے رہیں' اللہ شفا دے گا۔اور مجھ سے بھی ملتے رہیں۔'' اُس نے اُٹھتے اُٹھتے اور ڈرتے ڈرتے ڈاکٹر سے پوچھ ہی لیا۔

''لیکن ڈاکٹر صاحب مجھے ہوا کیا ہے؟'' ڈاکٹر نے نظریں اس کی بیوی پر گاڑ کر جواب دیا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔تھوڑا بہت معدے کا فساد لگتا ہے' ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ باہر نکل رہے تھے یوں کہ وہ آگے آگے تھا اور بیوی پیچھے' ڈاکٹر کے جواب سے اُس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔وہ باہر نکل گیا تو بیوی رک گئی۔

''ڈاکٹر صاحب' تشویش کی تو کوئی بات نہیں؟''

''بات تو ہے۔''

''کیا؟''

''میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔تشویش کی یہ بات نہیں کہ۔'' ڈاکٹر نے رک کر ایک بار پھر رپورٹوں کا جائزہ لیا اور بولا

''تشویش کی بات تو یہ ہے کہ اِس مرض کا کوئی علاج نہیں ہے۔' ہاتھ پاؤں مارنے سے کچھ نہ کچھ مہلت مل ہی جاتی ہے'' بیوی کے لئے جیسے ساری دنیا گھوم گئی۔بولنے لگی تو بات حلق میں ہی پھنس کر رہ گئی۔

''لیکن ڈاکٹر صاحب' پتہ تو چلے اِنہیں ہوا کیا ہے؟ کوئی تفصیل کوئی اشارہ۔۔۔''

''اِن کا دل بڑا ہو گیا ہے' یعنی اپنے حجم سے بڑھ گیا ہے۔کوشش کریں یہ بس خوش رہیں' کھائیں پئیں اور'' ڈاکٹر وہ سارے رٹے رٹائے جملے دہرانے لگا جو ایسے وقت دہرائے جاتے ہیں۔۔۔

☆

''رقص کرنے کی سزا''

عذرا اصغر
(کراچی)

ڈائس پر کھڑے ہو کر جیسے ہی میں نے نظر اٹھائی سامنے پہلی ہی رو میں اُسے بیٹھے دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے میں جیسے گنگ سا ہو گیا۔ بیتے دنوں کی بہت سی تصویریں چشمِ زدن میں میری آنکھوں کے سامنے متحرک ہو گئیں اور مجھے لگا جیسے میں ایک مجرم ہوں اور عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوں۔ بمشکل میں نے خود پر قابو پایا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اتنا تیز کہ اس کی آواز میرے کان سن رہے تھے۔ بے وجہ ہی میں مائیک پر انگلیاں مارنے لگا۔ گویا آواز چیک کر رہا ہوں۔ خود کو بہ دقّت مجتمع کر کے بالآخر میں گویا ہوا۔

''حاضرینِ محفل، خواتین وحضرات۔۔۔۔!''

چند ابتدائی رسمی جملے ادا کر کے میں نے پہلے مقرر کو ڈائس پر آنے کی دعوت دی اور خود اپنی مخصوص کرسی پر جا بیٹھا۔ میں طویل ترین مدت بعد وطن واپس لوٹا تھا۔ اس عرصے میں یہاں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ ترقی تو وقت کا ناگزیر تقاضا ہوتی ہے مگر میرے وطن میں الٹی ہوا چلی تھی۔ اسلامائزیشن کا ایسا چرچہ تھا جیسے پہلی مرتبہ ہم مسلمان ہو رہے تھے۔ اسلام کے نام پر لوگوں کو مارا جا رہا تھا۔ عبادت گاہیں جلائی جا رہی تھیں۔ عورتوں کو جبراً پابند کیا جا رہا تھا۔ ہر طرف ایک خوف وسراسیمگی کی فضا تھی اور اس کے ساتھ ہی زندگی کے دیگر امور بھی جاری تھے۔ میرے کئی اعزا واقربا اور دوست احباب اس نامراد بربریت کا نشانہ بن چکے تھے اور مجھے آہستہ آہستہ ان کے بارے میں پتہ چل رہا تھا۔ میری واپسی کا ابھی کم لوگوں کو علم ہوا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کر پھر میری نظر اس پر جا پڑی۔ وہ بھی جیسے ایک ٹک مجھی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی اور ہونٹوں پر ویسی ہی دلآویز دھیمی دھیمی مسکراہٹ کھیل رہی تھی جو اس کی شخصیت کا جزو تھی۔ اسی مسکراہٹ پر تو میں مرمٹا تھا۔ اور مجھ پر ہی کیا منحصر تھا۔ کالج کا ہر لڑکا اپنی چاہت کا کشکول اٹھائے اس کے پیچھے پھرتا تھا۔ حسین تو وہ یقیناً تھی مگر اپنے حسن کا ادراک شاید اسے نہیں تھا اور بے نیازی اس کی فطرت کا حصّہ تھی۔ کہتے ہیں حسن مغرور ہوتا ہے لیکن صبا کا حسن بے نیاز تھا۔ وہ بے تکلفانہ سب سے ملتی تھی لیکن اتنی آگے کبھی نہ بڑھتی کہ کسی کو غلط فہمی ہو۔ یا جرأت رندانہ۔

زندگی کا خوشگوار ترین زمانہ تعلیمی دور ہوتا ہے۔ دو چار سال تک کالج اور یونیورسٹی میں خصوصیت سے سب ایسے قریب قریب رہتے ہیں جیسے ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔ اور پھر سب اس طرح بچھڑ جاتے ہیں جیسے خزاں کے موسم میں درختوں کے پتّے جھڑ کر ادھر اُدھر بکھر جاتے ہیں اور انہیں بادِ سموم اڑا کر کہیں سے کہیں جا پھینکتی ہے۔

صبا ایک خوش مزاج، ملنسار اور طبقۂ اشرفیہ سے تعلق رکھنے والی لڑکی تھی۔ وہ سب کی دوست تھی مگر میرے ساتھ اس کا رشتہ دل کے تاروں سے جڑ گیا تھا۔ جس کی نہ اسے خبر تھی اور نہ مجھے۔ اس بے خبری میں ہی وہ میرے بہت قریب آ گئی تھی۔ مگر میں کسی اپنائیت کے اظہار کی خود میں ہمت نہ پاتا تھا۔ اس کی وجہ میری کمزوری ہرگز نہیں تھی مگر یہ احساس ضرور تھا کہ اس کا جواب منفی ہوا تو پھر۔۔۔ پھر میں اس کے قرب سے بھی محروم ہو جاؤں گا۔ اس نے کبھی ایسا عندیہ بھی تو نہیں دیا تھا نا بلکہ بے تکلفی کی ایک حد سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ وہ عجب لڑکی رہی تھی۔ نہ نچلی بیٹھ سکتی تھی اور نہ خاموش۔ اس کے رگ وپے میں بجلی بھری ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت کچھ نئے سے نیا کرنے کا سوچتی تھی۔

اس دن وہ بہت خوش تھی۔ میں نے پوچھا۔

''خیر ہے؟ آج غیر معمولی طور پر خوش ہو؟'' بولی:

''میں تو روز ہی خوش ہوتی ہوں۔ تم نے کب مجھے اداس یا غمگین دیکھا؟''

''لیکن آج کوئی خاص بات لگتی ہے'' میں نے یقین سے کہا۔ کہنے لگی۔

''تم اچھے قیافہ شناس ہو''۔

''پھر بتاؤ۔ بات کیا ہے؟''

''اجازت مل گئی۔''

''کاہے کی بھئی۔ کیا شادی۔۔۔۔''

میری بات بیچ سے کاٹ کر بولی۔

''اے نہیں۔ شادی کے لئے تو ابھی میں نے سوچا ہی نہیں''۔

''پھر۔۔۔؟''

''میں ڈانس سیکھنے لگی ہوں۔''

''ارے واہ۔ انگلش لٹریچر میں ماسٹر کرتے کرتے اچانک۔۔۔''

''سنو! میں اصل میں میوزک میں ہی ماسٹر کرنا چاہتی تھی بنگلا دیش یا بھارت سے۔ مگر مجھے جانے نہیں دیا گیا۔ اب بمشکل گھر پر استاد رکھ کر ڈانس سیکھنے کی اجازت ملی ہے''۔ اس نے میری بات مکمل کرنے سے پہلے اپنے پروگرام کی تفصیل بتائی۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' مجھ سے اس نے پوچھا۔

''میرے خیال سے تمہیں کیا لینا دینا''۔ میں نے کہا۔ بہر حال فن فن ہے اور تمہارا شوق''

''اصل میں مجھے آتا تو ہے لیکن جو ہے وہ اب تک میری خود ساختہ کوشش ہے۔ فن کی باریکی سے میں لاعلم ہوں اور پھر یہ کہ مجھے کتھک سیکھنا ہے''۔

یونیورسٹی سے فارغ ہوکر حسبِ معمول سب لوگ بکھر گئے۔ مستقبل کی فکر اور نوکری کی تلاش میں وقت گزرنے لگا۔ صبا سے ملاقاتیں بھی کم کم ہونے لگیں وہ اپنے فن کی آبیاری میں ہمہ تن مصروف تھی بلکہ دو قدم آگے بڑھ کر چیدہ چیدہ ایسے پروگراموں میں حصّہ بھی لینے لگی تھی جہاں اس کا نام بطور ڈانسر اخبارات میں چھپنے لگا تھا۔ کوشش بسیار کے بعد مجھے بھی ایک مقامی کالج میں جاب مل گیا۔ میں نے اسکالرشپ کے لیے بھی اپلائی کر دیا تھا مگر میرے والدین کو میرا گھر بسانے کی جلدی ہوئی۔ لہٰذا لڑکیاں ڈھونڈی جانے لگیں۔ رشتہ دار اور دوستوں کی بیٹیوں کے نام لیے جانے لگے۔ میں نے کہا:

''بھئی شادی ہماری ہوگی تو لڑکی بھی ہماری پسند کی ہونا چاہیے نا''

''ہاں ہاں بتاؤ۔ کوئی پسند ہے تو۔'' بھابھی نے چہک کر کہا۔

''ڈھونڈ رکھی ہوگی کوئی۔'' امّاں نے کہا ''گھنّا ہے یہ بہت''

''اتنی لڑکیوں کے ساتھ پڑھا ہے امّاں۔ ہوگی تو ضرور کوئی نظر میں اور کیا پتہ بات کہاں تک آگے بڑھ چکی ہوگی۔'' باجی نے لقمہ دیا۔

''بتاؤ نہ بھئی'' بھابھی نے اصرار کیا۔

''میں ابھی خود سے کیسے بتا دوں بھابھی۔ پہلے لڑکی سے تو پوچھ لوں''۔ میں نے ہنس کر کہا۔

''کیا مطلب؟ ابھی معاملہ یکطرفہ ہے کیا'' بھابھی نے حیرانی سے پوچھا۔

''ایسا ہی سمجھ لیں''۔ جھینپ کر میں نے کہا۔

ہمارے درمیان کبھی ایسی بات ہوئی کب تھی جو میں یقین کر لیتا کہ وہ بھی میرا ہاتھ تھامنا پسند کرے گی یا نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں اسے پسند ہی نہیں کرتا تھا شاید اسے چاہنے بھی لگا تھا۔ موقع پا کر ایک دن میں نے اس سے کہا:

''میری ماں آج کل لڑکی ڈھونڈ رہی ہیں''

''کیا گم ہوگئی ہے؟'' وہ لاپرواہی سے ہنسی۔

''گم ہی سمجھو۔ تبھی تو تلاش ہو رہی ہے''

''مل جائے تو بتانا'' وہ بے نیازی سے بولی۔ پھر قدرے چونک کر پوچھا۔

''اچھا۔ کوئی خاص لڑکی ہے کیا؟''

''جناب خاص لڑکے کے لیے خاص بلکہ خاص الخاص لڑکی ہی ڈھونڈی جائے گی نا''

''اچھا اچھا۔ سمجھی۔ تو یہ آپ جناب ہیں۔'' وہ شوخی سے بولی۔ ''تو پھر خود ڈھونڈ لو نا تم۔ انہیں کا ہے کا کھپاتے ہو''

''میں نے تو ڈھونڈی ہوئی ہے'' میں نے مسکینی سے کہا۔

''تو بتا دو انہیں''

''کیسے بتا دوں۔۔۔ پہلے لڑکی سے تو پوچھ لوں'' میں نے مزید مظلومی طاری کر لی۔

''کیا پوچھنا ہے؟''

''یہی کہ کیا وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے یا نہیں؟''

''تو پھر پوچھ ڈالو نا''

''پوچھ تو رہا ہوں۔ بتاؤ؟''

اس نے بے حد حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ یکدم گلنار ہوگیا اور خلافِ معمول اس کی پلکیں جھک گئیں اور اس کی زبان گنگ ہوگئی۔ میں نے پہلی بار اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا جو برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا اور اس کے جسم میں لرزش تھی۔ میں نے کہا:

''صبا دراصل اب تک میں شکیل بدایونی کے اس شعر کے مطابق سوچتا تھا کہ:

میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
یہ تبسم، یہ تکلّم تری عادت ہی نہ ہو

''بس اس لیے کسی بھی قسم کا ردِعمل ظاہر نہیں کر سکا۔ اس نے اپنا ہاتھ میری گرفت سے چھڑانے کی قطعی کوشش نہیں کی۔ تب میں نے سوچا۔

''لڑکی بظاہر کیسی ہی چنچل ہو یا بولڈ ہو، بے باک نظر آئے مگر بالآخر وہ لڑکی ہی ہوتی ہے۔ صبا بھی ایک لڑکی تھی۔ نسوانیت سے بھرپور۔ ایک مکمل مشرقی لڑکی۔ میں نے بھابھی سے کہا۔

''لڑکی مان گئی ہے بھابھی''

''پھر اتہ پتہ بتاؤ۔ ہم رشتہ مانگنے جاتے ہیں۔'' بھابھی خوش ہوکر بولیں۔

اور جب میں نے پتہ بتایا تو میرے گھر میں جیسے بھونچال آ گیا۔

''ارے وہ ڈانسر؟ میری بہو بنے گی؟ ہرگز نہیں'' امّاں چلّائیں۔

''تو صاحبزادے ہماری ناک کٹوانا چاہتے ہیں برادری میں'' ابّا جان نے ریمارک پاس کیا۔

بھابھی تو مصلحتاً شاید چپ رہیں کہ گھر کی بہو تھیں مگر باجی نے دبی زبان سے کہا:

''امّاں رقص بھی تو فنونِ لطیفہ کا علم ہی ہے۔ اور پھر یہ ضروری تو نہیں کہ شادی کے بعد بھی وہ اپنا یہ شوق یا شغل جاری رکھے''

''بی بی! تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔ ہم ایسے فنونِ لطیفہ سے باز آئے جو برادری میں منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑے'' امّاں دہاڑیں۔

''مگر امّاں بلال اسے پسند کرتا ہے۔ زندگی اس نے گزارنی ہے'' باجی نے بدستور حمایت جاری رکھی۔

''بلال کی پسند کے پیچھے ہم جیتے جی مر جائیں؟ اپنے خاندان کے منہ پر کالک مل دیں کیا؟'' امّاں اپنے مؤقف پر جمی رہیں۔

باقی صفحہ ۸۳ پر ملاحظہ فرمائیے

''ہم سے تو پرندے اچھے''

امرناتھ دھمیجہ
(لدھیانہ، بھارت)

آج سے ستر سال قبل پاکستان کے ضلع سرگودھا تحصیل خوشاب کے قریب موضع مٹھ ٹوانہ میں جب ہم نے انسانی چولے میں جنم لیا تو ہمارے پریوار میں اتنی خوشی یا شیرنی نہیں بانٹی گئی تھی۔ جیسا کہ عام طور پر بہت سے گھروں میں لڑکا پیدا ہونے پر ڈھیر سارے لڈو بانٹنے کے ساتھ ساتھ خوب ڈھول ڈھمکے تک بجائے جاتے ہیں۔

شاید اس کی دو وجوہات رہی ہوں گی کیونکہ ایک تو ہم ماں باپ کے گھر چوتھے بیٹے کی صورت میں نمودار ہوئے تھے اس لیے جو خوشی پہلے بیٹے کے جنم پر ہوتی ہے وہ بھلا چوتھے بیٹے پر کہاں۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہمارا رنگ روپ بھی ماشاءاللہ کافی حد تک سانولا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں باتیں اپنے آپ میں اتنی اہمیت نہ رکھتیں۔ اگر ہماری پیدائش کے بعد پنڈت جی ہماری جنم کنڈلی بناتے ہوئے ہمارے والد صاحب کو اتنا خوف زدہ نہ کرتے۔ پنڈت جی کا یہ فرمان تھا کہ پیدا ہونے والا بچہ اپنے پتا پر بہت بھاری ہے۔ سوا اس کے پتا چالیس دن تک اپنے بیٹے کی صورت دیکھنے سے گریز کریں نہیں تو گھر میں کوئی انہونی ہوسکتی ہے اگر آپ میری بات پر عمل نہیں کریں گے تو بہت بڑے نقصان کا اندیشہ ہوسکتا ہے۔

پنڈت جی سے بھلا یہ کوئی پوچھنے والا ہوتا کہ دو چار کلو کا بچہ اسّی کلو وزنی باپ پر کیونکر بھاری ہوسکتا ہے لیکن سماجی رسم ورواج کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر گرہستی ان پنڈتوں سے ڈرتے ہوئے اس ذمہ داری کو مجبوراً نبھاتا ہے۔

ہوسکتا ہے ہمارے والد صاحب چوری چھپے ہمارا سانولا معصوم چہرہ دیکھ کر چوم لیتے لیکن ہوا وہی جو پنڈت جی نے بھبوش بانی کی تھی کیونکہ ہمارے پیدا ہونے کے دوسرے دن ہی ہماری دکان میں چوری ہوگئی چونکہ ہمارے والد صاحب حلوائی کی دکان کرتے تھے۔ سو چوروں سے اتنے بھاری بھرکم لوہے کے کڑاہے تو نہ اٹھائے جاسکے البتہ دکان میں جو مٹھائی اور گڑ کے شکر پارے تیار پڑے تھے رات بھر دکان میں بیٹھ کر خوب کھائے اور جاتے ہوئے ہمارے جنم کی خوشی میں اپنے بچوں کے لیے بوری میں بھر کر لے گئے۔ اسے کہتے ہیں دانہ پانی یا قسمت کیونکہ یہ اڑوسی پڑوسی ہماری پیدائش پر دو دن سے مبارکیں دے رہے تھے وہ تو منہ میٹھا نہ کرسکے اور بن بلائے چور سب کچھ کھا گئے۔

صبح ہونے پر ہمارے والد صاحب جب قریبی تھانے میں چوری کی رپورٹ لکھانے گئے تو الٹا دھر لئے گئے۔ تھانیدار صاحب کا کہنا تھا کہ لالہ جی آپ کے نام پر تو قرقی کے وارنٹ اشوع ہو چکے ہیں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ آپ خود حاضر ہوگئے ہم تو آپ کو گرفتار کر کے لانے والے تھے۔

دراصل وارنٹ قرقی کا قصّہ یوں تھا کہ ہمارے بڑے چاچا جی جن کا نام بھگوان داس تھا مٹھ ٹوانے میں اینٹوں کے بھٹوں کا بہت بڑا کاروبار کرتے تھے۔ عدالت میں ان کا کوئی پرانا کیس زیر سماعت تھا۔ بھائی بھائی ہونے کے ناطے چاچا جی کی صورت ہمارے والد صاحب سے اتنی ملتی جلتی تھی کہ بڑے بڑے دوراندیش بھی دھوکہ کھا جاتے تھے۔ جبکہ ہمارے والد صاحب تھانیدار صاحب کو بار بار ہاتھ جوڑ کر یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں دولت رام ہوں نہ کہ بھگوان داس لیکن تھانیدار صاحب تو اس بات پر اڑے تھے کہ توں ہی بھگوان داس ہے۔ قارئین یہ وہ زمانہ تھا کہ جس میں گاؤں سے پٹواری یا تھانیدار اپنی اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر مونچھوں میں تاؤ دیتے ہوئے ایک بار گزرتے وہاں بیٹھے تمام لوگ کھڑے ہو کر ان کی گھوڑیوں تک کو بھی سلام کرتے وجہ اس زمانے میں تھانیدار اور پٹواری کا ہر گاؤں میں اتنا رعب اور دبدبہ ہوتا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب ہمارے چاچا جی بذات خود تھانے میں حاضر ہوگئے تو تھانیدار صاحب بھی دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ ان میں اصلی بھگوان داس کون ہے۔ غرض کہ تھانے میں جتنے بھی اشخاص موجود تھے سب کا ہنس ہنس کے بُرا حال تھا اور تھانیدار صاحب ایک عجیب کشمکش میں گھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ خیر صحیح شناخت ہونے پر والد صاحب کو گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ تھانے کے جھمیلے سے نپٹ کر والد صاحب جب گھر پہونچے اور ہماری والدہ سے مخاطب ہو کر بولے واقعی یہ تمہارا بیٹا ہم پر بہت بھاری ہے۔ جس نے پیدا ہوتے ہی چوری سے تعارف کراتے ہوئے آج ہمیں تھانے تک پہونچا دیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہم عمر کی سیڑھی چڑھنے لگے۔ جب ہم نے پانچ سال کی سیڑھی پر قدم رکھا تو ہمیں اسکول بھیجنے کی تیاری ہونے لگی۔ ہوا یوں کہ ایک دن صبح صبح گھر کے در پر ایک کارندے کے ہمراہ ایک سجی سجائی گھوڑی ہمیں اسکول لے جانے کے لیے تیار کھڑی پائی گئی۔ آپ حیران ہونگے کہ اسکول اور گھوڑی سے کیا مراد۔ بات دراصل یہ تھی اُن دنوں دوسری عالم گیر جنگ کا خاتمہ ہوا تھا لیکن جنگ کے اثرات زندگی کے ہر شعبے میں پھیلے ہوئے تھے۔ جنگ ختم ہونے کے باوجود بازار میں ہر چیز نایاب تھی۔ خاص کر تن ڈھانپنے کے لیے دو چار گز کپڑا بھی نہیں ملتا تھا۔ جیسا کہ آج کے پاکستان میں بڑے زمینداروں کو وڈیرے کہا جاتا ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے ہم ہندو گھرانے اُنہیں ملک صاحب کہہ کر دعا سلام کرتے تھے۔

گاؤں کا ہر بڑا زمیندار سر پر ململ کی پگڑی اور سفید لٹھے کا تہمت باندھے اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر اپنے آپ کو ملک صاحب ظاہر کرنے کی کوشش

کرتا تھا۔ ہماری دکان کے پاس ہی ایک کپڑے دکان تھی۔ کپڑے کی تنگی کی وجہ سے چوری چھپے میری قمیص کے نیچے پیٹ پر باندھ کر ململ کا دوپٹہ یا پھر پگڑی کا کپڑا ملک صاحب کے گھر پہونچانے کا کام لیتے تھے۔ بچہ ہونے کے ناطے کسی کو شک نہیں ہوتا تھا۔ جس ملک صاحب کے ہاں میں چوری چھپے کپڑا پہونچایا کرتا تھا۔ اُنہوں نے بطور ہمدردی اپنے کارندے کے ساتھ میرے اسکول جانے کے لیے گھوڑی بھیجی تھی کیونکہ اسکول کافی دُوری پر تھا اور وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔

پہلے دن تو بڑی شان و شوکت سے گھوڑی پر سوار ہو کر ہم اسکول پہونچے لیکن جب دوسرے دن بستہ اٹھا کر پیدل ہی اسکول جانے کا حکم ہوا تو ہماری حالت قابل رحم تھی۔ کہاں وہ سجی ہوئی گھوڑی اور کہاں پیدل جانے کا حکم نامہ۔ والد صاحب نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔۔۔ بیٹا اب تو تُو پچیس سال بعد سہرا باندھ کر ہی گھوڑی پر سوار ہوگا۔ بستہ اٹھا اور سکول کی راہ پکڑ نہیں تو مار پڑے گی۔

ڈرتے ڈرتے ہم نے اسکول کی ارہ پکڑی اور چل دیئے۔ یہ سلسلہ پانچویں جماعت تک خوش اسلوبی سے چلتا رہا۔ چلتا بھی کیوں نہ کیونکہ ہمارے ماسٹر محترم سند خاں جی اخبار پڑھنے کا ازحد شوق رکھتے تھے۔ اسکول پہونچنے پر ہمیں حکم دیا جاتا کہ جاؤ اناج منڈی کے فلاں بیوپاری سے اردو کا اخبار لے کر آؤ۔ اُس زمانے میں لاہور سے ملاپ، پرتاپ اور زمیندار وغیرہ اردو کے اخبار شائع ہوا کرتے تھے۔ اخبار لانے کا ہمیں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہم راستے میں اخبار کی سرخیاں تو کیا لگ بھگ مکمل اخبار ہی پڑھ لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ پاکستان کے سرکردہ لیڈر سر سکندر حیات خان ہمارے اسکول میں کسی تقریب میں شریک ہونے کے لیے تشریف لائے تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہمیں اُن کے سواگت کے لیے ایک نظم لکھ کر دی۔ سر سکندر حیات خاں کے سواگت میں جب ہم نے نظم پڑھی تو سارا اسکول تالیوں سے گونج اٹھا۔ انعام کے طور پر دس روپے ہمیں اور سو روپے اسکول کو دیئے گئے۔ اُن سو روپوں سے ہماری ہی دکان سے لڈو لا کر تمام سٹوڈنٹ میں بانٹے گئے۔ لڈو کھاتے ہوئے تمام طالب علم ہنسی مذاق میں یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ کم بخت نے داخلے پر تو مٹھائی نہیں بانٹی لیکن آج اس کی نظم نے خوب لڈو کھلا دیئے۔

بدقسمتی سے ۱۹۴۷ء میں ملک کا بٹوارہ ہو گیا اور ہم بمعہ پریوار پاکستان سے کوچ کر کے سیدھے جے پور راجستھان آ گئے۔ وہاں ہم پانچویں جماعت کا امتحان دے کر آئے تھے۔ سوچا جے پور میں چھٹی کلاس میں داخلہ مل جائے گا لیکن یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کیونکہ ہمیں پھر سے پہلی جماعت میں بیٹھنے کو کہا گیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ آپ تو اردو کی پانچویں پاس کر کے آئے ہو یہاں تو ذریعہ تعلیم ہندی ہے۔ مرتے کیا نہ کرتے ایک مرتبہ پھر اپنا وطن اپنا اسکول اور وہ سجی سجائی گھوڑی کی یاد آ گئی۔ لیکن یہاں تو جدھر نظر دوڑاؤ اُونٹ ہی اونٹ نظر آ رہے تھے۔ عمر کے لحاظ سے ماشاءاللہ ہمارا قد کاٹھ تو بڑا تھا لیکن کلاس سب سے پہلی اور چھوٹی۔ سب سے بڑی ستم ظریفی ہمارے ساتھ یہ ہوئی کہ ہمیں کلاس کا مانیٹر بنا دیا گیا۔ پڑھائی کے دوران تاریخ جغرافیہ کے پیریڈ میں تو ہم سٹوڈنٹ کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے لیکن جب ہندی کا پیریڈ آتا تو ہم ماسٹر جی سے مار کھا رہے ہوتے اور ساری کلاس کے بچے ہم پر ہنس رہے ہوتے بڑا ہی عجیب و غریب منظر ہوتا۔ کسی نے سچ ہی کہا جس تن لاگے وہی جانے۔

یہ سلسلہ کوئی دو سال تک چلتا رہا اس کا ہمیں یہ فائدہ ہوا کہ ہم دو سال کے عرصے میں ہندی پڑھنا سیکھ گئے جو آج کام آ رہی ہے۔ کچھ عرصے بعد ہم راجستھان سے پنجاب لدھیانہ آ گئے۔ لدھیانہ آ کر چھٹی جماعت میں داخلہ مل گیا کیونکہ یہاں پنجابی بھاشا کے ساتھ ساتھ اردو کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ساتویں جماعت پاس کی تو حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ لدھیانہ چونکہ انڈسٹریل ٹاؤن تھا۔ سو اپنا کام شروع کر دیا۔ ابتدا ایک چھوٹی سی مشین سے کی، پر ماتما کی برکت اور ہاتھوں کی محنت نے پچاس سال کے طویل عرصے میں صنعتی دنیا میں ایک اہم مقام بنا لیا۔ کاروبار کی مصروفیت کے باوجود بطور شوق کبھی کبھار ٹوٹے پھوٹے الفاظوں میں کوئی افسانہ یا نظم لکھ لیتا ہوں جو کہ اردو یا ہندی اخبارات میں شائع ہو جاتی ہے۔ پچھلے دنوں کلکتہ کے ماہنامہ انشا میں بعنوان سرحدیں ایک افسانہ شائع ہوا تھا۔ جس میں بٹوارے کی کچھ دردیں تھیں حقیقت تھی۔ وہ افسانہ محترم گلزار جاوید ایڈیٹر چہارسو کی نظر سے گذرا تو انہوں نے بطور محبت اپنا رسالہ چہارسو مجھ جیسے ناچیز کو ارسال کرنا شروع کیا نام تو پہلے سن رکھا تھا رسالہ پڑھ کر ازحد مسرت ہوئی اور میرے ذہن میں پڑھنے کے بعد وطن کی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو سی آنے لگی۔ گلزار جاوید صاحب نے افسانہ ارسال کرنے کی تاکید کی تھی لیکن چہارسو کے پڑھنے کے بعد میرے دل میں اپنے وطن کے تئیں کچھ یادیں دبی ہوئی تھیں وہ ایک تحریر کی صورت میں حاضر خدمت ہیں مگر ٹھہریئے! یہاں تھوڑا توقف اس لیے ضروری ہے کہ اس امر پر غور کر لیا جائے کہ ہماری ٹوٹی پھوٹی تحریر باقاعدہ افسانہ، نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر ایک یا ایک سے زائد افسانے سمیٹے ہوئے تو نہیں! ان یادوں کو جسے ہم نے پیارے وطن کے ادب نواز دوستوں کے نام منسوب کیا ہے اور آئندہ بھی ہم سب اسی طرح ایک دوسرے کو اپنی اپنی نیک خواہشات بشکل تحریر و تخلیق اپنا دکھ درد سناتے رہیں گے اور ایک دوسرے کے جذبات اور خیالات کی قدر کرتے ہوئے باہمی رابطوں کو جاری و ساری رکھیں گے اور اپنی اگلی پیڑھی کو تعصب، تنگ نظری کے بجائے محبت و اخوت کا ایسا ورثہ تحفہ میں دیں گے جو ہمارے انسان ہونے کی دلیل ہوگا جس طرح میرے ذہن میں، مٹھہ ٹوانہ، ہڈالی، خوشاب اور سرگودھا بسا ہوا ہے اسی طرح میرے اُن بھائیوں کو جو یہاں سے ہجرت کر کے گئے ہیں اپنے گاؤں اور شہروں کی ضرور یاد آتی ہوگی۔ اور دل میں ایک ہوک سے اٹھتی ہوگی۔ اُن کا دل بھی ہمارے دل کی طرح اس شعر کا ورد ضرور کرتا ہوگا:

ہم سے تو پرندے اچھے جو مست رہتے ہیں اپنی اڑان میں
دانہ دُنکا چگتے ہیں بھارت میں اور ناشتہ کرتے ہیں پاکستان میں

''دعوتِ حشر''

سید مشکور حسین یاد
(لاہور)

کونین کو کُن پہ لا رہے ہیں
ہم اپنے عقب میں جا رہے ہیں

ہم آنکھوں پہ کر رہے ہیں جادو
تصویر وہی دکھا رہے ہیں

کیا دیکھئے حشر ہو ہمارا
باتیں تو بہت بنا رہے ہیں

ہم پاس کو دُور کر رہے ہیں
ہم دُور کو پاس لا رہے ہیں

ہم دعوتِ حشر دے رہے ہیں
ہم اپنا پتا بتا رہے ہیں

پہچان نہیں رہے ہیں خود کو
ہم ہوش میں جب سے آ رہے ہیں

تصویر سے سب نکل نہ جائیں
تصویر میں ہم جو آ رہے ہیں

اب دیکھنا رونقِ جنوں یادؔ
ہم خود کو رچا بسا رہے ہیں

○

محمود الحسن (راولپنڈی)

تشویش کس لیے ہو مجھے احتساب کی
مجھ پہ نگاہِ لُطف و کرم ہے جناب کی
دیکھا تھا اُس نے یوں مجھے میرے سوال پر
حاجت نہیں رہی مجھے اُس کے جواب کی
اُس خوش گلو کے سامنے آئے کسے مجال
بُلبل کا ہو وہ نغمہ کہ لَے ہو رُباب کی
کچھ لوگ اس طرف بھی ہیں تاریکیوں میں گُم
یارب اِدھر بھی کوئی کِرن آفتاب کی
میری نظر میں باعثِ توقیر ہے عمل
باقی کہانیاں ہیں گناہ و ثواب کی
وہ عطر بیز لب ہیں کہ خوشبو ہے ہر طرف
نسرین و نسرن کی سمن کی گُلاب کی
ہم نے سُنی ہے آپ کے شیریں دہن کی بات
اب ہم سے کوئی بات نہ ہو شہدِ ناب کی
ساقی کی چشمِ مست کو جب دیکھتے ہیں ہم
رقصاں دکھائی دیتی ہیں موجیں شراب کی
غارِ حرا کی شمعِ فروزاں کے فیض سے
محفل جمی ہوئی ہے مہ و آفتاب کی
اس کے سوا تو کچھ بھی نہیں موسمِ بہار
رنگین داستاں ہے تمہارے شباب کی
ہر لحظہ اِک سُرور میں ڈوبے ہوئے ہیں ہم
مدحت رواں ہے لب پہ رسالت مآبؐ کی
محمودؔ آج ہو گئی اُن کی بھی آنکھ نم
جب اُن سے بات کی دلِ خانہ خراب کی

○

سرُور انبالوی

(راولپنڈی)

کسی صورت عیاں سوزِ دلی ہونے نہیں دیتے
کبھی ہم سرنگوں اپنی خودی ہونے نہیں دیتے

ہمارے ضبط کے معیار کی رفعت کے کیا کہنے
کہ ظاہر خود پہ بھی دل کی لگی ہونے نہیں دیتے

ہزاروں تتلیاں رقصاں ہیں دامانِ تخیل میں
کبھی نظروں کو رنگوں سے تہی ہونے نہیں دیتے

فصیلِ شہر پر خُوں سے چراغاں کر دیا ہم نے
تمہارے راستے میں تیرگی ہونے نہیں دیتے

غمِ دوراں ہُوا رخصت غمِ جاناں کو لے بیٹھے
ہم اپنے دردِ دل میں تو کمی ہونے نہیں دیتے

یہ جو ہمدرد ہیں میرے، یہ جو ہمدرد ہیں اُن کے
یہی تو اُن سے ربطِ باہمی ہونے نہیں دیتے

کوئی پودا اُگا ہمسائے فوراً کاٹ دیتے ہیں
یہ میرے صحن میں سایہ کبھی ہونے نہیں دیتے

سرُور انبالوی اُونچے مکاں روشن تو ہیں لیکن
غریبوں کے گھروں میں روشنی ہونے نہیں دیتے

○

آصف ثاقب

(بوئی، ہزارہ)

اکیلی جان ہے اور آسرا نہیں کوئی
یہ میرا گھر ہے جہاں پوچھتا نہیں کوئی

یہاں کے خرد و کلاں صورتیں کہاں دیکھیں
مرے مکاں میں کہیں آئینہ نہیں کوئی

سب اپنے اپنے قرینے سے بات کرتے ہیں
زبانِ دل سے یہاں بولتا نہیں کوئی

نظر بچا کے تمہیں دیکھنا ہے چاروں طرف
مری نظر میں اگر دوسرا نہیں کوئی

تم اپنی اپنی کہانی سُنا چکو تو سُنو
سوائے عشق مرا ماجرا نہیں کوئی

قیاس یہ نہ کبھی نذرِ بدگمانی ہو
بھرے جہاں میں یہاں آپ سا نہیں کوئی

یہ تیری میری طبیعت کی بات ہے ثاقبؔ
ہمارے بیچ اگر مسئلہ نہیں کوئی

○

غالب عرفان
(کراچی)

ہَوا کی دستک سنائی دی تو شعور جاگا
سلگ رہا تھا جو میرے اندر وہ طُور جاگا

سمندروں نے حیات کی ابتدا جگائی
زمین پر زندگی کا تحت الشعور جاگا

نظر میں تشکیل پا رہا تھا جو خواب صورت
وہ سچ ہُوا تو مری پہنچ سے دُور جاگا

نہ جانے کیسے سفر کی جانب نکل پڑا میں
کہ دشت میں گُم ہُوا تو دل کا سُرور جاگا

ملی ہے دولت بغیر محنت تو لہجہ بدلا
جو سوچ بدلی تو ذہن میں کچھ فُتور جاگا

اُداس و تنہا، غُنودگی میں تھا غرق لیکن
کھُلیں جو آنکھیں تو پھر میں اُس کے حُضور جاگا

صدا بہ صدا نوائے عرفاںؔ ہوئی تھی پھر بھی
بکھر گئی ہے جو آخرِ شب تو نُور جاگا

○

سریواستورندؔ
(نوئڈا، بھارت)

چند دھبّے رینگتے دیوار پر در پر چلے
وہم کے مانوس سائے گمانوں بھر چلے

اِک شفق پھیلی ہوئی ہے جسم و جاں سے روح تک
لمس کے جگنو فضا میں شعلگی بھر کر چلے

جب سرابوں سے مسلسل جنگ کا اعلان تھا
کیوں مرے سائے مرے پیچھے لہو میں تر چلے

اِک عجب غائب سا منظر تھا دھوئیں کی صف کے پار
پشت پر لادے ہوئے دن کے خرابے گھر چلے

ہم نے دیکھا ہے سمندر کا سُلگتا احتجاج
بادبانوں میں جو ہم طغیانیاں بھر کر چلے

تہہ بہ تہہ جمتی چلی جاتی ہے سنّاٹوں کی گرد
کچھ گھڑی تو گھر میں سنّاٹوں کا شور و شر چلے

دفعتاً جب گُم ہوا احساسِ لاسمتی تو پھر
ہم سنہری خاک کے پیچھے تجسّس بھر چلے

مخملی سے راستے ہم کو میسّر تھے کہاں
ہم تو پوری زندگی اے رندؔ کانٹوں پر چلے

○

انتظار باقی

(جھنگ)

کچھ سفر عمر بھر نہیں ہوتے
عزم ہوتا ہے ، پر نہیں ہوتے

ان کو دستار بخشتے ہیں وہ
جن کے کاندھوں پہ سر نہیں ہوتے

ہم نے دیکھی ہیں ایسی دیواریں
درز ہوتی ہے در نہیں ہوتے

عُمر بھر کے سفر پہ نکلیں جو
ایسے لوگوں کے گھر نہیں ہوتے

پانیوں کے سفر سے لوٹے ہیں
پاؤں خشکی پہ دھر نہیں ہوتے

اس جگہ تو زمین بوس نہ ہو
خشک پتّے ادھر نہیں ہوتے

جب جنوں کی اذان ہوتی ہے
پھر کوئی خشک و تر نہیں ہوتے

اب ہے ٹھہراؤ کی طلب ہم کو
اب مسلسل سفر نہیں ہوتے

ہم ہی ہوتے ہیں بے بصر باقیؔ
آئنے بے بصر نہیں ہوتے

○

حمیدہ معین رضوی

(لندن)

یاد کے قافلے ہو گئے جب رواں
سوچ کے سلسلے رکتے ہیں پھر کہاں

سنگلاخوں سے کتنے گزر آئے ہیں
منزلوں کا نہیں ملتا پھر بھی نشاں

کتنے بے مہر موسم تھے جن سے لڑے
اور ہوتا رہا زندگی کا زیاں

ایک چہرہ تھا لاکھوں میں جو کھو گیا
ڈھونڈے جسکو ہوا ڈھونڈے جسکو سماں

وہ ہی کچلے گئے، وقت کی دوڑ میں
خوابِ غفلت میں سوتے رہے جو یہاں

جبر کا ہم ہی بنتے نشانہ رہے
کیونکہ سیکھا نہ ہستی کا رازِ نہاں

عید میں ہم نے اس بار خوشیاں نہ لیں
کیونکہ ہر گھر میں تھے لوگ ماتم کناں

○

پروازانبالوی
(انبالہ، بھارت)

سُورج بھی سفر میں ہے ہوا بھی سفر میں ہے
میرا چراغ ہے جو اکیلا ہی گھر میں ہے

میں ڈھونڈھتا پھرا ہوں ستاروں کے آس پاس
اُس شخص کو جو ہر گھڑی جان وجگر میں ہے

بادل گرج رہے ہیں سروں پر ہے کالی رات
ایسے میں کون ہے جو ابھی تک سفر میں ہے

رہ رہ کے لڑکھڑاتی ہے گھر کے دئے کی لَو
کوئی ہوا ضرور ہمارے ہی گھر میں ہے

جلتا رہا ہے کس لیے جنگل تمام رات
پُوچھو ذرا ہوا سے جو ہر دم سفر میں ہے

دل کی اٹاریوں سے پرندے سب اُڑ چکے
وحشت کا ایک رقص مرے بام ودر میں ہے

پرواؔز! دُور تو نہیں وہ حُسنِ بے مثال
کوئی نہ کوئی نقص تمہاری نظر میں ہے

○

صدیق شاہد
(شیخوپورہ)

اسیرِ قریۂ وحشت ہی کیوں رہا جائے
بہ رنگِ نو ہی ترے غم کو اب لیا جائے

بدل کے دیکھا ہے سو بار قالبِ اظہار
تجھے یقیں ہی نہ آئے تو کیا کیا جائے

یہ جبر کیا ہے ترا ہم وفا شعاروں پر
ترے ستم کو کرم جان کر سہا جائے

اٹھا کے دیکھ بھی لیں گے عذابِ دربدری
ہمارے حصے کا پہلے ہمیں دیا جائے

ہماری وضع اگر ناگوار ہے اس کو
تو جیسے کہتا ہے اسی طور سے رہا جائے

اسے خبر ہی نہیں ہم پہ کیا گزرتی ہے
چراغِ یادِ عزیزاں مگر جلا جائے

○

نسیمِ سحر (جدہ)

رہگذر پر سے پسِ راہگذر لے آئے
یہ مرے پاؤں مجھے آج کدھر لے آئے!
اِس تسلسل سے تو دل اُوب چکا ہے اپنا
کاش اب کوئی نئے شام و سحر لے آئے
پُرسکوں کیوں ہے سمندر، مری خواہش یہ ہے
میری کشتی کے لئے جلد بھنور لے آئے
میرے صحرا کی طرف عزمِ سفر کرتے ہی
دوست کانٹوں سے بھرا زادِ سفر لے آئے
اِس کی آوارہ خرامی سے پریشاں ہوں بہت
میرے سائے کو کوئی زیرِ شجر لے آئے
یہ ترا شہر سمندر ہی نہ ہو جائے کہیں
اِک سمندر سا جو ہم آنکھوں میں بھر لے آئے
ہم نے جب مسئلۂ زیست کی تفصیل کہی
نسخۂ مرگ کئی اہلِ نظر لے آئے
اپنا مٹّی کا دِیا پھر بھی نہ دوں گا اُس کو
چاہے بدلے میں کوئی شمس و قمر لے آئے!
روشنائی جو ہوئی ختم تو لکھنے کے لئے
وہ جنوں طاری تھا، ہم خونِ جگر لے آئے
پھر اُسے کون بچا سکتا ہے بربادی سے؟
اپنے دشمن کو بھی دانستہ جو گھر لے آئے
قبل از مرگ مجھے بھرنی ہے ایک اَور اُڑان
کوئی جائے، مرے ٹوٹے ہوئے پَر لے آئے
میرا جانا تو نہ ممکن ہو اُدھر اب شاید !
اُس کے کوچے سے کوئی میری خبر لے آئے
اتنا آساں نہ سہی، پھر بھی نہیں ناممکن
وقت وہ لمحہ کبھی بارِ دگر لے آئے
دستِ قدرت کا تراشا ہوَا شہکار تھا وُہ
سامنے جس کو مرے دستِ ہنر لے آئے
مِل گئے خاک میں ہم جس کی تمنّا میں نسیمؔ
وہ سحر اَور کوئی خاک بسر لے آئے !

انوار فیروز
(راولپنڈی)

لوگ اندھے سفر پر جاتے ہیں
رہبروں سے فریب کھاتے ہیں

روز صحرا نیا بساتے ہیں
ہم گلستاں میں کب سماتے ہیں

تم تلاطم کی بات کرتے ہو
لوگ ساحل پہ ڈوب جاتے ہیں

کیوں بجھائیں گی آندھیاں ہم کو
ہم تو ان میں دیئے جلاتے ہیں

لوگ سارے ہی بن گئے وحشی
روز مقتل نئے سجاتے ہیں

ہے یہ دنیا تو چار دن کی فقط
جانے کیوں لوگ بھول جاتے ہیں

شہر یہ پتھروں کا ہے انوارؔ
حالِ دل ہم کِسے سناتے ہیں

○

مہندر پرتاپ چاند
(انبالہ، بھارت)

رَہینِ درد ہوا، وقفِ رنج ویاس ہوا
بچھڑ کے تجھ سے ،مرا جی بہت اُداس ہوا

سجا رہا ہوں سرآنکھوں پہ خاکِ پاک اس کی
اسی دیار میں دلِ غم سے رُوشناس ہوا

جہاں میں یوں تو میسّر ہوا دوام کِسے؟
مگر وہ گُل جو بہاروں میں بے لِباس ہوا!

تمہیں بھُلا کے بھی کھویا سکونِ قلب ،مگر
تمہارے ذکر سے بھی میں بہت اُداس ہوا

اَزل سے عشق کی تقدیر میں تھی محرومی
مگر اِسی کی تپش سے یہ حق شناس ہوا

سمجھ سکا نہ کوئی اس کے دردِ پنہاں کو
وہ قہقہہ میرے اشکوں کا جو لباس ہوا

عزیز تر نہ ہو کیوں چاند !اس کی یاد مجھے
وہ سانحہِ جو مری فکر کی اساس ہوا

○

ڈاکٹر پنہاں
(یو۔ایس۔اے)

کاش یہ خواب حقیقت ہو جائے
تیری دنیا مری جنت ہو جائے
خود پہ آ جائے یقیں انساں کو
معتبر دل کی شریعت ہو جائے
نوعِ انساں ہے بہت خاص تو پھر
عام اخلاص و مروت ہو جائے
آس باقی ہے تو امکاں باقی
شامِ غم صبحِ مسرت ہو جائے
گرد ہو کیوں مرے آئینوں پر
صاف ہر دل سے کدورت ہو جائے
ہوگئی ہے مری دنیا بیمار
ٹھیک انساں کی طبیعت ہو جائے
ہو محبت سے محبت سب کو
اور نفرت سے ہی نفرت ہو جائے
قلبِ انساں ہو پنہ گاہِ جہاں
اس میں آفاق سی وسعت ہو جائے
وسعتِ دشتِ جنوں لا محدود
بیکراں میری محبت ہو جائے
آسماں جھک کے زمیں کو چومے
زندگی خواب کی صورت ہو جائے
خوف آتا ہے کہ خود میں نہ کہیں
دفن زندہ کوئی عورت ہو جائے
درد کچھ اور بنامِ درماں
دل کی کچھ اور مرمت ہو جائے
اس تعیش کا ہے عادی مرا دل
م نہ یہ درد کی دولت ہو جائے
دل نے کی ہیں جو خدا سے باتیں
کوئی سن لے تو مصیبت ہو جائے
تیری پنہاں ہے کنیزی میں تری
شاعری کچھ تری خدمت ہو جائے

نام کیا دوں؟

حنیف باوا
(جھنگ)

میرے گھر کے بالمقابل ایک وسیع وعریض کوٹھی تھی ۔ وہ کوٹھی سیٹھ عبدالمالک کی ملکیت تھی جو اب بوڑھے ہو چکے تھے۔ اب وہ ماشاء اللہ پوتوں، پوتیوں، نواسوں اور نواسیوں والے تھے۔ اب یہ کوٹھی ان کے دو بیٹوں اور چار پوتوں اور دو پوتیوں کے تصرف میں تھی۔ اب سیٹھ عبدالمالک کسی کام کے نہیں رہے تھے لہٰذا اب وہ اپنا تمام وقت کوٹھی کے وسیع لان میں بیٹھ کر گزارتے۔ لان میں مختلف قسم کے پیڑ تھے جن کی ٹہنیوں اور پتوں کے جھرمٹ میں طرح طرح کے پنچھی چہکتے رہتے تھے۔

گرمیوں میں سیٹھ عبدالمالک ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھے ان پرندوں کے میٹھے گیت سنتے رہتے اور ان کی معصوم حرکات سے لطف اندوز ہوتے۔ کبھی کبھار ان پیاروں کو دیکھ کر اُن کے چہرے پر مسکراہٹ آجاتی جیسے انہیں اُن سے خاص لگاؤ ہو گیا ہو۔

سیٹھ عبدالمالک ہمیشہ سفید لباس زیب تن کئے رکھتے جو اُن کے بوڑھے جسم پر خوب پھبتا تھا۔ سر پر کپڑے کی ٹوپی بھی سفید براق سی ہوتی۔ اُن کے جوتے بھی پالش سے چمک رہے ہوتے۔ اُن کی چھڑی بھی نفیس قسم کی تھی۔ جس کے سہارے وہ چلتے پھرتے تھے شاید یہ تنہائی انہیں کچھ زیادہ راس نہیں آئی تھی تبھی تو اُن کے چہرے پر ناگواری کے آثار کچھ کم نہ ہوتے۔ جب چائے کا وقت ہوتا تو اُن کا کوئی پوتا چائے کی پیالی لا کر اُن کی تنہائی میں کچھ دیر کے لیے مخل ہوتا۔ جب پیالی سیٹھ جی کے ہاتھ میں ہوتی تو اُن کا پوتا کوئی بات کئے بغیر فوراً سے چلا جاتا۔ اُس کے آنے سے تنہائی کے بدن پر جو ذرا سی خراش پیدا ہو چکی ہوتی اُس کے جانے کے بعد وہ فوراً مندمل ہو جاتی۔ جب کبھی اُن کے پوتے پوتیاں اُن کے ساتھ کھیلنے کے لیے آجاتے تو وہ جیسے کِھل اُٹھتے اور بچے اُن کے ساتھ اور وہ ان کے ہمراہ دل بہلانے لگتے۔ جب اُن کی مائیں اُنہیں یہ کہہ کر واپس بلالیتیں۔

''بیٹے آجاؤ۔ تمہارے ہوم ورک کا وقت ہو گیا ہے۔ جلدی آؤ اور آ کر ہوم ورک کرو''۔ جب وہ چلے جاتے تو سیٹھ عبدالمالک بجھ سے جاتے۔ بڑے پوتے پوتیاں جب ننھے ننھے تھے تو وہ بھی اپنے دادا کے ساتھ کھیلنے آجایا کرتے لیکن چونکہ اب وہ کچھ بڑے ہو گئے تھے اور وہ کبھی کبھار ہی ادھر کا رُخ کرتے۔

رات کو جب سونے کا وقت ہوتا تو اُن کا بڑا بیٹا عبدالرسول بس اتنا کہہ کر واپس چلا جاتا:

''ابا جی آئیں اب کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ آ کر کھانا کھالیں''

بیٹے کی یہ بات سُن کر وہ نزدیک پڑی ہوئی چھڑی اُٹھاتے اور اُسے آہستہ آہستہ ٹیکتے ہوئے اندر چلے جاتے۔ یہ سیٹھ عبدالمالک کا روز کا معمول تھا۔ کھانا کھانے کے دوران ڈائننگ ٹیبل کے دونوں طرف بیٹھے ہوئے گھر کے دوسرے افراد سے وہ بات کرنے کی کوشش کرتے تو انہیں اُس وقت مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا جب دوسرے افراد کی خوش گپیوں میں ان کی وہ بات پس کر رہ جاتی۔ اور وہ ان کا منہ تکتے رہ جاتے۔ جب وہ کھانا زہر مار کر چکتے تو اسی طرح خاموشی سے چھڑی ٹیکتے ہوئے واپس اپنی جگہ پر آجاتے۔

سردیوں کے موسم میں وہ تمام دن اپنے مخصوص کمرے میں لحاف میں دبکے رہتے لیکن لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کو وہ سدا کھلی رکھتے تاکہ باہر لان میں پھدکتی چڑیوں سے اُن کا رابطہ رہے۔ یہی پرندے ہی تو اب اُن کے پوتے پوتیاں ہوتے جنہیں دیکھ کر اُن کا زندگی سے جڑے رہنے کا احساس کبھی نہ مرتا۔ جب ہوا چلتی تو پتوں کی کھڑکھڑاہٹ جو موسیقی پیدا کرتی اُسے سن کر خود اُن کا گنگنانے کو جی چاہنے لگتا۔ جب صبح کے وقت انہیں دھوپ پیاری لگتی تو وہ چھڑی کے سہارے باہر لان میں پڑی اپنی مخصوص چیئر پر آ کر بیٹھ جاتے۔ یہ کرسی ہمہ وقت وہیں پڑی رہتی۔

گرمیوں کے دن تھے۔ اُس روز سورج غروب ہونے سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پیشتر سیٹھ عبدالمالک اپنی کوٹھی کے مین گیٹ سے باہر نکلے اُن کے ساتھ اُن کا بڑا پوتا صہیب جو آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا اُن کے ساتھ تھا۔ سیٹھ نے ململ کا باریک لباس پہن رکھا تھا۔ یہ بھی حسب معمول سفید رنگ کا تھا۔ سر پر ٹوپی بھی سفید تھی۔ انھوں نے سیاہ رنگ کے جوتے پہن رکھے تھے۔ جب اُنھوں نے دائیں ہاتھ کی چھڑی کے سہارے باہر کی جانب قدم بڑھایا تو میں بھی بازار سے سودا سلف لانے کے لیے اپنے گھر سے نکل پڑا۔ سیٹھ جی کچھ دنوں کے وقفے کے بعد اپنی بیٹی رووفا سے ملنے محلّہ دُھپ سڑی جایا کرتے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ آج بھی اپنے بڑے پوتے کے ہمراہ اسے ہی ملنے جا رہے تھے۔ محلّہ دُھپ سڑی مین بازار سے دائیں جانب واقع تھا لیکن وہاں جانے کے لیے بازار میں سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ ویسے تو وہ اپنے کسی بیٹے کی گاڑی پر سوار ہو کر بھی جاسکتے تھے لیکن وہ پیدل چلنے میں ہی سکون محسوس کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ وہ بازار کی اسی بھیڑ میں رہ کر اپنے کاروبار کے سلسلے میں لوگوں سے ہمیشہ رابطے میں رہتے تھے لیکن جب سے انہوں نے کاروبار سے علیحدگی اختیار کی تب وہ ان لوگوں سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ اب وہ پیدل چل کر یہ محسوس کرتے تھے کہ جیسے وہ پھر سے اُن میں گھل مل گئے ہوں چونکہ میں نے بازار جانا تھا اس لیے میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ چلتے چلتے میں نے پہلے سیٹھ صاحب سے سلام عرض کیا پھر اُن کی

صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے بڑھاپے کی کمزوری کے باوجود میرے سوالوں کا جواب بڑے توانا لہجے میں دیا۔ ان کے اس لہجے کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے انہیں مدتوں بعد ایسے سوالوں سے واسطہ پڑا ہو۔ اس کے بعد مجھے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑی۔ اُن کی جانب سے باتوں کا سیلاب سا اُمڈ آیا تھا۔ اب تو ان کے اندر سے باتیں ایسے باہر آ رہی تھیں جیسے مدتوں سے لگے خاموشی کے بند کو توڑنے کا آج ہی موقعہ ملا ہو۔ کبھی اُن کے بچپن کے واقعات بہے چلے آ رہے ہیں جن پر زیادہ تر ان کے کھلنڈرے پن کی چھاپ تھی۔ جب وہ الفاظ اُن کے لبوں سے پھسلتے تو ان کے چہرے پر ماضی تہوں میں تحلیل شدہ بچپنا پھر سے اُبھر آتا۔ جب ان کی باتوں سے چھن کر اُن کا عہدِ شباب سامنے آتا تو ان کے انگ انگ میں جوانی کا بانکپن لہک اٹھتا۔ جب وہ بڑھاپے کی یخ بستگی کا رونا رونے لگتے تو اُن کے سارے وجود سے پژمردگی جھلکنے لگتی۔ ایسی صورت میں چھڑی پر اُن کا اعتماد بڑھ جاتا اور وہ اس کے سہارے سست روی سے چلنے لگتے۔ جب وہ اپنے ماضی کے خوشگوار واقعات کرید کر سامنے لاتے تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل جاتی۔ ایسی صورت میں وہ چھڑی کو بغل کے حوالے کر کے بڑی خود اعتمادی سے پاؤں اُٹھانے لگتے۔ جب کسی وجہ سے افسردگی پھر سے انہیں گھیر لیتی تو وہ پھر سے چھڑی کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے۔ اس سارے وقت میں ان کا پوتا ہم سے بے دھیان ہو کر ایسے آگے آگے چلتا جیسے دادا کی باتیں اُس کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی ہوں۔ آخر وہ لیٹنی کی جانب مڑ گئے اور میں بازار سے سودا سلف لینے میں مصروف ہو گیا۔

سیٹھ عبدالمالک کے دو بیٹے تھے دونوں نے پاور لومز کی اُس وسیع و عریض فیکٹری کو سنبھال رکھا تھا جسے سیٹھ صاحب نے بڑے پاپڑ بیل کر اسٹیبلش کیا تھا۔ چونکہ سیٹھ صاحب اب بوڑھے ہو گئے تھے اور فیکٹری کو سنبھالنا اب ان کے لیے ممکن نہیں رہا تھا اس لیے انہوں نے اُس فیکٹری کو اپنے دونوں بیٹوں کو سونپ دیا تھا۔ اب سیٹھ جی اپنے کام سے پوری طرح لاتعلق ہو کر کوٹھی کے لان میں ہمہ وقت بیٹھے رہتے۔ بیٹے فیکٹری کے انتظام میں تمام دن اس قدر مصروف رہتے کہ اُنہیں اپنے والد سے دو باتیں کرنے کی بھی فرصت نہ ہوتی۔ اگر کبھی اُنہیں تھوڑا بہت وقت مل جاتا تو وہ اپنے ابّو سے فقط اتنا پوچھتے۔

''ابّو جی آپ کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں۔ کھانا وانا اور چائے وائے وقت پر مل جاتی ہے''۔ سیٹھ صاحب منہ سے کچھ نہ بولتے ''بس سر کو تھوڑی جنبش دے کر ہاں میں جواب دیتے''۔ جب وہ اتنا کہہ کر وہاں سے چلے جاتے تو وہ پھر سے پرندوں سے محوِ گفتگو ہو جاتے اُن کی اس محویت کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ پرندوں کی زبان کو پوری طرح سمجھ رہے ہوں اور پرندے بھی سیٹھ صاحب کی پیار بھری باتوں کے اس قدر گرویدہ ہو چکے تھے کہ وہ درختوں کو چھوڑ کر اُن کے گرد چکر لگانا شروع کر دیتے اور وہ انہیں اپنے کھانے سے کچھ حصہ بچا کر اُن کے سامنے ڈال دیتے اور کہتے:

''کھاؤ بیٹا۔ خوب جی بھر کر کھاؤ۔ کھاتے بھی جاؤ اور مجھ سے باتیں بھی کرتے جاؤ''

وہ معصوم پرندے جیسے اُن کی بات کو سمجھ رہے ہوتے اسی لئے تو وہ اپنا چوگا چگتے ہوئے چہک رہے تھے اور سیٹھ عبدالمالک خاموشی سے ان کی چہک میں چھپے ہوئے میٹھے سروں سے لطف اندوز ہوتے۔

سیٹھ صاحب کی زندگی انہیں معصوم پنچھیوں کے درمیان رہ کر گزر رہی تھی۔ اسی ڈگر پر چلتے ہوئے لان میں کھڑے پیڑوں کے پتوں کی سرسراہٹ کو دل میں اتار کر پرندوں کی اُچھل کود سے لطف اٹھاتے ہوئے سیٹھ جی کی عمر کے مزید تین برس ماضی کے اندھے کوئیں میں اُتر گئے اور وہ مزید بوڑھے ہو گئے۔ دوسرے لوگوں کو تو چھوڑیئے اُن کے اپنے اُن سے گفتگو سے گریزاں رہنے کے باعث آہستہ آہستہ اُن کی سماعت لفظوں کے سحر سے دُور ہوتی جا رہی تھی۔ اب تو آنگن کے بوڑھے پیڑ اور معصوم پرندے ہی اُن کے ہمدم تھے۔

اُس روز سردی کچھ زیادہ ہی تھی سیٹھ عبدالمالک لحاف میں دبکے بیٹھے تھے۔ آج وہ معمول سے زیادہ افسردہ دکھائی دے رہے تھے۔ اُن کے سامنے والی کھڑکی تو کھلی تھی لیکن اُنہیں وہ پرندے کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ بھی سردی سے بچنے کے لیے اپنے اپنے ٹھکانوں میں چھپ کر بیٹھے تھے۔ آج اُن سے باتیں کرنے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ پیڑ بھی خاموشی کی ردا اوڑھے کھڑے تھے جس کی وجہ سے آج انہیں تنہائی کا احساس کچھ زیادہ ہی ستا رہا تھا۔

سورج کب کا غروب ہو چکا تھا اور شام کی کوکھ سے رات جنم لینے والی تھی اُن کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ آج انہیں کھانے کے لیے اندر نہیں بلایا گیا تھا۔ آج اُن کا بڑا بیٹا کھانا لے کر آیا۔ کھانا چارپائی کے نزدیک پڑی میز پر رکھنے کے بعد وہ اُن سے کہنے لگا۔

''ابا جی کھانا کھا لیجیے''

بیٹے کی بات کو انہوں نے کوئی اہمیت نہ دی۔ بس چپ چاپ کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے جیسے اُن کی نظریں اُن ساتھیوں کی تلاش میں ہوں جو سرد موسم کی وجہ سے اُن سے کچھ دیر کے لیے جدا ہو گئے تھے۔

''ابا جی کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ کھا لیجیے''

اب کی بار بھی سیٹھ جی نے بیٹے کی بات پر کوئی توجہ نہ دی بس ٹکٹکی باندھ کر باہر لان کی طرف جھانکنا جاری رکھا۔

''ابا جی کیا بات ہے۔ آپ کھانا نہیں کھا رہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''کچھ نہیں'' باپ نے مختصر سا جواب دیا۔

''کچھ تو ہے جس نے آپ کو اس قدر افسردہ کر رکھا ہے''

''میں نے کہا نا کچھ نہیں''۔ قدرے ترش لہجے میں جواب دیتے ہوئے سیٹھ صاحب نے کہا اُن کے کرخت لہجے کو دیکھتے ہوئے بیٹا خاموش ہو گیا

لیکن باپ کی اس افسردگی کو دیکھ کر اُس سے زیادہ دیر چپ نہ رہا گیا۔ وہ پھر گویا ہوا۔

''ابا جی جو چیز آپ کے لیے پریشانی کا باعث بن رہی ہے وہ کہہ دیجیے''

سیٹھ صاحب سے بیٹے کے بار بار کے اصرار کے بعد خاموش نہ رہا گیا چنانچہ کچھ توقف کے بعد رندھی ہوئی آواز سے کہنے لگے

''اور تو سب ٹھیک ہے بیٹے بس مجھے ایک بولنے والا طوطا لا کر دے دو''

''وہ کس لئے؟''

''وہ اس لیے''۔۔۔ اتنا کہنے کے بعد سیٹھ صاحب خاموش ہو گئے جسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے اُن میں مزید کچھ کہنے کی سکت نہ رہی ہو۔

وہ پھر سے کھلی کھڑکی سے اُن پیڑوں کی اور دیکھنے لگے جنہوں نے اُن کے معصوم دوستوں کو اپنی پناہ میں رکھا ہوا تھا۔

عبدالخالق اپنے ابو کی بات سن کو ششدر رہ گیا۔ اس کی حیرانی کی وجہ شائد اُس کا اُن کی بات کی تہہ تک نہ پہنچنا تھا۔ وہ بات کو آئی گئی کر کے واپس جانے کی بجائے چارپائی کی پائنتی پر ہی بیٹھا اُن کے بارے میں سوچنے لگا۔ کچھ دیر سوچوں میں مستغرق رہا۔ پھر اُس نے اچانک نظریں اُوپر اٹھائیں۔ جب اُس نے اپنے والد کی اور جھانکا تو دیکھا کہ اُن کی بوڑھی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو تیر رہے تھے اور لبوں پر ہلکی سی لرزش تھی والد کی اس کیفیت نے جیسے بیٹے کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ سب کچھ واضح کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ چارپائی سے جلدی سے اٹھا اور کوٹ کی جیب سے رُومال نکال کر دائیں ہاتھ سے اُن کی بھیگی پلکوں پر بڑے پیار سے پھیرنے لگا۔ جب وہ دو موٹے آنسو رومال میں پوری طرح جذب ہو گئے تو اس نے سیٹھ عبدالمالک کو بازو سے پکڑا اور آہستگی سے اٹھا کر انہیں کوٹھی کے مشترکہ کمرے میں لے گیا۔ لیکن سیٹھ جی کی چھڑی وہیں پڑی رہی جہاں وہ اُسے ہر روز رکھا کرتے تھے۔

بقیہ : رقص کرنے کی سزا

''تب میں نے فیصلہ کر لیا۔ کبھی شادی نہ کرنے کا۔ اور میں گھر اور ملک دونوں کو چھوڑ کر دیارِ غیر میں جا بسا۔ صبا سے بھی میں نہیں ملا۔ میں شرمندہ تھا کیا کہتا، کیا بتاتا۔ کس منہ سے اس کے سامنے جاتا۔ کیا میں اپنی ناکامی کا رونا روتا؟ میں کمزور ہو گیا ہوں۔ بغاوت نہیں کر سکا؟ ایک لمبے عرصے تک اس کی چاہت کو دل میں پالتا رہا پھر خود ہی اظہارِ تمنا کیا اور خود ہی سفاکی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا''۔

میں سب سے لاتعلق ہو گیا تھا۔ تمام رابطے منقطع کر لئے تھے میں نے۔ جانے کتنے مہ و سال بیت گئے۔ کتنے پت جھڑ آئے اور کتنی بہاریں اتریں۔ میرے سر کو چاندی کے تاروں نے بھر دیا اور میری فرنچ کٹ داڑھی میں برف بھر گئی۔ تب میرے دل میں سوئی ہوئی یادیں انگڑائی لے کر جاگ اٹھیں۔ میں دوستوں سے ملا۔ سب کتنے بدل چکے تھے۔ ملک کا نظام جانے کتنی پلٹیاں کھا چکا تھا۔ کشیدگی، منافقت، افراتفری، زیادہ سے زیادہ پیسہ بنانے کی جستجو، سیاسی رہنما ڈاکوؤں کا روپ دھار چکے تھے۔ روز درجنوں جنازے اٹھتے تھے۔ نوجوان اغوا ہوتے تھے۔ سڑکوں پر بوری بند لاشیں پڑی ملتی تھیں۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ ایک عجیب بے چینی اور کشمکش کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ اسی میں شادیاں بھی رچائی جا رہی تھیں، سالگرہیں من رہی تھیں اور تفریحی پروگرام بھی جاری تھے۔ ادبی محفلیں تھیں، مشاعرے تھے۔ ایسی ہی ایک محفل تھی یہ جس کی میزبانی کے فرائض مجھے سونپے گئے تھے اور میں اسٹیج پر بیٹھا ماضی کی کتاب کے بوسیدہ ورق پڑھ رہا تھا اور اب کتابِ زندگی کا کھلا باب میرے سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ جس میں نہ تعجب تھا نہ اچنبھا اور نہ شاید گلہ۔

میں نے سوچا تھا وہ بہت آسودہ ہو گی اپنے گھر میں اور جب اسے پتہ چلے گا کہ میں نے شادی نہیں کی تو شاید وہ پشیمان ہو اور اسے میری مجبوری کا، میری صداقت کا احساس ہو، اندازہ ہو۔ جلسہ ختم ہوا تو میں نے اختتامی جملے ادا کیے اور تالیوں کی گونج میں اسٹیج سے نیچے اتر آیا۔ تمام اہلِ جلسہ کھڑے ہو چکے تھے۔ میں مجمع کے بیچ سے راستہ بناتا اس تک پہنچا اور سکتے کے عالم میں کھڑے کا کا کھڑا رہ گیا۔ وہ وہیل چیئر پر بیٹھی مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

''تم کب آئے؟ نہ جانے کی خبر دی اور نہ آنے کا مژدہ سنایا''

اس کے لہجے کا دکھ میں سہہ گیا اور بولا۔

''میں اپنی پشیمانی کا اظہار ایسے ہی کر سکتا تھا۔ مگر یہ سب کیا ہے صبا؟'' میں نے اس کی پیروں کی طرف اشارہ کیا۔

''رقص کرنے کی سزا۔ میرے پیر کو توڑ ڈالا گیا اور بس۔۔۔''

اس کا ملازم وہیل چیئر پکڑے کھڑا تھا۔ میں نے ہاتھ سے اسے پرے ہٹایا اور پشتے کو پکڑ لیا۔

''مجھے معاف کر دو صبا۔ اب تاحیات میں تمہارے پیر بن کر تمہارے ساتھ چلوں گا۔

وہ مسکرا دی اور میں وہیل چیئر گھسیٹتا باہر نکل آیا۔

بیتے لمحوں کا لمس

محمد طارق علی
(راولپنڈی)

وہ خوش بودار محبتوں اور مٹھاس دار لمحوں والے دن اب کبھی نہیں آئیں گے اور یہ پاگل آنکھیں ہیں کہ انہی کو ڈھونڈتی رہتی ہیں، بس یوں ہی ایک بے سود اور لاحاصل سی کوشش کے طور پر۔

وہ زمانہ بیسویں صدی کی ساٹھویں دہائی والا تھا۔ گویا بہت دُور کا بھی نہیں اور نزدیک کا بھی نہیں۔ اور یہ اُن گئے دنوں کی بات ہے جب میرا ملک جوان ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ میں بھی۔ سال 1966ء کا تھا اور یوں یہ میرے ملک کی عمر قریباً بیس سال جبکہ میری عمر اس سے قدرے زیادہ تھی۔ میں ایم۔اے اردو کا سالانہ امتحان دے کر رزلٹ کا منتظر تھا لیکن اس کا مطلب ڈگری کا انتظار نہ تھا۔ مجھے اس کاغذی سند کی اس لیے ضرورت نہ تھی کہ میں اُن دنوں برسرِ روزگار تھا اور ایک علاقائی سطح کے اخبار کی سب ایڈیٹری چھوڑ کر ایک قومی اخبار روزنامہ ''ترنگ'' کے عملۂ اُدارت میں شامل ہو چکا تھا۔ یہاں تنخواہ بھی اچھی تھی، اس کے علاوہ اوورٹائم کا اضافی فائدہ بھی تھا لیکن عملاً اس کی نوبت ذرا کم ہی آتی تھی کیونکہ ''بندۂ مزدور'' کے اوقات کار تقریباً فکسڈ تھے یعنی قلم کے مزدوروں سے زیادہ کام نہیں لیا جاتا تھا۔ لوگ بہ خوشی اپنی اپنی شفٹوں کے مطابق کام کرتے تھے۔

جب سے میں اس نئے اخباری ادارے میں بھرتی ہوا تھا تو ابتدائی عرصہ میں یوں ہوا کہ مجھے کسی خاص تحریری شعبہ میں نہیں رکھا گیا اس لئے کہ مختلف شعبوں بالخصوص نیوز سیکشن میں نفری پوری تھی۔ صبح کی شفٹ میں اندرونی صفحات والے ایڈیشن کی تیاری، سہ پہر کو ضلعی ایڈیشن اور شام آٹھ بجے سے رات دو بجے تک لوکل ایڈیشن پر کام کیا جاتا تھا۔ اگر کسی شفٹ میں کوئی صاحب کسی وجہ سے نہ آئیں تو پھر ان کی جگہ میری ڈیوٹی شروع یعنی اخبار کا ایڈیشن کوئی بھی ہو مجھے متعلقہ شفٹ میں اُس غیر حاضر کی جگہ حاضر ہونا چاہیے۔

ویسے عام حالات میں مَیں صبح دس بجے روزنامہ ''ترنگ'' کے آفس آجاتا تھا اور اُس دن کے شیڈول کے مطابق بچوں کے صفحہ کے انچارج یا خواتین کے صفحہ کی ''باجی'' صاحبہ یا نوجوانوں/طلبہ کے صفحہ کو ایڈٹ کرنے والے صاحب یا سنڈے ایڈیشن کے مہتم صاحب کو اسسٹ کرتا تھا۔ یوں ہر ہفتے باری باری ان متنوع قسم کے صفحات پر کام کرنے کا بہت مزا آتا تھا۔ مذکورہ بالا چاروں صفحات کے اپنے اپنے دن مقرر تھے۔ ان کے علاوہ بھی میرے کچھ تحریری فرائض تھے جیسے مختلف مضامین کے تراجم وغیرہ۔

مذکورہ بالا صفحات کی دلکشی بڑھانے کے لیے کبھی کبھی ایک حاضر آرٹسٹ کی خدمات کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی اور باوجود کوشش کے مقامی ذرائع سے کوئی معقول آرٹسٹ دستیاب نہیں ہو رہا تھا۔ ایک دو حضرات کو آفر دی گئی تو اُن کی ڈیمانڈ کو زیادہ سمجھ کر خاموشی اختیار کی گئی۔ ایک دن سانولے رنگا کا قدرے لمبا سا ایک نوجوان لڑکا ہمارے شعبے میں وارد ہوا۔ چمکدار سیاہ آنکھوں پر ہلکے کلر کا نظر والا چشمہ، گھنے سیاہ بال سلیقے سے جمائے ہوئے، سفید قمیص، گرے پینٹ، چہرے کے نقوش اچھے اور خوشگوار یت لیے ہوئے لگتا تھا کہ کسی کالج کا ینگ طالب علم ہے۔

''السلام علیکم'' وہ ہمارے تمام ایڈیشنوں کے چیف صاحب سے مخاطب تھا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''امارا نام منجور (منظور) احمد ہے، اسی پتریکا کے میگزین سیکشن میں ام آرٹسٹ کی پوسٹ کے لیے اپائنٹ ہوا ہے''۔ وہ بنگالی نوجوان تھا۔ ہم سب نے بہت خوش دلی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ چائے اور بسکٹ سے اس کی تواضع کی گئی۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ نواکھالی کے ایک گاؤں گائے بندھا کا رہنے والا ہے۔

منظور یا منجور کی اردو بس واجبی سی تھی۔ ویسے اُس نے اِس خواہش کا اظہار کیا کہ اس سے اردو کی بجائے انگلش میں بات کی جائے تو وہ زیادہ بہتر طریقہ سے بات کو بول اور سمجھ سکے گا لیکن ایڈیشنز چیف صاحب کے سوا کسی نے بھی اس کی خاطر انگلش زبان کو منہ نہ لگایا سو وہ مجبوراً اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو سے ہی کام چلانے لگا۔

منجور احمد نے اپنی آمد کے فوراً بعد ایک کمرے میں کرسی، میز اور دیگر ضروری لوازمات کے ساتھ اپنی فنکار انگلیوں کو حرکت دینا شروع کر دی اور پہلے ہی دن سے بہت عمدہ سکیچز، کیری کیچر زبنانے کے علاوہ وہ فطرت کے حسن کی بھی بہت خوب صورت عکاسی کرنے گا۔ اس کی تصویروں میں اس وقت کے مشرقی پاکستان کے دیہی، دریائی اور پہاڑی مناظر اور کلچر کی جھلکیاں اکثر و بیشتر نظر آتی تھیں اور یوں یہ قلمی تصویریں، اپنے ایک خاص اچھوتے پن کے ساتھ بہت بھلی لگتی تھیں۔ کبھی کبھی منجور فارغ ہوتا تو میں بھی بشرطِ فرصت اُس کے پاس جا بیٹھتا۔ اور وہ اکثر اپنے گاؤں کی کہانیاں، ڈھاکہ کے آرٹ کالج کے زمانے کے قصّے اور بنگالی لوگوں کی عادات و مزاج اور ان کے کلچر کی باتیں مجھے سناتا، زیادہ تر اپنی رواں انگریزی میں اور کبھی کبھی ٹوٹی پھوٹی اردو میں۔ ہماری یہ ملاقات چائے کی پیالی کے ساتھ تھوڑی دیر ہی چلتی تھی، اس لئے کہ اخبار کے کام میں فراغت والے یا فالتو لمحات زیادہ لمبے نہیں ہوتے۔

ہمارے آفس میں ڈاکیہ روزانہ ڈاک کے موٹے موٹے بنڈل اٹھائے آتا تو منجور کی آنکھیں چمکنے لگتیں اور جب بھی اس کے نام کا کوئی خط آتا تو وہ اسے چومتا، آنکھوں سے لگا لیتا اور کہتا:

''یہ اماری ماما کا چٹھی ہے'' یا کبھی کبھی کہتا: ''آج میری چھوٹی بہن (شادی شدہ) یا چھوٹے بھائی نے مجھے یاد کیا ہے''

لیکن ان سب خطوط کے علاوہ بھی وہ کسی ''خاص'' خط کا انتظار کیا کرتا تھا۔ میں پوچھتا:

''منجور تمہاری ماما (یا بھائی) کا خط تو آ چکا ہے، اب تمہیں کس کے خط کا انتظار ہے؟''

''یار، طاریک (طارق) صاب، سمجھا کرو، امارا دل جوان ہے تو اس دل کا بھی تو کوئی رشتہ دار اُدھر پور بو پاکستان میں ہوگا ناں!'' وہ ہنستے ہوئے کہتا اور اس کی آنکھوں سے پھوٹنے والی ایک خاص چمک اُس رشتے دار کا پتہ بتانے لگتی تھی۔

''تم بولو، کیا تمہارا کوئی ''بی لووڈ'' نہیں اے؟'' وہ مسکرا کر پوچھتا۔

''ہے، لیکن وہ ہم کو چٹھی نہیں لکھتی''

''تم تو ایدر رہی ہے، تم اس کو ایک دم ڈائریکٹ ملنے کا، پھر تم کو چٹھی کا کیا کرنا؟ اُم تو اس سے ہجاروں (ہزاروں) میل دور ایدر میں بیٹھا ہے، ام کو چٹھی نئیں ملے گا تو امارہ دل کیسے لگنے سکے گا؟''

ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بھی اس کا مکمل حالِ دل جان کر میں ہنس پڑتا اور وہ بھی میرا ساتھ دینے لگتا۔ پھر وہ ہنستے ہنستے سامنے ایک کھڑکی سے نظر آتے نیلگوں آسماں کے چھوٹے سے ٹکڑے پر نظر جما دیتا۔ شائد اس کے تصور کا پنچھی اسے کھینچ کر نواکھالی کی طرف لے کر چلا جاتا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ کہتا:

''ابھی یہاں صبح کا گیارہ بجا ہے اور اُدھر نواکھالی کے وال کلاک میں بارہ کا ٹائم ہوگیا ہے۔ سالیماں (سلیمہ) اپنے گرلز کالج سے نکل کر ہوسٹل جا رہی ہوں گی۔ وہ ویک اینڈ پر گاؤں اپنے گھر آ جاتی ہے، میری ماما سے بھی ملتی ہے، ماما اس کو بوہت بوہت پیار کرتی ہے۔''

ایک دن میں اس کے کمرے میں گیا تو وہ بہت خوش بیٹھا تھا، خوشی کی چنگاریاں اُس کے چہرے سے جیسے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھیں۔

''آج کیا بات ہے منجور صاحب، کیا ''اُس'' کی چٹھی آ گئی ہے؟''

''ہاں، ہاں، بالکل آ گئی ہے، لو دیکھو''۔ اس نے خط کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس کی منگیتر نے خوشبو لگا کر بھیجا تھا۔ ''مگر تم نہیں پڑھ سکنے کا، یہ بنگلہ میں لکھا ہے'' خوشی سے اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

''کوئی بات نہیں، میں یہ چٹھی تمہارے فیس (چہرے) پر پڑھ سکتا ہوں۔'' میں مسکرایا۔ پہلے تو وہ سمجھا نہیں، ذہن پر تھوڑا زور دیا تو بات اُس کی سمجھ میں آ گئی۔ اور پھر وہ زور سے ہنسا۔

''تم نے بالکل ٹھیک بولا'' ام کھُس (خوش) بھی بوہت ہے نا اس لئے؟''

''تو اب چائے میں منگاؤں یا تم آرڈر دو گے؟''

''ام منگائے گا اور سیلی بریٹ (جشن) بھی کرے گا، کیوں کہ چائے کے ساتھ پیسٹری بھی ہوگا''

ہماری اس مٹھاس دار برادرانہ سنگت کو پروان چڑھتے کئی مہینے گذر گئے۔ منجور، پوری میگزین برانچ میں خود کو مجھ سے بہت قریب سمجھنے لگا تھا۔ وہ مجھ سے اپنے دل کی بہت خاص باتیں بھی کر لیتا تھا۔ اس کے نام والے ''خاص'' خط کم کم آتے تھے اور یوں مجھے اس کی پُر تکلف اور خلوص بھری چائے کے مواقع بھی کم ہی ملتے تھے لیکن روٹین والی چائے ہم روزانہ اکٹھے پیتے تھے۔

راولپنڈی میں گرمی کا موسم اپنے پورے جوبن کے ساتھ پر پھیلا چکا تھا۔ منجور اور میں سارا دن اپنے اپنے ڈیسک پر مصروف رہتے اور چلتے پنکھوں کے باوجود پسینہ بہا کر اپنا اپنا کام کرتے۔ ایک روز وہ کچھ جلد ہی اپنے تصویری کام مکمل کر کے میری طرف چلا آیا۔ میں اپنے کام کو فائنل ٹچز دے رہا تھا۔

''تم ابھی بھی بوہت بزی ہے؟''

''ہاں، اور تمہارا کام ہوگیا؟''

''ہوگیا، اور گرمی نے بھی امارا کام پورا کر دیا ہے'' وہ مسکرایا۔ اب اس کی اردو پہلے کی نسبت کافی اچھی ہوگئی تھی۔ ''اُدھر امارے نواکھالی میں ایک دم ٹھنڈا ویدر ہوتا ہے، یاں کے موافق گرم نئیں۔ اُدھر کبھی سلہٹ اور کبھی رانگا ماٹی کی پہاڑیوں سے ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں، بادل آتے ہیں اور دل کو ایک دم چین ملتا ہے''۔

''پہاڑ ادھر بھی ہے کوہ مری والا'' میرا جواب

''لیکن اس کی ٹھنڈی ہوا ایدھر میں نئیں آتی یا ہمی کو نئیں ملتی''

''آتی ہے، آتی ہے۔'' میں نے میز پر سر جھکائے جواباً کہا۔

''یار طاریک، اب تم اٹھو کام ختم کرو، ام کو آج پکچر دیکھنے کا، اے سی والا سینما میں''

میں نے اپنی خالی جیب اس کے سامنے اُلٹ دی۔ مطلب صاف تھا۔

''کھالی پاکٹ کیوں دکھاتا ہے، ٹکٹ ام لے گا''

اور جب ہم روزنامہ ''ترنگ'' کے دفتر سے نکل کر باہر آئے تو سورج کی گود سے پھسلی سہ پہر نے ہمارا خوب اچھی طرح ''سواگت'' کیا۔ ہم نے بلبلا کر ٹیکسی پکڑی تو ڈرائیور نے گوالمنڈی سے صدر میں سیروز تک جانے کے لیے ایک روپیہ مانگا جبکہ عام حالات میں اس فاصلے کا کرایہ آٹھ آنے ہوتا تھا۔

''نواکھالی میں ٹیکسی نہیں ہوتا، ہر جگہ میں سائیکل رکھشا چلتا ہے اور بھاڑا ابھی بوہت کم یعنی دو آنے، چار آنے، اس رکھشا کو آدمی چلاتا ہے ام جیسا کالج بوائے بھی اور عام لوگ بھی، سب کے سب، گریب لوگ، اور ایدھر میں گریب لوگ نئیں اے، آدھے میل کا بھاڑا ایک روپیہ، بولو جرا بولو؟''

''نہیں غریب لوگ ادھر بھی بہت ہے'' میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیدر اے؟ نجر ای نئیں آتا'' وہ ہنسا ''ایدر تو بس ایک اپن ای اے''۔

پھر سیروز سینما پہنچتے ہی وہ گیلری کے صوفے میں دھنس کر بے خبر سو گیا اور اس کے ساتھ تھوڑی دیر بعد میں بھی نیند میں گم تھا۔

دن یوں ہی صبح وشام میں ڈھلتے رہے اور ہم دونوں اپنے اپنے انداز میں اخباری صفحات کے پیٹ بھرتے رہے۔ایک دن دفتر میں چائے پیتے اور کام کرتے منجور نے مجھے کہا۔

''یار طاریک، لگتا ہے کہ اب ہماری دوستی کے دن پورے ہونے والے ہیں''

''کیوں؟''

''اب ام انگلینڈ جانے کا اور آرٹ کلاسز جوائن کرنے کا''

''اچھی بات ہے، ضرور جاؤ، میرا جواب'' اس طرح تمہارا فیوچر بننے گا''۔

''لیکن نئیں اماری منگیتر ام سے گسّہ (غصہ) میں ہے، وہ لکھتی ہے کہ مجھ کو لندن نئیں، اُودھر نوا کھالی میں جانے کا اور اس کے ساتھ شادی بنانے کا''

پھر اس بات کو بھی کافی وقت گزر گیا۔ایک دن منجور سخت بے چین نظر آیا۔

''کیا بات ہے، کوئی لیٹر نہیں آیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ماما کا لیٹر آیا ہے لیکن سالیماں (سلیمہ) کا نئیں آیا، مولوم نئیں، کیا بات اے؟''

اور ایک روز وہ بالکل بجھی ہوئی شکل لئے بیٹھا تھا۔

''اب کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''سالیماں نے ام کو فون کیا، بولا کہ اس کی بہن کے دل میں جو پیچن سے سوراخ تھا، اس کا آپریشن ہو گیا اے۔اب ڈاکٹر لوگ بولتا اے کہ بہن کو ایک دم کھُس (خوش) رکھنے کا، کوئی بھی گُسّے (غصے/ ناراضگی) والا بات نئیں کرنے کا، بس ایک دم اُس کی بات کو ماننے کا۔اور اس میں ام کو بڑا پرابلم مل گیا اے''۔

''تم کو کیا پرابلم مل گیا ہے؟''

منجور نے ایک خط میرے سامنے رکھ دیا۔''ابھی تم یہ سالیماں کا لیٹر بھی دیکھو، اس نے بنگلہ میں لکھا اے کہ اس کے ساتھ امارا منگنی کھتم اور اب ام اس کی چھوٹی بہن چندرما (چاند) کا منگیتر اے''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' میں حیران ہوا۔

''یہ ہو گیا اے، کیوں کہ یہ سالیماں کو خود اس کی بہن چندرما نے ایسے کرنے کا بولا تھا اور سالیماں کو ایسا ہی کرنا پڑا، یہ اس کی بہن کے ہارٹ کا معاملہ تھا، وہ ایسا نہ کرتی تو چندرما دُکھ سے مر جاتی۔اور یہ دیکھو، یہ دوسرا لیٹر بھی ہے، یہ چندرما کا ہے، اس میں اس کا فوٹو بھی ہے۔۔۔تم دیکھو۔'' اس نے دوسرا خط فوٹو سمیت میرے سامنے کر دیا۔ایک بہت نوخیز، بہ مشکل اٹھارہ برس کی لڑکی کا چہرہ، ہلکی سی مسکراہٹ لئے میرے سامنے تھا۔اور میں فوٹو ہاتھ میں پکڑے حیران، حیران۔

''سالیماں نے اپنے کھت میں لکھا ہے کہ چندرما مجھ کو خود اپنی بڑی بہن (سلیمہ) سے بھی پہلے کا پسند کرتی تھی''۔

منجور کی شکل عجیب سا تاثر لئے ہوئے تھی ''یہ دونوں ہی میری فسٹ کزنز ہیں''

''تو پھر اب تم کیا کرو گے؟''

''لندن بھاگنے کا اور کیا کر سکنے کا'' اس کا سانولا چہرہ مزید سانولا سا لگ رہا تھا۔پھر اُس نے مجھے بتایا کہ وہ چندرما کو اپنی کزن نہیں، چھوٹی سگی بہن کی طرح سمجھتا ہے۔اس نے یہ بھی کہا کہ وہ تو سلیمہ کو بھی پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ اس کی آرٹ کلاس کی ایک ساتھی لڑکی سمترا اُس کی محبت تھی۔ وہ ہندو تھی اور اسلام قبول کرنے کے لیے تیار، لیکن اس میں کئی پرابلم تھے خود سمترا کے لیے اور منجور کے لیے بھی۔وہ الجھے الجھے سے انداز میں، ہلکی آواز کے ساتھ بولتا رہا اور اُس کی پوری بات کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک روز اس کے گاؤں گائے بندھا میں پورن ماشی کا میلہ لگا تو سلیمہ جو اُس وقت اس کی منگیتر نہ تھی، اپنی سکھی سہیلیوں کے ساتھ اپنے گھر میں ناچ رہی تھی۔وہ اور اُس کے سبھی گھر والے اس روز بہت خوش تھے۔اتفاقاً منجور بھی وہاں جا نکلا۔سلیمہ نے ناچتے ناچتے ایک ہار اس کے گلے میں ڈال دیا اور اس کے کان میں کہا:

''آج سے میں تمہاری ہوں''

اور پھر انہی دنوں گھر کے بڑوں نے مل کر ان کی منگنی کا اعلان کر دیا۔منجور ہکّا بکّا، کچھ بھی نہ بولا۔گاؤں سے بھاگ کر ڈھاکہ پہنچا پھر وہاں سے بھی وہ اپنے دل رنجور کے ساتھ کراچی چلا آیا۔کراچی میں اتفاق سے روزنامہ ''ترنگ'' کے ہیڈ آفس میں اُسے بطور آرٹسٹ منتخب کر لیا گیا۔اس نے کچھ وقت وہاں کام کیا پھر ہیڈ آفس والوں نے اسے راولپنڈی آفس میں رپورٹ کرنے کے لیے کہا۔اس دوران سلیمہ کے محبت سے لبریز خط اسے کراچی میں ملتے رہے۔اس نے ایک خط کا بھی جواب نہیں دیا۔آخر گاؤں کے کچھ عزیزوں اور دوستوں نے اسے سمجھایا اور یہ بھی کہا کہ ''پاگل نہ بنو، سمترا کے دھرم والے اس کے لیے طوفان کھڑا کر دیں گے اس لیے سلیمہ ہی تمہارے لیے بہتر ہے'' تب کہیں جا کر منجور مان گیا اور یوں رفتہ رفتہ سلیمہ کو اس کے دل میں جگہ مل ہی گئی۔

لیکن اب ایک بالکل نئی بلکہ بہت عجیب سی سچویشن اس کے سامنے تھی، اس کی سوچ سے قطعی مختلف۔سوالوں کا ایک طویل جال اس کے چہرے پر پھیل گیا، وہ لگاتار سوچ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

''تم بولو، طاریک صاب، اب ام کو کیا کرنے کا؟'' ایک دن اس نے فکرمند چہرے کے ساتھ مجھ سے پوچھا۔

''جو تمہارا من بولتا ہے نوا کھالی نئیں جانے کا، لندن جانے کا'' میرا جواب۔

''امارہ من بولتا ہے نوا کھالی نئیں جانے کا، لندن جانے کا''

''تو چلے جاؤ''

''لیکن نئیں ابھی ام بوہت سوچتا اے''

باقی صفحہ ۸۸ پر ملاحظہ فرمایئے

لمحات کا سایہ

شفیع ہمدم
(فیصل آباد)

رشید ایک خوش شکل ذہین اور شریف نوجوان تھا۔ وہ بی ایس سی کے آخری سال میں تھا۔ محنت اور ذہانت کی وجہ سے ہر امتحان میں نمایاں رہتا تھا۔ اس کی دوستی کا دائرہ محدود تھا۔ اس کے سارے دوست بھی شریف اور نیک تھے۔ ایک روز وہ اپنی بائیک پر کالج جا رہا تھا کہ راستے میں نوراں کے باپ نے اس کے ساتھ نوراں کو تنہا بھیج دیا۔ نوراں میٹرک کی طالبہ تھی اس کا سکول کالج کے راستے میں پڑتا تھا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ محلے کے سارے لڑکے اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے گھنٹوں انتظار کیا کرتے تھے۔ اسے بھی نوراں بہت اچھی لگتی تھی۔ رشید اس کے قریب ہونا چاہتا تھا مگر ملاقات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ آج نوراں اس کے بہت قریب ہو گئی تھی۔ اسے اپنی موٹر سائیکل پر بٹھانے کے بعد معاً اس کے ذہن میں ایک خیال تیزی سے گردش کرنے لگا کہ اس کا جوانی کا دور گزر گیا ہے۔ جوانی کے دن بھی کتنے حسین تھے۔ سادہ پانی میں شراب سے زیادہ نشہ ہوتا ہے۔ جب بڑھاپا سر پر سوار ہو جاتا ہے تو موت ہی اس سے چھٹکارا دلا سکتی ہے۔ انسان کی زندگی بھی کتنی مختصر ہوتی ہے۔ پلک جھپکنے میں گزر جاتی ہے اور اسے احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ بڑھاپے سے خوف زدہ تھا۔ نقاہت اور کمزوری اسے محسوس ہو رہی تھی۔ بڑھاپا اتنی جلدی اس کے سلطنت بدن پر چھا جائے گا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

کالج سے فارغ ہو کر وہ سیدھا گھر پہنچا اور قد آور آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سراپے کا جائزہ لینے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ جوانی چکنی مچھلی کی طرح اس کے ہاتھ سے پھسل گئی ہے اور وہ بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو گیا ہے۔ اس کے چہرے پر بزرگوں کی سی سنجیدگی اور متانت تھی۔ آخر مجھے اس سے پہلے کیوں نہیں احساس ہوا۔ اس نے عینک اتار کر اپنی آنکھوں میں جھانکا تو وہاں بھی بڑھاپا کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جوانی کی شوخی کی بجائے بڑھاپے کی متانت اور سنجیدگی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی منگیتر کا چہرہ گردش کرنے لگا۔ جس کی آنکھوں میں جوانی کی چمک اور لبوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ تھی۔ کیا رافیہ مجھ جیسے ادھیڑ عمر شخص کو اپنا جیون ساتھی بنانے پر رضامند ہو جائے گی۔ ہرگز نہیں۔ اسے کیا پڑی ہے کہ مجھ جیسے عمر رسیدہ شخص سے شادی کا بندھن باندھے۔ اسے بیسیوں نوجوان اور خوبصورت لڑکے مل سکتے ہیں۔

وہ کافی دیر تک پلنگ پر چت لیٹے اپنی زندگی کے نشیب و فراز پر غور کرتا رہا۔ آخر یوں یکا یک ہاتھ سے جوانی کی ڈور کیسے چھوٹ گئی۔ شاید یہ شدید محنت اور تفکرات کا نتیجہ ہے کہ میں جوانی سے لطف اندوز ہوئے بغیر بڑھاپے کی جھولی میں آ گرا ہوں۔ بزرگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ تفکرات اور شدید ذہنی محنت انسان کے جسم پر ضرور اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ پلنگ پر لیٹا خیالات میں غلطاں تھا کہ اس کی ماں نے آ کر کہا رشید آج کھانا نہیں کھاؤ گے کیا؟ میں نے تمہارے لیے شامی کباب بنائے ہیں۔ شامی کباب اس کی کمزوری تھی مگر آج شامی کباب بھی اسے اپنی طرف راغب نہ کر سکے۔ بھوک تو تھی مگر ذہنی دباؤ کی وجہ سے کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ رشید تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔'' امی مجھے بھوک نہیں ہے'' بھوک کیوں نہیں ہے صبح کا ناشتہ کیا ہوا ہے۔ میری آواز کو کیا ہونا ہے چنگی بھلی تو ہے۔ دوپہر میں نے ہوٹل سے کھانا کھا لیا ہے۔ اس نے پیچھا چھڑانے کے لیے جھوٹ بولا۔ ہزار دفع منع کیا ہے کہ ہوٹل سے کھانا مت کھایا کرو ورنہ بیمار پڑ جاؤ گے۔'' اچھا امی آئندہ میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا'' اس کی امی بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی اور وہ پھر خیالات کی دنیا میں گم ہو گیا۔ میری ماں نے میری آواز میں کمزوری اور نقاہت محسوس کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری عمر اچانک کافی بڑھ گئی ہے۔

میں آخر اچانک کیسے عمر رسیدہ ہو گیا ہوں جبکہ میرے سارے دوست ابھی جوان ہیں۔ وہ ہمت کر کے پلنگ سے اٹھا اور آئینے کے سامنے جا کر ایک بار اپنا تنقیدی جائزہ لینے لگا۔ آئینے میں ایک ایسا شخص نظر آ رہا تھا جو اپنی جوانی گزار چکا تھا۔ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے اگر میری یہی حالت رہی تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ وہ ایک بار پھر پلنگ پر ڈھیر ہو گیا اور سوچتے سوچتے نیند کی وادی میں اتر گیا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ عمر رسیدہ ہو گیا ہے۔ اس کے سر کے بالوں پر برف جم گئی ہے اور چہرے پر جھریوں نے اپنا جال بچھا دیا ہے۔ اسے لوگ بابا جی، بزرگو اور میاں جی کہہ کر بلا رہے ہیں۔ وہ خواب میں گھر سے باہر نکل گیا اور چلتے چلتے ایک مصروف سڑک پر جا نکلا۔ وہ سڑک کراس کرنا چاہتا تھا مگر نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے پاؤں اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ کافی دیر تک سڑک کے کنارے کھڑا رہا مگر اسے کراس کرنے کی اپنے اندر ہمت نہیں پا رہا تھا۔ دفعتاً ایک خوبصورت جوان لڑکی اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بھی سڑک کراس کرنا چاہتی تھی۔ لڑکی نے اسے مخاطب کر کے پوچھا'' بابا جی کیا آپ بھی سڑک کراس کرنا چاہتے ہیں؟'' اس نے لڑکی کے خوبصورت چہرے پر نظر ڈال کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ لڑکی نے اس کا ہاتھ اپنے خوبصورت اور نازک ہاتھ میں تھاما اور گاڑیوں سے بچتی ہوئی سڑک کراس کرنے لگی۔ سڑک کراس کرنے کے بعد لڑکی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس نے لڑکی کا شکریہ ادا کیا وہ فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

فٹ پاتھ پر نوجوان تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے جبکہ عمر رسیدہ لوگوں کی رفتار بہت سست تھی وہ بھی نوجوانوں کی طرح تیز تیز قدم اٹھانا چاہتا تھا مگر جسم

کی نقاہت اس کے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ بھی بوڑھے لوگوں کی طرح فٹ پاتھ پر کچھوے کی طرح رینگ رہا تھا۔ چلتے چلتے اچانک اس کی آنکھ کھل گئی تو وہ فٹ پاتھ کی بجائے اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ پھر سوچوں کے پاتال میں اتر گیا۔ آخر نوراں کے باپ نے میرے ساتھ ہی کیوں بھیجا تھا۔ نوراں کو محلے کے اور بھی لڑکے اپنی موٹر سائیکلوں پر جا رہے تھے۔ ان میں سے کسی کے ساتھ کیوں نہیں بھیجا۔ اگر میں جوان ہوتا تو وہ اس قسم کی غلطی ہرگز نہ کرتا۔ نوراں اس کے ساتھ چپکی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے جوان جسم کی گرمی سے اس کے اندر بجلیاں کوند جانا چاہیے تھی مگر اس کے ذہن پر بڑھاپے کے چھائے ہوئے اثر نے اسے برف کی سل بنا دیا تھا۔ اس نے نوراں کو مخاطب کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ بس وہ تو خاموشی سے بائیک چلاتا رہا۔ اسے سکول کے گیٹ پر اتار کر یوں تیزی سے بائیک چلا کر وہاں سے بھاگا جیسے بھوت اس کا پیچھا کر رہے ہوں۔ کاش مجھے نوراں اور اس کا باپ راستے میں نہ ملتے تو مجھے ان افسوسناک حالات سے نہ گزرنا پڑتا۔ اس کے ذہن پر اس واقعہ کے اس قدر گہرے اثرات تھے کہ ان سے باہر آنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ محلے کی ایک عورت ان کے گھر آئی۔ اس نے چند ماہ قبل اس محلے میں مکان خریدا تھا۔ وہ چالیس بیالیس سال کی ایک سمارٹ اور خوبصورت عورت تھی۔ اپنی صحت کا خیال رکھنے کی وجہ سے اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے بتیس پینتیس سے زیادہ نہیں دکھائی دیتی تھی۔ اس نے بجلی کا بل اسے دیتے ہوئے کہا۔ بیٹے ذرا یہ بل جمع کروا دینا آج اس کی آخری تاریخ ہے۔ گڈو کے ابو لاہور گئے ہوئے ہیں ورنہ وہ جمع کروا دیتے۔ اس عورت کے منہ سے لفظ ''بیٹا'' سن کر اس کے ذہن پر چھایا ہوا بڑھاپے کا سارا غبار آن واحد میں چھٹ گیا اور اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا ابھی تو میں جوان ہوں، ابھی تو میں جوان ہوں۔ اس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو سنجیدہ بزرگ کی جگہ ایک جوانی سے بھرپور نوجوان نظر آیا جس کی آنکھوں میں جوانی کی چمک اور چہرے پر شوخی اور شرارت تھی۔ معاً اسے شدت سے بھوک کا احساس ہوا اور وہ باورچی خانے میں گھس گیا۔

بقیہ : بیتے لمحوں کا لمس

پھر یوں ہوا کہ وہ چند دنوں تک آفس نہیں آیا۔ ہوسکتا ہے کہ سوچ سوچ کر اُس کا دماغ ماؤف ہو گیا ہو اور وہ بیمار پڑ گیا ہو۔ میں نے سوچا۔ میں اس کے ٹھکانے پر چلا گیا۔ دروازے پر تالا تھا۔ گھر کے مالک نے کہا ''شاید منجور چپ چاپ کہیں نکل گیا ہے۔ اس نے بتایا کچھ نہیں، ملا بھی نہیں، کمرے میں اس کی چند اشیا بکھری پڑی ہیں'' میں واپس چلا آیا۔ ان ہی دنوں دفتر میں منجور کی نئی منگیتر کا خط اس کے نام آیا۔ جانے بنگلہ میں کیا لکھا تھا۔ میں نے اس خوشبودار خط کو ایک اور لفافے میں ڈال کر انگلش میں ایک رقعہ لکھا ''منجور دفتر چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے'' خط پوسٹ کر دیا پھر اس بات کو بھی کافی دن بیت گئے۔

اچانک ایک روز مجھے منجور کا خط ملا۔ انگلش میں لکھا تھا:

''میں ٹھیک ہوں، اپنی وائف چندرما کے ساتھ خوش بھی۔ جب میں نواکھالی آیا تو وہ مرنے والی تھی۔ میں نے اس کی جان بچالی ہے۔ اب میں اس کے ساتھ لندن جانے والا ہوں۔ اور طاریک، تمہاری محبت اور تمہارے ساتھ گزرے دن میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ تمہارا منجور''۔ اور اسی کے ساتھ نواکھالی کی گیلی رُت چُپ چاپ میری آنکھوں میں اُتر آئی۔ خط کو تہہ کر کے میں نے دل کے ساتھ والی جیب میں رکھ لیا۔

پھر وہ دن، وہ رُتیں، سب چلی گئیں، صدی بدل گئی، نقشے بدل گئے۔ جانے کیسے اتنا سب کچھ ہو گیا۔

میں نے اپنے بوڑھے ہاتھوں سے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ صحن میں ایک ہی درخت تھا، اس پر ہریالی نہ تھی، خزاں پھیل رہی تھی اور اس کے زرد پتے جیسے لمحہ لمحہ بن کر ٹوٹ رہے تھے، کم کم ہوتے جا رہے تھے۔ وقت پہلے جیسا نہیں رہا، میں نے سوچا، میرے گھر و دیس کو نظر لگ گئی تھی۔ بھری بہار میں اس کی جوانی کو خزاں نے آن دبوچا تھا۔ اس خزاں میں منجور نے مجھے اور میں نے اُسے بھلا دیا ہے لیکن اب بھی بیتے دنوں کے لمس نے مجھے گھیر رکھا ہے۔

کاش! ہم یا ہمارے بڑے منجور کی طرح تھوڑی سوجھ بوجھ، انصاف یا رواداری سے کام لیتے تو۔۔۔ آج نہ میرے صحن والے درخت کے رہائشی پرندے نئے موسموں، نئے ٹھکانوں کی تلاش میں درخت چھوڑ کر جاتے نہ اب اُس پر آسیب کا سایہ ہوتا۔۔۔ کاش۔۔۔ اے کاش۔۔۔!

○

ادھ کھائی بوٹیاں

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

خواہ مخواہ! لہروں اور روشنی وغیرہ کی رفتار کو ایک دوسرے سے تیز ثابت کرنے میں تو انائی ضائع کی جاتی رہی۔ ہماری رائے میں انسانی خیالات سے کسی چیز کی رفتار تیز ہو ہی نہیں سکتی۔ پلک جھپکنے سے پہلے' آپ! لاہور' اسلام آباد' کراچی' دلّی' ممبئی' مدراس' لندن' نیویارک' پیرس' ٹوکیو وغیرہ کا چکر کاٹ کر لوٹ سکتے ہیں۔ اس تمام سفر میں آپ کا ماضی مختلف چولے بدل کر آپ کے ہمراہ' ہچکولے کھانے لگتا ہے۔ کبھی آپ! محبوبہ کی بانہوں میں ہوتے ہیں تو کبھی مامتا کی آغوش میں اور کبھی بچپن کے دوستوں کی بے تکلف ٹولی میں۔ ماضی کا تمام حصہ آپ کی دسترس میں' گھر کے کمپیوٹر کی مانند ہوتا ہے جتنا سکون اور خاموشی آپ کے گرد و پیش ہوگی اتنا ہی گذرا ہوا کل آپ سے بغل گیر ہو رہا ہوگا۔ چونکہ استعداد سے بڑھ کر' اپنے کاندھوں کو ذمہ داریوں میں جکڑا ہوا ہے اس لئے' ہمیں گذرے ہوئے کل سے بے تکلف ہونا نصیب نہیں! کبھی فرصت کے لمحات میسر ہوں تو مومو ہمیں بے چین کئے رکھتا ہے۔

مومو میرا آخری اور لاڈلا بچہ ہے۔ گھر میں اُس کا کوئی ساتھی' سنگی نہ ہونے کے باعث' وہ طرح طرح کے مشغلے اختیار کرتا رہتا ہے۔ اس وقت گھر کے غیر اعلانیہ فرد' کوری ڈور اور لان کے کُلی مالک' بھورے بلّے کو ہڈیاں کھلا رہا ہے مگر میں جانتا ہوں کہ ان ہڈیوں میں اب بھی اُس کی خوراک سے زیادہ گوشت موجود ہے۔ مومو صاحب کھانے کے دوران اپنی پلیٹ میں وقفے وقفے سے تین چار بوٹیاں ڈال لیتے ہیں اور برائے نام چکھ کر اپنے بلّے کے لئے ہڈیاں کہہ کر بچا لیتے ہیں۔ یوں اپنی ماما کی ڈانٹ سے صاف بچ کر' بھورے بلّے کی پیٹ پوجا کا سامان کر لیتے ہیں۔

مجھے' ایک نظر مومو اور دوسری بھورے بلّے پر ڈالنے کے بعد ''سویٹی'' اور اس پر گزرنے والی داستانِ الم یاد کر کے چاروں طرف اداسی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ جس کے بعد دنیا کے سب سے خونخوار' بڑے اور بھیانک بھورے بلّے کی جانب توجہ مرکوز ہو جاتی ہے اور اپنی حیثیت ''سویٹی'' کے برابر لگنے لگتی ہے۔ جس کا دو بوند دودھ یا دو تولے چھیچھڑے بھی بھورے بلّے کو بہت کھٹکتے تھے۔ بھورا بلّا ''سویٹی'' کی موجودگی کو ایک منٹ کے لئے برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ شائد! بھورے بلّے کو اپنی سلطنت میں ''سویٹی'' کی مداخلتِ بے جا پسند نہ تھی یا وہ اسے مستقبل میں سخت حریف کے طور پر دیکھنے سے خوفزدہ تھا۔

کہتے ہیں! خوف کسی بھیڑیئے یا شیر کا نام نہیں' یہ انسان کے اندر موجود ہوتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے اندر یہ خوف کب اور کیوں در آیا؟ اور اس کے در آنے کے اسباب کیا ہیں؟ جس طرح ہماری شکلیں' سوچ اور ترجیحات مختلف ہیں اُسی طرح ہمارے اندر چھپا خوف بھی مختلف نوعیت کا ہے۔ کسی کو غمِ عشق' کسی کو غم روزگار' کسی کو حُسن و جوانی کے چلے جانے کا غم' کسی کو مال و دولت چھن جانے کا خوف اور کسی کو اختیار و اقتدار سے محرومی کا اندیشہ! سوال ایک اور بھی نکل آیا ہے جب ہم اپنی اپنی محنت اور قسمت کے مطابق پھل پا رہے ہیں تو پھر اس خوف نے ہمارے اندر کیونکر بار پا لیا ہے؟ قصہ دراصل یہ ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی اپنا کاتبِ تقدیر اور ناخدا بن بیٹھا ہے اپنی استعداد کو ہر طریقے پر کام میں لاتے ہوئے معاشی' معاشرتی اور جسمانی استحکام کا خواہش مند ہے۔ جسے ہم مصنوعی اور غیر فطری طریقے پر قائم رکھنا چاہتے ہیں اور ہر وقت اس کے چھن جانے کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔

ہمارے محلے کا کریانہ فروش بنارس خان تین دہائی قبل محنت مزدوری کے لئے شہر آیا تھا جہاں کچھ عرصے بعد ایک خدا ترس انسان نے اُس کی مدد کرتے ہوئے' کریانے کی دکان کھولنے کا مشورہ دیا اور اپنے مکان کا ایک کمرہ بھی اس مصرف کے لئے معمولی کرائے پر اُسے دے دیا۔ آج! بنارس خان نہ صرف اُس مکان کا مالک جسے توڑ کر اُس نے بہت سی دکانوں پر مشتمل مارکیٹ بنا لی ہے بلکہ اور بھی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی کاروبار میں ٹانگ پھنسائی ہوئی ہے۔ بنارس خان جب نیا نیا دکان دار بنا تھا بڑا خوش اخلاق' ملنسار اور قسمت پر شاکر رہنے والا انسان تھا۔ جب سے اُس کے مقابلے پر رجب علی نے دکان کھولی ہے وہ طرح طرح سے رجب علی کو تنگ کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ ہر وقت اُس پر چڑچڑا پن طاری رہنے لگا ہے۔ اسی یاسیت کے سبب وہ گاہکوں سے تُرش روئی کا مرتکب بھی ہوتا ہے۔ بات بات پر کاروبار کے خسارے اور گھریلو اخراجات کا ذکر کر کے طرح طرح کے اندیشوں کا اظہار کرتا ہے حالانکہ وہ اب بھی محلّے کے درجنوں گھروں کا پالن ہار بنا ہوا ہے۔ جنہیں وہ روزمرّہ کی اشیاء من پسند داموں پر فروخت کر کے احسان بھی جتلاتا اور بار بار سودا بند کرنے کی دھمکی بھی دیتا ہے۔ بیچارے مزدوری پیشہ اور کم آمدن والے لوگ اُس سے سودا لینے پر مجبور بلکہ اُس کی جھڑکیاں کھا کر بھی بے مزہ نہیں ہوتے۔ اُن کے پاس کوئی اور چارہ نہیں۔ نہ وہ بنارس خان کی رقم ادا کر سکتے ہیں اور نہ مُکتی پا سکتے ہیں۔

پچھلے دنوں عبدالطیف اور خان بہادر بچوں کی لڑائی پر آپس میں الجھ پڑے۔ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ خان بہادر نے عبدالطیف کے خلاف پرچہ درج کرا دیا۔ جبکہ عبدالطیف مدد کے لئے اپنے علاقے کے کونسلر اسلام الدین کے پاس پہنچ گیا۔ تھانے دار نے خان بہادر اور اسلام الدین نے عبدالطیف کی خوب خوب سرزنش کی۔ اسلام الدین نے عبدالطیف کو پولیس کا ڈراوا دے کر اور

تھانے دار نے خان بہادر کو اپنے اوپر نگران فورس کا حوّا دکھا کر پانچ پانچ ہزار روپے اینٹھ لئے۔ اس کے علاوہ عبدالطیف نے ایک سے ڈیڑھ ہزار روپیہ اسلام الدین کے کارندوں پر لٹایا اور قریب اتنے ہی پیسے خان بہادر سے تھانے کے لوئر اسٹاف نے اچک لئے۔ دونوں فریقوں کو ایک ہفتہ بھگا دوڑا اور ڈرا دھمکا کر صلح پر آمادہ کر دیا گیا۔ دونوں کو کچھ وقت گزرنے کے بعد اپنے ساتھ ہونے والی واردات کا علم ہوا تو اُن کے لئے دادرسی کا کوئی بھی دَر دستیاب نہ تھا۔

یہ واقعہ بھی زیادہ پُرانا نہیں! مغربی سرحدی ملک کے بہت سے باشندے' اپنے ملک کی خراب سیاسی' سماجی' معاشی صورتحال کے باعث ہمارے یہاں آ کر بس گئے اور طرح طرح کے جائز و ناجائز پیشے ایجاد کر لئے۔ ایک خاندان سترہ افراد پر مشتمل تھا جس کا سربراہ ولی داد خان تھا۔ یہ سات بھائی' تین بہنیں' دو ماں باپ اور پانچ بچوں پر مشتمل کنبہ تھا۔ محنت مزدوری سے معاشی حالات پر قابو پانا ممکن نہیں ہو رہا تھا لہٰذا ساتوں بھائیوں نے مل بیٹھ کر نئی سمتوں میں پیش رفت کا پروگرام ترتیب دیا۔ دو' علاقہ غیر سے ہلکی بندوق' پستول اور گولیاں لا کر فروخت کرتے دوسرے دو منشیات فروشی سے منسلک ہو گئے اور تیسرے دو نے محلّے میں دادا گیری کا سکہ جمانا شروع کر دیا جبکہ سب سے بڑے نے سارے کام کی نگرانی کا ذمہ اٹھا لیا۔ رفتہ رفتہ اس خاندان کے پنجے گڑنے لگے تو ان کاموں کے پُرانے اور مقامی سرغنہ سے اُن کی چپقلش کا آغاز ہو گیا۔ آہستہ آہستہ باہمی چپقلش بڑے مناقشے کا رُوپ دھار گئی۔ دن کی روشنی میں عوام کے محافظوں کے درمیان' نئے گروہ نے پُرانے گروہ کے تمام سرکردہ افراد کی لاشیں گرا دیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ قانون کے محافظوں نے اس خونریزی کو روکنے کے بجائے بھاگنے میں عافیت سمجھی کیونکہ انہیں عوام سے زیادہ اپنی جانیں عزیز تھیں۔

اس واقعہ کے بعد قاتلوں کا دبدبہ' عوام اور پولیس دونوں پر قائم ہو گیا۔ انہوں نے تمام قتل کا ذمہ دار ایک بھائی کو قرار دلوا کر اُسے عمر قید کرا دی رات دن کی مناسبت سے یہ قید دس سال میں ختم ہو گئی جس کے دوران قیدی کو جیل میں ہر وہ آسائش دستیاب رہی جو کہ گھر میں ہوا کرتی ہے۔ اب یہ لوگ' آدھے شہر کی قسمت کے مالک سیاسی' سماجی اور معاشی حوالے سے معتبری کی معراج پر فائز ہیں۔

ہم نے جس گروہ کا قصہ اوپر بیان کیا ہے۔ اس سے قبل بھی شہر کے دوسرے سرے پر آباد ایک گھرانہ پانچ دہائی قبل آ کر آباد ہوا تھا جس نے اپنی طاقت کے بل پر قمار خانوں کا ایک وسیع جال شہر میں پھیلا دیا تھا۔ جسے دعوے کے باوجود کوئی حکومت ختم نہ کر سکی۔ مذکورہ گروہ نے قمار بازی سے کمائی گئی دولت پر اپنی خود ساختہ مملکت قائم کر لی اور غریبوں کی قسمت کے مالک بن کر سیاست کے ٹھیکیدار بھی بن بیٹھے۔

بے چینی و اضطراری کی خاموش لہر عوام کے دلوں میں زور مار رہی تھی جس کا اظہار انہوں نے' جرأت و بیباکی و حق گوئی کے داعی ایک پڑھے لکھے نوجوان کو شہر کی تنگ و تاریک گلیوں سے نکال کر حکومتی ایوانوں میں پہنچا کر کیا اور راتوں رات اپنی تقدیر بدلنے کے خواب دیکھنا شروع کر دیئے۔ نوارد! تازہ دم' زیرک اور متحرک نمائندہ ثابت ہوا' تھوڑے ہی عرصے میں تبدیلی کے آثار ظاہر ہونے لگے..... پہلے کی طرح اُس کے شہر میں ناجائز اسلحہ بھی بکتا ہے' منشیات فروشی بھی ہوتی ہے' قمار خانے اور قحبہ خانوں کا کاروبار بھی زوروں پر ہے۔ البتہ! ان سب منافع بخش کاروبار کی نگرانی اور سرپرستی اب وہ خود کرتا اور بھاری بھتہ وصول کرتا ہے۔ جس کا معقول حصہ باقاعدگی سے اپنے سے اوپر والوں کو ارسال کر دیتا ہے۔

کیا آپ کو اپنے کوچہ و بازار میں مختلف صورتحال کا سامنا ہے..... زید' بکر سے ملئے اور پوچھئے..... اُنہیں اپنے شہروں کی گلیوں اور چوراہوں میں جگہ جگہ چھوٹے' بڑے سائز کے بھورے بلّوں کا سامنا نہیں ہے؟ وقت گزرنے کے ساتھ ہماری آبادی بڑھ رہی ہے..... مگر..... اُس سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ' بھورے بلّوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ..... مذہب.....' سیاست.....' معاشرت..... روزمرہ کاروبار حتیٰ کہ ضروریاتِ زندگی صحت' صفائی' تعلیم' ٹرانسپورٹ' تعمیرات اور کھانے پینے کی اشیاء پر بھی بھورے بلّے قابض ہیں اور ہر آبادی کے نکڑ پر بیٹھے معصوم ''سویٹی'' کا حق جھپٹ رہے ہیں۔

فرصت کے چند لمحات نکال کر..... سوچئے..... غور کیجئے..... ہماری قیادت روز بہ روز تنزلی کا شکار کیوں ہے؟ کیوں! ہر آنے والے دن کے ساتھ..... چور' ڈاکو' سمگلر' بلیکیئے' ٹیکس چور..... اور..... رسہ گیر..... ہماری رہنمائی پر مامور کئے جا رہے ہیں؟..... اس لئے کہ ان سب درمیانہ درجے کے بھورے بلّوں میں سے جو سب سے زیادہ..... چالاک' عیار اور شاطر ہو..... اُسے ان سب بھورے بلّوں سے ہڈیاں ہتھیانے پر مامور کر دیا جائے..... بظاہر یہ موٹا اور توانا' بھورا بلّا اپنی دھاک بٹھانے اور اپنی چودھراہٹ کو طول دینے کے لئے' گردوپیش کے تمام ''سویٹی'' کو تہہ تیغ کرنے اور اپنی حیثیت کو بار بار ضرب دینے میں مصروف نظر آتا ہے مگر وقت آنے پر اس کا حشر بھی مومو کے ''سویٹی'' جیسا ہی ہوتا ہے.....!!

ان سب چھوٹے' درمیانے اور طاقت کے نشّے میں چُور بھورے بلوں سے..... دور..... بہت دور..... سب سے توانا' طاقتور اور شاطر بھورا بلّا بیٹھا بظاہر ہڈیاں بھنبھوڑ رہا ہے..... اصل میں وہ ہڈیاں نہیں' گوشت ہے..... زندہ انسانوں کا گوشت..... جسے کھانے سے اُس کی جسمانی طاقت کے ساتھ' سوچنے' سمجھنے کی صلاحیت بھی تیز تر ہوتی جا رہی ہے کیونکہ زندہ انسانوں کے گوشت میں حرارت اور پروٹین زیادہ ہوا کرتی ہے..... وہ پہلے اپنے حصہ کا گوشت کھائے گا! پھر ''سویٹی'' بلکہ اُس کی تمام برادری کا' اُسی طرح مار مار کر بھرکس نکال دے گا جس طرح مومو کے ''سویٹی'' کا بھورے بلے نے نکال دیا تھا۔ اُس پر بھی ''سویٹی'' نے ہوش کے ناخن نہ لئے تو بھورے بلّے نے رات کے اندھیرے میں 'سویٹی'' کا کام تمام کر کے' اپنی مملکت کو' درپیش خطرے سے ہمیشہ کے لئے

باقی صفحہ ۱۰۱ پر ملاحظہ فرمایئے

''حقیقت تک رسائی''

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

دل میں رکھا تھا شرارِ غم کو آنسو جان کے
ہاں مگر دیکھے عجب انداز اس طوفان کے

اپنی مجبوری کے آئینے میں پہچانا تجھے
یوں تو کتنے ہی وسیلے تھے تری پہچان کے

زخم خون آلود ہیں آنسو دھواں دیتے ہوئے
یہ سہانے سے نمونے ہیں ترے احسان کے

درد و غم کے تپتے صحرا کی کڑکتی دھوپ میں
سو گیا ہوں میں تری یادوں کی چادر تان کے

عقل جو کچھ کہہ رہی ہے اُس کو کہنے دیجیے
آپ اک دن دیکھئے تو دِل کی باتیں مان کے

دیکھئے کیسے حقیقت تک رسائی ہو زہیر
چاند تاروں تک تو جا پہنچے قدم انسان کے

○

وشال کھُلر (لدھیانہ، بھارت)

میرا بھی اندازہ تھا
سورج آگ میں آدھا تھا

روپ کی گنگا بہہ نکلی
چاند کدھر سے آتا تھا

گھل جائے بارش میں دھوپ
میں نے کب یہ چاہا تھا

دل کی دُنیا داری میں
غم کا حصّہ زیادہ تھا

ایک جھلک محسوس ہوا
کرشن تھا یا پھر رادھا تھا

دو نینا متوالے تھے
چوڑا اس کا ماتھا تھا

رات کی رات بھی رونق تھی
لیکن دل گھبراتا تھا

سر پر ایک کھُلا آکاش
جس جانب بھی جاتا تھا

باقی تو بس یکساں تھے
اس کا قد ہی زیادہ تھا

اور کہانی باقی تھی
رانی تھی اک راجا تھا

دونوں ہاتھوں سے لکھ کر
بلّا شیر بھگاتا تھا

ملزم تھا ہاتھی پہ سوار
منصف ہی پا پیادہ تھا

مجھ سے تھیں سب تکراریں
میں ہی اس کو بھاتا تھا

دن ڈھلتے ہی ٹوٹ گیا
آخر اس کا وعدہ تھا

یاد کریں گی تاریخیں
غزلیں کون سناتا تھا

سوچ رہا ہوں رہ رہ کر
سچ کا بھی خمیازہ تھا

وہ جو مجھ کو یاد نہیں
میرا اس سے ناتا تھا

○

شگفتہ نازلی (لاہور)

مانگے کی سب کتابوں سے کمرہ سجا لیا
پھر اُن پہ اپنے نام کا لیبل لگا لیا،

سوچا تھا ناشتے پہ ہو کچھ اہتمام سا
جب کچھ نہ بن سکا تو پراٹھا بنا لیا،

چاہا تھا میز پر ہو اِک گل داں نیا نیا
گھر سے پُرانے دوست کے یونہی اُڑا لیا،

بیٹھے بٹھائے سوچا کہ تقریب کچھ تو ہو
سو اُن سے بات کرنے کا عنواں بنا لیا،

معصوم ایک پیارا سا تھا، پاس ہی مرے
کچھ بھی نہ ہاتھ آیا تو اُس کو اُٹھا لیا،

اک مالدار، سادہ لوح، بے حد شریف بھی
باتوں ہی باتوں میں اُسے کیسے لُبھا لیا،

کوشش کے باوجود بھی کوئی جگہ نہ تھی
تکتے ہی اُس کی جیب برابر بٹھا لیا،

یُونیک موڑ چاہیے، اُس کی کہانی کو
سُنتے مِرا خیال ہی سارا چُرا لیا،

○

ضیا شہزاد (کراچی)

یوں واسطہ رہا ہے جہاں میں سراب سے
کانٹا چُبھے نہ خوفزدہ ہوں گلاب سے

گردش میں ہوں میں وقت کی مانند صبح و شام
یوں جینا پڑ رہا ہے مجھے اضطراب سے

تعبیر ہے یہی کہ کڑی دھوپ کا سفر
ڈرنے لگا ہوں اب تو سُہانے خواب سے

ہر ایک حرف، لفظ، سطر بس تمہارے نام
اِک اقتباس پیش ہے دل کی کتاب سے

اِک میں کہ مُدعائے دل و جاں کروں بیان
اِک تم کہ کام لیتے ہو اتنے حجاب سے

یہ دورِ اِبتلا ہے ہر اِک گام اِک محاذ
ہے جنگ اس زمانے کی اب مجھ حُباب سے

ہر پل تمہاری یاد میں رہتا ہے بے قرار
تنگ آ گیا ہوں میں دلِ خانہ خراب سے

زندہ رہو جہاں میں تو شہزاد یوں رہو
گویا گزر رہے ہو کسی احتساب سے

○

جہانگیر اشرف (برمنگھم)

ہم نے نذرانۂ جاں سرِ دار دیا
حُسن کو پندار، عشق کو وقار دیا

اپنے لہو سے جبینِ دار پہ حرفِ حق لکھا
جو مہر بلب تھے، اُنھیں جرات اظہار دیا

حُرمت بشر کو ہم نے اپنا منشور لکھا
آئینِ جبر کے ورق ورق کو پھاڑ دیا

نبرد آزما رہے تُند و تیز موجوں سے
ڈوبتی ناؤ کو ہاتھوں کا پتوار دیا

دیوانگی نے خرد کو جرات منصور بخشی
خمیدہ سروں نے طُوق اُتار دیا

خُونِ جگر سے سینچا صحنِ چمن کو
گلشنِ ویراں کو پیغامِ بہار دیا

حُرفِ جنوں اب حرفِ ناز بن گیا ہے
دیوانگی کو جہانگیر نے ایسا میعار دیا

○

جوہی پرویز
(علی گڑھ، بھارت)

شبِ فراق کبھی مختصر نہیں ہوتی
یہی وہ رات ہے جس کی سحر نہیں ہوتی

نگاہ و دل کی یہ قیمت اگر نہیں ہوتی
تو ان کی چشم توجہ ادھر نہیں ہوتی

میں بیخودی میں کسی کا خیال کیا رکھوں
کبھی کبھی مجھے اپنی خبر نہیں ہوتی

جنونِ عشق نے پہنچا دیا وہاں مجھ کو
جہاں رسائی اہلِ نظر نہیں ہوتی

ازل سے سنتے چلے آئے ہیں فسانۂ عشق
یہ داستان کبھی مختصر نہیں ہوتی

○

عارف شفیق
(کراچی)

مجھے تو دید بھی تیری عبادت ایسی تھی
کہ تیرے نام سے دل کو عقیدت ایسی تھی

مجال کس کی تھی آنکھیں ملا کے بات کرے
دلوں کے شہر پر اُس کی حکومت ایسی تھی

میں اپنے آپ سے ٹکرا کے ریزہ ریزہ ہوا
مرے مزاج میں یارو بغاوت ایسی تھی

تمام دشت میں پھیلی ہوئی تھی اس کی مہک
ہمارے پاؤں کے چھالوں میں نکہت ایسی تھی

تلاش اب تو مجھے جنگلوں میں لے آئی
غریبِ شہر کو گھر کی ضرورت ایسی تھی

جو سچی بات کہے اس پہ سنگ باری کریں
تمہارے شہر میں شاید روایت ایسی تھی

یتیم عقل تھا ذوقِ سلیم رکھتا تھا
عجیب شخص تھا وہ جس کی حالت ایسی تھی

ملے ہیں غم تو مجھے کوئی غم نہیں عارفؔ
کسی سے شکوہ نہیں میری قسمت ایسی تھی

○

منظور حسین پرویزؔ
(علی گڑھ، بھارت)

بے تاب دل ہے اور نظر بے قرار ہے
کیا تازہ حادثہ کو مرا انتظار ہے

کلیاں چٹک رہی ہیں گلوں پر نکھار ہے
شاید یہ پیش خیمۂ ختم بہار ہے

گو کچھ نہیں ہے پھر بھی یہ صورت ہے کربناک
اس آدمی کو مجھ سے نہ نفرت نہ پیار ہے

اک میں کہ جسنے ان کے ستم ہنس کے سہہ لیے
اک وہ جن کو میری وفا ناگوار ہے

ممکن ہے آج مل کے بچھڑنا پڑے ہمیں
اب تو قریب آؤ فضا خوشگوار ہے

دل میں غبار بغض و عداوت سہی ، مگر
ہر شخص دیکھنے میں مرا غمگسار ہے

پرویزؔ ہم سے فنّی کشافت کا کیوں گلہ
لوح و قلم پہ آج کہاں اختیار ہے

○

ایم۔زیڈ۔کنول (لاہور)

درد کی پذیرائی کرنی پڑ گئی مجھ کو
عشق کی مسیحائی کرنی پڑگئی مجھ کو

خاورِ محبت نے پھونکا ہے فسوں کیسا
گوش زد وہ رعنائی کرنی پڑ گئی مجھ کو

تھے خزاں کے آنگن میں چار سو ہی سی پارے
حسرتوں کی یکجائی کرنی پڑ گئی مجھ کو

ظلمتوں کو پہنا کر روشنی کا پیراہن
جبر کی شکیبائی کرنی پڑ گئی مجھ کو

یاد کا دھواں میری آنکھوں میں لگا پلنے
یاد آبلہ پائی کرنی پڑ گئی مجھ کو

سنتے ہیں کہ خاروں نے آج خودکشی کر لی
خواب گُل کی انگڑائی کرنی پڑ گئی مجھ کو

آستیں کے سانپوں کو پال کر محبت سے
دفن اپنی دانائی کرنی پڑ گئی مجھ کو

خواب میری آنکھوں سے ہوگئے سبھی رخصت
ترک رسمِ آبائی کرنی پڑ گئی مجھ کو

سیپیاں مرادوں کی آ گئیں کنول بن کے
ساحلوں کی پسپائی کرنی پڑ گئی مجھ کو

○

نوید سروش (میرپورخاص)

حُصولِ منزل مقصد اگر بدلتے ہیں
قدم قدم پر نئے ہم سفر بدلتے ہیں

یہ خوف بھی ہے کہ خانہ بدوش یا کچھ اور
پرندے عہدِ خزاں میں شجر بدلتے ہیں

اُنہیں ملے نہ ملے کچھ، دعائیں دیتے ہیں
فقیر رکتے نہیں ہیں وہ در بدلتے ہیں

جواب جھوٹ کا ہے، انحراف ہے سچ سے
بڑے کمال سے وہ ہر خبر بدلتے ہیں

خیالِ خاطرِ احباب زندہ رکھا ہے
مرے خلوص سے پھر نظر بدلتے ہیں

نبھانا رشتوں کو شیشہ گری سے کم تو نہیں
کہ لوگ رسمِ وفا دیکھ کر بدلتے ہیں

سروشؔ بھول گئے تھے یہ شوقِ منزل میں
کہ کارواں ہی نہیں راہ بر بدلتے ہیں

○

تصور اقبال (اٹک)

ہمارے سر پہ برسانے کو پتھر ساتھ رکھتے ہیں
تصورؔ ہر گھڑی وہ اک ستمگر ساتھ رکھتے ہیں۔

دیا تھا آپ نے جو غم زمانہ ہو گیا اُس کو
ہم اس غم کو غمِ دنیا برابر ساتھ رکھتے ہیں۔

نجانے کب انہیں اس کی ضرورت پیش آ جائے
مسافر اس لیے ہر وقت بستر ساتھ رکھتے ہیں۔

کسی کو اپنی ناکامی کا اب الزام کیا دینا
ہمیں معلوم ہے اپنا مقدر ساتھ رکھتے ہیں۔

اکیلے ہی پہنچ سکتے ہیں یوں تو اپنی منزل پر
"بھٹک جانے کے ڈر سے ایک رہبر ساتھ رکھتے ہیں"

کوئی کچھ بھی کہے ہم سے مگر ہم اپنے پیاروں کو
جُدا خود سے نہیں کرتے ہیں مر کر ساتھ رکھتے ہیں

قناعت کی یہ دولت بھی ملی ہے ہم کو اُس در سے
تصورؔ ہر گھڑی ہم اپنی چادر ساتھ رکھتے ہیں

○

ندیم ہاشمی (کراچی)

رات اشکوں میں ڈھل گئی کیسے — درد کی لَے مچل گئی کیسے
اے قرارِ نظر بتا تو سہی — پھر طبیعت سنبھل گئی کیسے
اُس کے خوابوں سے میں نہیں نکلا — پھر وہ آنکھوں کو مَل گئی کیسے
اُس نے ایسا کیا ستم ڈھایا — آگ، پانی سے جَل گئی کیسے
خدا جانے کیا معجزہ ہے ندیمؔ — آئی تھی جو بَلا، ٹل گئی کیسے

○

مسعود تنہا (سرگودھا)

اس شہرِ نگاراں میں کوئی تجھ سا نہیں ہے — میں کیسے بتاؤں تجھے تُو کتنا حسیں ہے
پھولوں کا گداز اک ترے پیکر کا حوالہ — مہتاب سے بڑھ کر تری رخشندہ جبیں ہے
خوشبُو ترے سانسوں کی رچی ہے رگ و پے میں — محسوس یہی ہوتا ہے تُو میرے قریں ہے
کم ملنے کا احساس گراں لگتا ہے تیرا — اب لطف و کرم بھی ترا پہلے سا نہیں ہے
وہ جھیل کی پہنائی میں اک قطرہ ہے لیکن — رُک جاتا ہے جب پلکوں پہ آ کر تو نگیں ہے
ذکرِ غمِ دل اوروں سے اچھا نہیں لگتا — یہ دردِ محبت تو مرے دل کا مکیں ہے
ہنستا ہوا ملتا تھا سدا بزم میں تنہا — اب جانے وہ کیوں اتنا اُداس اور حزیں ہے

○

زاہدہ عابد حنا (لاہور)

دوزخ بھی کوئی اور ہے جنت بھی کوئی اور — ہے آج کی دنیا کی حقیقت بھی کوئی اور
یاں کذب و ریا فن ہے، ذرا سوچ سمجھ کے — کر آج کے لوگوں کو نصیحت بھی کوئی اور
ہے تجھ کو گلہ، میری وفا اور ہے، لیکن! — تُو سوچ! ہے شاید تری چاہت بھی کوئی اور
ہو دور تو ہوتا ہے ترا عکس بھی کچھ اور — گر پاس ہو تو ہوتی ہے رنگت بھی کوئی اور
تھا درد میں جینے کا مزا عشق میں پہلے — اب درد بھی کچھ اور ہے، راحت بھی کوئی اور
یہ چاند، ستاروں کو بتا دو کہ لکھی ہے! — بیمارِ شبِ غم نے وصیّت بھی کوئی اور
باطن جو نہیں پاک، خطا کار سے کہہ دو! — ہے اس کی سزا اور، عدالت بھی کوئی اور
ہیں تجھ کو حنا جینے کے ارمان ابھی تک — اے کاش کہ ہوتی تری حسرت بھی کوئی اور

○

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا، امریکہ)

قسط.....۱۷

میڈیکل کالج میں پہلا دن

میڈیکل کالج میں پہلے دن ہی سے ڈاکٹروں والا سفید کوٹ پہننا ہوتا تھا۔ یہ ایک بڑا رومانٹک تصور تھا۔ میں نے میرپور خاص میں درزی سے ایک بہت اچھا گھٹنوں تک لمبا اور چیسٹر جیسے کالروں والا کوٹ سلوایا تھا اور کئی دفعہ خیالوں میں خود کو اسے ہلکی نیلی قمیض اور کالی بند کیوں والی ٹائی کے ساتھ پہنے دیکھا تھا۔ آج وہ دن آ گیا تھا۔ میں نے نہایت نفاست کے ساتھ اسے زیب تن کیا، جوتوں پر خوب پالش کی تھی اور ماتھے پر وحید مراد کی طرح بال جمائے تھے۔ ایک نئے جوش اور جذبے کے ساتھ میں ڈائینگ ہال کی طرف ناشتہ کرنے چلا۔ ایک دوسری روائت ہمارے کالج میں یہ تھی کہ اگرچہ ابھی تو میں نے اپنی کلاس کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا مگر ہم سب لڑکے ''ڈاکٹر صاحب'' کہلاتے تھے۔ جب میں ناشتے کی میز پر بیٹھا تو بیرے نے مجھے ڈاکٹر صاحب کہہ کر مخاطب کیا جس سے ایک عجب خوشی اور فخر کا احساس ہوا۔ ناشتے کے بعد تقریباً پون میل چل کر میں پونے آٹھ بجے اناٹومی کے شعبے میں پہنچا۔ لیکچر آٹھ بجے شروع ہونا تھا۔ اناٹومی آڈیٹوریم بہت شاندار تھا اور اس میں اسٹیڈیم سیٹیں تھیں۔ جب میں اسکے دروازے پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ ابھی میں نے ایک ہی قدم اندر رکھا تھا کہ تقریباً سب لڑکوں نے زور زور آوازیں دیکر اور ہاتھوں کے اشاروں سے مجھے اندر آنے کو کہا میں خوش ہوا کہ میرے ہم جماعت اس قدر دوست نواز ہیں۔ میں خوشی خوشی اندر داخل ہوا اور نشستوں کی طرف بڑھ نے لگا مگر چند لڑکے بھاگتے ہوئے ڈھلان والی سیٹوں سے اترے اور مجھے دونوں طرف سے پکڑ کر تقریباً کھینچتے ہوئے لیکچرر کی اسٹیج پر لے گئے۔ کلاس میں ایک عجیب ہنگامہ بپا ہو گیا، قہقہوں کا سیلاب ابل پڑا اور سب لڑکوں نے زور زور سے ڈیسک بجانے شروع کر دئے۔ سب سے پہلے انہوں نے میری ٹائی اتروائی اور اس سے اپنے جوتے صاف کرنے لگے، کوئی میرا کوٹ کھینچ رہا تھا اور کوئی میری قمیض اتارنے کی کوشش کر رہا تھا باقی لڑکے ایک لَے کے ساتھ تالیاں بجا رہے تھے۔ دراصل ہوا یہ کہ اس آڈیٹوریم میں صبح کے وقت ایم بی بی ایس چوتھے اور فائنل ائر کی کلاس ساتھ ہوتی تھی اور میں یہ سمجھ کر کہ یہ میری کلاس ہے اس میں گھس گیا تھا۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ اس کلاس میں ایک لڑکا یاسین جو سانگھڑ سے رشید کا دوست تھا مجھے جانتا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا نیچے آیا اور باقی لڑکوں سے یہ کہہ کر کہ ''بہت ہو گیا'' میرا ہاتھ پکڑ کر کلاس سے باہر لایا اور مجھے اس راہدری کا راستہ بتایا جو اُس ہال کی طرف جاتی تھی جہاں ہماری کلاس ہونی تھی اور جہاں ہمیں ڈسکشن DISSECTION کرنا تھا۔

مردہ خانہ

میرے خیال میں ہندو پاکستان میں شاید ہی ایسا کوئی شخص ہو جس نے یہ نہ سنا ہو کہ میڈیکل کالج میں مردے چیرنے پڑتے ہیں۔ پھر ظلم یہ ہے کہ پہلی ہی کلاس میں اور پہلے ہی دن اس سے واسطہ پڑ جاتا ہے۔ میں نے بھی یہ سن رکھا تھا۔ دراصل میرے گھر والے اس سے پریشان تھے کہ میں یہ سب کچھ کیسے کرونگا۔ ایک تو یہ کہ میرا مزاج شعروادب کی طرف مائل تھا پھر میں نہایت جمال پرست ہوں لوگوں کا خیال تھا کہ پھولوں، خوشبوؤں اور تتلیوں سے محبت کرنے والا لڑکا جو انتہائی نفاست پسند ہے یہ سب کچھ کیسے کرے گا۔ اس پر طرہ یہ کہ سب کو میرا چھپکلیوں سے ڈرنا یاد تھا اور میری بھابی نے مجھے پیار سے چھیڑتے ہوئے کئی دفعہ اس بات کا طعنہ دیا تھا کہ بھئی تم تو چھپکلیوں سے ڈرتے ہو مردے کیسے چیروگے۔ میرپور خاص کے سول ہسپتال کے احاطے میں ایک کوٹھری نما عمارت تھی جس کی ہر کھڑکی پر باریک جالیاں لگی تھیں۔ اس پر عجیب بدروتقی چھائی رہتی تھی اور اسکے پاس سے گذرتے ہوئے ایک ناگوار بُو کا احساس ہوتا تھا اسے مردہ خانہ کہتے تھے جہاں پوسٹ مارٹم ہوتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ میں، رات تو بڑی بات، کسی سنسان دوپہر میں بھی اس کے پاس سے نہیں گذرتا تھا۔ بہرحال اب یہ لمحہ آ گیا تھا کہ میں اس کا سامنا کروں۔ مجھے خوف تھا کہ جہاں ہمیں مردے چیرنے پڑینگے وہ بھی ایسی ہی دہشت ناک جگہ ہوگی۔

ہمارا ڈسکشن ہال

مجھے یقین ہے کہ ہر وہ لڑکا جو لیاقت میڈیکل کالج میں ۱۹۶۰ سے ۱۹۷۲ تک رہا ہے وہ کبھی نہیں بھول سکتا کہ ہمارا ڈسکشن ہال DISSECTION HALL کسقدر عظیم الشان تھا۔ مجھے اسکا بھی یقین ہے کہ بعد میں چاہے وہ لڑکے دنیا کے نامور کالجوں میں پڑھے ہوں مگر انہوں نے اسقدر خوبصورت اور متاثر کن ڈسکشن ہال نہ دیکھا ہوگا۔ جب میں کالج میں داخل ہوا تو اسے بنے ہوئے صرف دو سال ہوئے تھے۔ اسکی تعمیر اور ڈیزائینگ میں اناٹومی کے سابق پروفیسر اسحاق اور پرنسپل کرنل نجیب کا خاص حصہ تھا۔ کئی منزلہ اونچی چھت، اونچی اونچی مہراب دار کھڑکیاں چھت پر ان گنت روشنیاں اور فرش۔ فرش اس قدر چمک دار اور چکنا تھا کہ خوف آتا تھا کہ کسی لمحے کوئی گر کر ٹانگ توڑ لیگا۔ مگر فرش کی خاص بات یہ تھی کہ اس پر موزیک اور چھوٹے چھوٹے رنگین شیشوں اور پتھروں سے انسانی اعضا کی تصاویر بنائی گئی تھیں۔ یہ انتہائی وسیع وعریض ہال تھا جس میں فاصلے فاصلے سے بیس سنگ مرمر کی میزیں رکھی تھیں جن پر انسانی لاشیں رکھی تھیں اور ان پر سفید چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ حالانکہ یہ لاشیں حنوط شدہ تھیں پھر بھی ایک ناگوار بُو کا احساس ہوتا تھا جسے دور کرنے کے لئے سب پر ایک خاص محلول

چھڑکا گیا تھا جس سے ماحول میں تیز سرکے جیسی بو پھیلی ہوئی تھی۔

ہر میز پر دس لڑکے تھے۔ دو دائیں ہاتھ، دو بائیں ہاتھ، دو دائیں ٹانگ اور دو بائیں ٹانگ پر۔ دو لڑکے سر اور گردن پر تھے۔ میرے ساتھ عبدالواہاب قاضی تھا۔ چادر ہٹا دی گئی تھی اب ہمارے سامنے ایک انسانی لاش سنگ مرمر کی سخت اور سرد سل پر پڑی تھی۔ چادر ہٹنے سے کیمیائی محلول کی بو اور زیادہ ہوگئی تھی اور اس میں کچھ ایسی تیزی تھی کہ آنکھوں اور ناک سے پانی بہنے لگا۔ اس زمانے میں ہاتھوں پر دستانے پہننے کا رواج نہ تھا۔ ہمیں ہنسلی کے ساتھ ساتھ کندھے کے جوڑ تک چیرا لگانا تھا۔ میرا تو برا حشر ہوگیا مگر مجھ سے کہیں زیادہ داہنی ٹانگ پر کام کرنے والے لڑکے اسلم انصاری کا ہوا۔ وہ سفید پڑ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ گر پڑتا یا وہیں قے کر دیتا اس نے جلدی سے اپنا سامان اٹھایا اور تیزی سے کلاس چھوڑ کر ہال سے بھاگ گیا۔ وہ کئی ہفتے دوبارہ کلاس میں نظر نہیں آیا اور ہمیں اور اساتذہ کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ واپس نہیں آئیگا۔ مگر کچھ ہفتوں بعد وہ واپس آ گیا اور اس نے بمشکل یہ سال نکالا۔ میرے اپنے پھوپی زاد بھائی کو مجھ سے کئی سال پہلے ڈاؤ میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا تھا مگر اسی اناٹومی کی کلاس کو چھوڑ کر وہ ایسا بھاگے تھے کہ کئی ماہ انکی دماغی حیثیت صحیح نہ ہوسکی تھی انہوں نے ڈاکٹری کا ارادہ چھوڑ کر وکالت کے لئے لا کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔

میں خود بھی پریشان تھا اور میرا اس لاش کو ہاتھ لگانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر اسی کے ساتھ ہماری کلاس میں کچھ ایسے لڑکے بھی تھے جو چھ چھ گھنٹے چیرا پھاڑی کرنے کے بعد بھی تشنہ رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ انہیں مزید اسکا موقعہ ملے۔ وہاب قاضی بھی انہی لڑکوں میں تھا اس لئے میرے اس فیصلے سے کہ میں کم سے کم نشتر استعمال کروں وہ بہت خوش ہوا۔ اور پورے سال میں نے بمشکل بیس فیصد اور اس نے اسی فیصد ڈسکشن کیا اس لئے کلاس کے تمام لڑکے اسے ابھی سے ''سرجن وہاب'' کہنے لگے تھے۔ بعد میں اس نے نیو یارک یونیورسٹی سے ہارٹ سرجری میں ڈگری لی اور آج کل امریکا کے شہر سینٹ لوئی میں نامور ہارٹ سرجن ہے۔

مشکل سے ڈسکشن کا وقت ختم ہوا اور آڈیٹوریم میں ہماری کلاس شروع ہوئی۔ یہ کلاس پروفیسر صدیق چوہدری کو لینی تھی۔ اسکا بڑا طمطراق تھا۔ پہلے کئی قسم کے پوسٹر اور چارٹ آئے، پھر پروجیکٹر کو ٹیسٹ کیا گیا اس کے بعد انکا پی اے آیا جس نے حاضری لی اور آخیر میں پروفیسر صاحب سفید لمبا کوٹ اور دونوں ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی ڈنڈیاں جو ڈھول بجانے کی ڈنڈیوں جیسی تھیں داخل ہوئے۔ انکی توند بڑی تھی اور وہ لیکچر دیتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے ڈنڈیاں گھماتے تھے۔ لڑکوں نے اسی دن انکا نام ''بینڈ ماسٹر'' رکھ دیا۔

اسی دن مجھے الطبری ہال کے کمرہ نمبر ایک سو چار کی چابی مل گئی اور میں لطیف کے یہاں سے اپنے کمرے میں منتقل ہوگیا۔ کمرہ نمبر ایک سو پانچ میرے یار غار رشید غوری کو الاٹ ہوا تھا مگر وہ ابھی تک کالج نہیں پہنچا تھا۔ الطبری ہال کی عمارت بالکل ابن سینا ہال جیسی ہی تھی مگر یہ ابھی ابھی تیار ہوئی تھی اور اس میں صرف ہماری کلاس کے لڑکے تھے۔ عمارت میں ایک سو چوبیس کمرے تھے مگر ہماری کلاس میں صرف پینسٹھ لڑکے تھے اور ان میں بھی کئی لڑکے حیدر آباد میں رہتے تھے اور روز بسوں سے آتے جاتے تھے اس لئے ہاسٹل بالکل خالی پڑا تھا۔ اس کے علاوہ لان وغیرہ مکمل نہیں ہوئے تھے اس لئے کافی بدرونقی تھی۔

کتابیں

میڈیکل کالج کی کتابیں بہت مہنگی تھیں اور مجھے اسکا اندازہ تھا کہ میں یہ کتابیں نہیں خرید سکوں گا۔ مگر اسکا میں نے پہلے ہی انتظام کر لیا تھا۔ میرے میر پور خاص کے دو دوست، چندر دھانومل نوتانی اور لطیف چغتائی مجھ سے ایک سال آگے تھے اس لئے میں نے ان سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ جیسے ہی وہ اگلی کلاس میں چڑھیں گے میں انکی کتابیں لے لونگا۔ میں نے میڈیکل کالج کی تمام پڑھائی انہی دونوں کی کتابوں کی مدد سے کی۔ جب تیسرے اور چوتھے سال میں کچھ ایسی کتابوں کی ضرورت پڑی جو کئی سال چلتی تھیں اور یہ دونوں مجھے وہ کتابیں نہیں دے سکتے تھے تو میں نے میر پور خاص میں ڈاکٹر ڈراگو (جو انسان کے بھیس میں فرشتہ تھا) اور روٹری کلب کے سیکریٹری سلطان احمد کو درخواست دے کر یہ کتابیں ان سے عطیہ کے طور پر وصول کیں اور امتحان پاس کر کے انہیں واپس کر دیں تا کہ وہ میر پور خاص کے کسی مستحق لڑکے کو دی جا سکیں۔

رات کو میں نے لطیف کی دی ہوئی ڈسکشن کی کتاب CUNNINGHAM MANUAL OF DISSECTION پڑھنے کی کوشش کی مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا عجب زبان تھی اور مختلف اعضا کی کچھ اس قدر الجھا دینے والے انداز سے تشریح کی گئی تھی کہ سر میں درد ہوگیا۔ جھنجلا کے جلد سو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اگر اپنے ہاتھ سے ڈسکشن نہیں کیا ہے اور آپ کے سامنے انسانی لاش نہ پڑی ہو تو یہ کتاب سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ادھر مجھے ڈسکشن کرنے سے اللہ واسطے کا بیر تھا مجھے تشویس ہوئی کہ یہ سال کیسے گذرے گا۔

نیا ماحول نئے دوست

میڈیکل کالج کا ماحول ڈگری کالج سے بالکل مختلف تھا۔ پھر میرا ہاسٹل میں رہنے کا پہلا تجربہ تھا۔ ہر چیز میرے لئے عجیب اور نئی تھی۔ اس ہاسٹل میں چونکہ صرف ہماری کلاس ہی کے لڑکے تھے اس لئے نسبتاً آزادی تھی اور سینئر لڑکوں کا خوف یا ''دادا گیری'' نہیں تھی۔ ہمیں اس کا بھی فخر تھا کہ اتنا نیا ہاسٹل صرف ہمارے لئے ہے اور ہم اس کی سجاوٹ اور اسکے انتظام میں خود مختار ہونگے۔ ہماری کلاس میں مشرقی پاکستان سمیت پورے پاکستان سے لڑکے داخل ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ پانچ لڑکے افریقی ممالک اور چند لڑکے عرب ممالک سے تھے۔ سب سے پہلے ہاسٹل کے انتظام کے لئے خالد ملک جو راولپنڈی سے تھا ہاسٹل سیکریٹری اور سعید انور جو لاہور سے تھا ڈائینگ ہال سیکریٹری چنے گئے۔ ہاسٹل کے وارڈن اناٹومی کے اسسٹنٹ پروفیسر ذوالفقار علی راجہ

تھے۔طلبہ کی ایک چھوٹی سی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنے ڈائینگ ہال اور کامن روم کو اس قدرخوبصورت انداز سے سجائیں گے کہ پورا کالج دیکھتا رہ جائیگا۔لڑکے اس بات پر بھی تیار تھے کہ اگر سب کو چندہ کر کے کچھ اپنے پاس سے بھی ڈالنا پڑے تو وہ اسکے لئے بھی تیار ہیں۔کچھ ہی دنوں میں ان دونوں جگہوں پر اس قدرخوبصورت پردے ڈالے گئے اور انہیں اسقدر دلفریب انداز سے سجایا گیا کہ واقعی باقی ہاسٹلوں کے لڑکے انہیں دیکھنے آتے تھے۔سجاوٹ مکمل ہوجانے کے بعد ہم نے اپنے ہاسٹل میں ایک گرینڈ ڈنر اور شام موسیقی منعقد کی جس کے مہمان خصوصی ہمارے کالج کے پرنسپل کرنل نجیب اور اسکی صدارت اناٹومی کے شعبے کے سربراہ صدیق صاحب نے کی۔یہ شام ہمارے بیچ کے سب لڑکوں کی یاد میں آج بھی زندہ و بیدار ہے۔

ادھر جن چند نئے لڑکوں سے میری اور رشید کی ملاقات ہوئی ان میں داؤد، ظفر اقبال، ضیاء الحق، شبیر احمد، حسن عارف اور عبدالباری شامل تھے۔یہ سب کراچی اور سندھ کے مختلف شہروں سے تھے۔ان سب کا تذکرہ بعد میں مختلف حوالوں سے بار بار آئیگا۔

میری مشکلات اور ایک جذباتی قدم

مندرجہ بالا واقعات تو کچھ ماہ بعد ہوئے مگر اس سے پہلے میرے ساتھ جو گذری اسکا ذکر ضروری ہے اس لئے کہ اب جب کہ میں اپنی تمام تر مالی دشواریوں کو عبور کر کے میڈیکل کالج میں داخل ہو گیا تھا میں کچھ ایسی ذہنی پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا کہ ممکن تھا کہ میں پھر بھٹک جاتا اور زندگی میں ناکام ہو جانے کے بعد شائد آج میں حسرت سے کہہ رہا ہوتا کہ کبھی میں بھی میڈیکل کالج میں داخل ہوا تھا۔

پہلے دو ہفتے کالج میں بہت مشکل گذرے۔پہلی بات تو یہ کہ مجھے کورس پسند نہیں آیا۔اناٹومی میں صرف ''رٹا'' لگانے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔اس میں سوچ یا انشا پردازی کا کوئی دخل نہ تھا اور میں زندگی میں کبھی بھی رٹا لگانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔پھر مجھے مردے چیرنے اور مختلف قسم کی بدبوئیں سونگھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس سے میری طبیعت خراب ہوجاتی تھی اور ہاسٹل آ کر کھانا بھی نہیں کھایا جاتا تھا۔پھر میں شدید طور پر ہوم سک تھا۔گھر کی رونقیں یاد آتی تھیں، میرپور خاص کے دوست اور انکے ساتھ گزارا وقت نظروں کے سامنے رہتا تھا اور آخیر میں یہ کہ میں اپنے پہلے شوق یعنی اردو ادب (کہ اب میری کچھ چیزیں شائع ہو چکی تھیں اور میں سنجیدگی سے اردو ادب کی ثقیل کتابوں کا مطالعہ کرنے لگا تھا) کا موازنہ اناٹومی سے کرتا تو میرا دل بھر آتا کہ کہاں کلام میر پڑھنا اور کہاں مردے کی کھوپڑی کے سوراخوں کا شمار کرنا۔جب دوسرا ہفتہ ختم ہونے کو تھا میں بالکل نروس بریک ڈاؤن کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔کئی کلاسیں چھوڑ دیتا تھا۔رشید جب صبح جگانے آتا تو میں اسے جھڑک دیتا۔مگر تنہا ہاسٹل میں دل بھی نہیں لگتا۔ایک ہوک سی اٹھتی تھی۔ایسا لگتا تھا کہ معدے کے اندر دھوئیں سے اٹھ رہے ہیں۔میں اس پر بضد تھا کہ میں واپس گھر جاؤنگا۔سب نے سمجھایا مگر مجھے سمجھانے والے زہر لگتے تھے۔آخر میں نے جمعہ کو اپنا سامان باندھا اور میرپور خاص کی گاڑی پکڑی۔گھر والے حیران اور پریشان ہوئے، مگر ماں کی مامتا، میری امّاں نے کہا تم تو دو ہفتوں میں کئی ماہ کے بیمار لگ رہے ہو انہوں نے میرا صاف ستھرا بستر بچھایا اور اس کے اوپر مچھر دانی لگائی۔مجھے اس رات اپنے گھر میں ایسی نیند آئی کہ کالج میں دو ہفتے نہیں آئی تھی۔میں نے صبح اپنے گھر والوں کو بتا دیا کہ مجھے ڈاکٹری نہیں پڑھنی، میں واپس نہیں جاؤں گا۔میری امّاں شائد ایک بڑی نفسیات داں تھیں انہوں نے کچھ نہیں کہا بس یہ کہا کہ بیٹے تم ابھی آرام سے گھر میں رہو اور اپنے دوستوں میں گھومو پھرو۔دوسرے دن میں نے اعلان کیا کہ میں بی اے میں داخلہ لے رہا ہوں، میں اردو ادب میں ایم اے کرنے کے بعد پی ایچ ڈی کرونگا اور کل وقتی تنقید نگار بنوں گا۔

دوسرے دن میں کالج گیا۔۔بہت شوق اور جذبات میں ڈوبا ہوا۔میں زندگی کی اس ڈور کو دوبارہ پکڑنا چاہتا تھا جہاں سے میں نے اسے چھوڑا تھا۔قدم قدم پر مجھے یہ یاد آ رہا تھا کہ ہم چند لڑکے یہاں کھڑے ہو کر یہ کیا کرتے تھے، یا لڑکیاں ان روشوں پر چل کر زولوجی کی لیب میں آتی تھیں۔مگر افسوس اب وہ کچھ بھی نہ تھا۔وہ سب لڑکے جو میرے کلاس فیلوز تھے جا چکے تھے کیونکہ انٹر سائینس کے بعد کالج میں سائینس کی کلاسیں نہیں تھیں۔اکتوبر کا مہینہ تھا، امریکا میں خزاں کا موسم بڑا رنگین ہوتا ہے جب پتے رنگ بدلتے ہیں مگر میرپور خاص میں خزاں کے موسم میں عجیب بدرونقی ہوتی ہے۔درختوں کے پتے پیلے ہو کر گر جاتے ہیں۔ہواؤں کے تیز جھکڑ چلتے ہیں جو اِن پتوں کو اِدھر اُدھر اڑا رہے ہوتے ہیں۔عجب ویرانی کا سماں ہوتا ہے۔اس لئے کالج کا ماحول، خزاں کی رت اور میرے کسی ساتھی کا نہ ہونا میرے لئے بڑی تکلیف کا باعث ہوا۔رات کو میں ریڈیو ہوٹل گیا جہاں ہم دوست جمع ہوتے تھے۔وہ شام بھی بڑی اداس تھی، ہلکی ہلکی دھند چھائی تھی اور صرف ان چند لڑکوں کے جن سے میں تھوڑا بہت واقف تھا، میرا اپنا کوئی دوست وہاں نہ تھا۔انہیں حالات میں دو ہفتے گذرے اور مجھے ایسا لگا کہ میں اب میرپور خاص میں میڈیکل کالج سے بھی زیادہ تنہا ہو چکا ہوں۔ادھر میری دوست یعنی میری بھابی بھی واپس حیدرآباد چلی گئی تھیں کیونکہ انہیں ایم اے کے فائنل کی کلاسیں لینی تھیں۔ایک رات سونے سے پہلے میری امّاں میرے پلنگ کی پٹی پر آ کر بیٹھیں اور مجھ سے کہا ''بیٹے ڈاکٹر بننے کے بعد بھی تم اپنا ادب کا شوق پورا کر سکتے ہو مگر اس دوراہے پر جب اللہ نے تمہارے لئے دروازے وا کر دئے ہیں اگر تم نے خود اپنے اوپر ترقی کے دروازے بند کر دئے تو تم دوبارہ ڈاکٹر نہیں بن پاؤ گے۔وقت کسی کو معاف نہیں کرتا سوچ لو''۔میں رات بھر بیچین رہا اور صبح تک میں فیصلہ کر چکا تھا کہ چاہے مجھے لوہے کے چنے چبانے پڑیں مجھے واپس جا کر اپنا اور اپنے کنبے کا خواب پورا کرنا ہی ہوگا۔اسی شام میں اپنا چھوٹا سا بکسا لے کر دوبارہ حیدرآباد کی جانب عازم سفر تھا۔

ایک بے نام اندرونی ویرانی

کسی نہ کسی طرح وقت کاٹنا ہی تھا۔ میرا کسی طرح دل ہی نہ لگتا تھا۔ بس جیسے اندر سے ایک ویرانی تھی جو ختم ہی نہیں ہوتی تھی۔ جیسے روح میں تیز ہواؤں کے جھکڑ چل رہے ہوں۔ حالانکہ اب ہر چیز سیٹل ہوگئی تھی۔ میرے بہت اچھے دوست بن گئے تھے۔ رشید بھی آ گیا تھا اور میرے دونوں دوست چندر نوتانی اور لطیف بھی مجھے بہت سہارا دیتے تھے۔ ادھر اشفاق جو یوں تو نیوی (پاکستانی بحری فوج) میں جانا چاہتا تھا مگر وہاں شاید کچھ دیر تھی اس لئے اس نے سندھ یونیورسٹی کے انجینئرنگ کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور وہ بھی جام شورو ہی میں ہاسٹل میں تھا۔ اشفاق نے اسی دوران ایک مقابلہ جیت کر BRAIN OF UNIVERSITY کا ٹائٹل بھی جیتا تھا۔ اسی کے ساتھ میرے اسکول کے دوست ریاض اور سعید بھی اسی انجینئرنگ کالج میں تھے مگر مجھ پر قیامت کا ڈپریشن تھا۔ مجھے میرا کمرہ کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ میں بھاگا بھاگا پھرتا تھا کسی رات چندر کے ساتھ دیر تک باتیں کرتے اسی کے کمرے میں سو جاتا تھا تو کبھی پیدل انجینئرنگ کالج جا کر وہاں ریاض کے کمرے میں سو جاتا تھا۔ مشکل سے چھ دن کٹتے تھے اور سنیچر کے دن کالج جاتے ہوئے اپنا ایک چھوٹا سا سفری اٹیچی کیس ساتھ ہی لے لیتا تھا کہ کالج ہی سے بس پکڑ کر حیدرآباد چلا جاؤنگا تاکہ وہیں سے پہلی گاڑی پکڑ کر میرپور خاص روانہ ہو جاؤں۔ مگر میرپور میں بھی اب کوئی نہیں تھا کہ وہی محلے، وہی گلیاں اور وہی فروٹ فارم تھا مگر میرے دوست نہیں تھے نہ ہی وہ دور۔ اب وہاں بھی دل نہیں لگتا تھا۔ بقول شاعر میرا وہی حال تھا کہ

کہیں بھی میرا ٹھکانہ نہیں زمانے میں
نہ آشیانے کے باہر نہ آشیانے میں

پڑھائی میں ناکامی

ادھر میں پڑھائی میں بری طرح ناکام ہو رہا تھا۔ اناٹومی تو خیر میرے لئے ایک قابل نفرت مضمون تھا جس میں لاطینی اصطلاحات تو تھیں ہی مگر وہ بھی اوٹ پٹانگ کہ انہیں اردو میں ترجمہ کیا جائے تو ''اوپر۔۔۔نیچے۔۔۔قریب۔۔۔دور۔۔۔دائیں بائیں'' کی مسلسل تکرار تھی مگر embryology جو شکم مادر میں بچے کی نشوونما کا تفصیلی علم تھا وہ بھی مجھے زہر لگتا تھا (کئی سال بعد جب میں ڈاکٹر بن چکا تھا میں نے اس موضوع پر اردو میں ایک مضمون چار قسطوں میں امریکا کے سب سے بڑے اردو اخبار میں لکھا تو کئی سو تعریفی خطوط اور درجنوں فون آئے مگر اُس وقت میں اسکا نام سننا گوارا نہیں کرتا تھا۔) اسکے علاوہ ایک مضمون میں ہمیں خردبین سے جسم کے مختلف اعضا کے سلائڈ دیکھنے ہوتے تھے۔ سچ پوچھیں تو مجھے اس میں سوائے لال رنگ کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ میں ماہوار ٹیسٹوں میں جنہیں ''اسٹیج'' کہتے تھے دھڑا دھڑ فیل ہوا۔ چونکہ میں پورے صوبے میں اوّل پوزیشن لے کر کالج میں داخل ہوا تھا اس لئے کلاس میں میرا رول نمبر لڑکوں میں سب سے پہلے یعنی تیرہ (۱۳) تھا پہلے بارہ نمبر لڑکیوں کو دئے گئے تھے۔ (بعد میں کلاس میں آٹھ لڑکیاں اور داخل ہوئیں) اس وجہ سے سبھی کو خبر تھی کہ میرا تعلیمی پس منظر کیا ہے۔ اس لئے ہر شخص اس پر حیران ہوتا تھا۔ ہمارے ڈیمانسٹریٹر بہت ہی سخت اور بدتمیزی کی حد تک تلخ زبان تھے خاص طور سے نیک محمد شیخ اور محمد یونس۔ وہ ایک منٹ میں عزت اتار دیا کرتے تھے اس لئے میں انکا خاص شکار تھا۔ وہ میری نالائقی پر مجھے برابر طعنے دیا کرتے تھے کہ یہ میرپور خاص کا شاہ عبداللطیف کالج نہیں ہے۔ میری اس ناگفتہ بہ کارکردگی کا نقطہ عروج یہ تھا کہ ایک دن ہمارے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ صدیق چوہدری صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کر کے کہا کہ بھئی میں تو پنجاب کا ہوں مگر سنا ہے کہ سندھ میں اچھے نمبر آنے کی وجہ تعلقات یا سماجی مرتبہ ہوتا ہے۔ تم کسی بڑے جاگیردار کے بیٹے ہو یا تمہارے کنبے نے بڑی رقم دیکر تمہیں یونیورسٹی میں پوزیشن دلوائی ہے کیونکہ تمہاری کارکردگی تو اس لائق نہیں۔ میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے کہا سر میں تو ایک غریب گھرانے کا لڑکا ہوں بس یہ سبجیکٹ مجھ سے نہیں چل رہے۔ بہرحال اس سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔ صرف یہ ہوا کہ میں نے کمر باندھ کر اتنی محنت ضرور کرنی شروع کر دی کہ بس پاس ہو جاؤں۔ یہ تھا بھی ضروری کیونکہ اگر میں فیل ہو جاتا تو میرا وظیفہ بند ہو جاتا جس کے بعد کالج میں پڑھائی جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ بہرحال اس موضوع کو یہ لکھ کر ختم کرتا ہوں کہ سالانہ امتحان میں میں بارڈر پر پاس ہوا جسکا اثر پانچویں سال میں پڑا جب میں گزشتہ چار سالوں کی کارکردگی کی وجہ سے بہترین اسٹوڈنٹ اور گولڈ میڈل کا امیدوار تھا، میڈل جیتنے میں ناکام رہا اور پانچ سال کے مجموعی نمبروں کی بنیاد پر میں نے منیر عباسی سے چند نمبروں سے شکست کھائی۔ یہاں یہ بھی لکھنا ضروری ہے کہ اس کلاس میں میرے ایک دوست داؤد نے فرسٹ کلاس فرسٹ اور اناٹومی میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ وہ واقعی اناٹومی میں اس قدر ہوشیار تھا کہ ایسا لگتا تھا کہ اس پر ''غیب سے یہ مضمون'' اترتا ہے۔ مگر اس کے بعد داؤد باقی کسی بھی سال میں اچھے نمبر یعنی پوزیشن نہیں لے سکا۔

ایک خوشگوار شام

اب ایک ایسی شام کا ذکر آ رہا ہے جسکی خوشگوار یاد ہمارے بیچ کے ہر لڑکے کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دے گی۔ گلابی جاڑوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ ہماری کلاس اب کالج میں خوب جانی پہچانی ہوگئی تھی اور کالج کے باقی طلبہ نے ہمیں مکمل طور پر قبول کر لیا تھا۔ اس وقت تک ہاسٹل کی شامِ موسیقی کے سوا ہماری کلاس نے شام کی کوئی اچھی تقریب نہیں کی تھی اور اس میں بھی لڑکیاں شریک نہیں ہوئی تھیں۔ روایت تھی کے سال کے اختتام پر کلاس کی سالانہ پارٹی اور ڈنر ہوتا تھا۔ ابھی تک اسکا موقعہ نہیں ملا تھا۔ ہم اس کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ قدرت نے ہمیں ایک اچھا موقعہ فراہم کر دیا۔ ہمارے ایک ڈیمانسٹریٹر غفار قریشی کو انگلینڈ جا کر ایف آر سی ایس کرنے کے لئے وظیفہ ملا۔ ہم نے ان کے لئے ایک الوداعی پارٹی منعقد کی۔

باقی صفحہ ۱۰۱ پر ملاحظہ فرمایئے

دیوانِ رباعیاتِ انیسؔ

پروفیسر بیگ احساس

(حیدر آباد، دکن)

میر ببر علی انیسؔ اردو کے چار عظیم شاعروں میں سے ایک ہیں۔ بڑے شاعروں کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کے بارے میں کافی لکھا جا چکا ہے اور مزید ان پر کچھ لکھنا دشوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نہ تو میرؔ کا حق ادا ہو سکا اور نہ میر انیس کا۔۔۔! غالبؔ اور اقبالؔ نسبتاً خوش قسمت ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے پھر ایک بار بھاری پتھر اُٹھایا ہے۔ اس سے قبل وہ اقبالؔ پر ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے'' اور ''چوں مرگ آید'' غالبؔ پر ''غالبؔ کا دیوانِ نعت و منقبت'' اور ''دیوانِ غالبؔ فارسی'' میر انیسؔ پر ''تجزیہ یادگار انیسؔ'' لکھ چکے ہیں۔ اب انھوں نے دیوانِ رباعیاتِ انیسؔ ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ اس دیوان کا انتساب انھوں نے ماہر انیسیات پروفیسر سید نیّرؔ مسعود کے نام کیا ہے۔ ابتداء میں حیات، فن اور شخصیت میر انیسؔ ہے۔ میر انیسؔ دنیا کے واحد شاعر ہیں جن کے خاندان میں نسل در نسل آٹھ ممتاز شاعر پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے مطابق اس خاندان نے تقریباً تین صدیوں تک پہلے فارسی اور پھر اردو زبان کی خدمت کی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے میر ضاحک، میر حسنؔ، میر خلیقؔ، میر مہر علی انسؔ، میر محمد نواب مونسؔ، میر نفیسؔ، میر رئیسؔ، میر سلیسؔ، خورشید حسن عروجؔ کی تاریخ پیدائش، تاریخ وفات اور مختصر حالات زندگی درج کیے ہیں۔ انھوں نے نظم طباطبائی کی اس بات کو غلط ثابت کیا کہ میر انیسؔ نے محمد عسکری رئیسؔ کے نام سے مرثیہ ''نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری'' کہا اور رئیس ہی کی پشت کی نسبت یہ شعر بھی شامل کیا۔

عمر گزری ہے اس دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ڈاکٹر تقی عابدی لکھتے ہیں۔ ''ویسے بھی میر ہدایت کو شاعر تسلیم کر لیا جائے تو خود کو انیسؔ کی پانچویں پشت ہوتی ہے۔ اس لیے تو دلہا صاحب عروج نے جو انیس کے پوتے تھے خود کو:

سات پشتوں کا شرابی ہوں کوئی اور نہیں'' کہا تھا۔

ڈاکٹر تقی عابدی کا یہ انکشاف بھی چونکا تا ہے کہ میر انیسؔ کے مرثیوں کی ترتیب کے لیے جب دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی نے دولہا صاحب سے رجوع کیا تو انھوں نے اس کام کے لیے دس ہزار روپیوں کا مطالبہ کیا جو اشاعتی کمیٹی نے منظور نہیں کیا بعد میں اس کام کو نظم طباطبائی کے سپرد کیا گیا۔

دولہا صاحب عروجؔ کے فرزند فائز صاحب لاولد تھے۔ میر انیس کے خاندان کا سلسلہ یہاں ختم ہو گیا۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے میر انیسؔ کی تاریخ ولادت، ان کے ابتدائی اساتذہ، تعلیم اور شاعری کی ابتدا کے بارے میں مستند حوالوں سے تفصیلات درج کی ہیں۔ شیخ ناسخؔ نے میر ببر علی کا تخلص حزیںؔ سے بدل کر انیسؔ کر دیا۔ ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب کے حوالے سے ڈاکٹر تقی عابدی نے لکھا کہ شاعری میں انیسؔ کے کسی استاد کا نام نہیں ملتا۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اور امجد علی اشہری کے بیان کردہ میر انیسؔ کے خدوخال کی تفصیل لکھی ہے۔ شادؔ عظیم آبادی کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ میر انیسؔ نے مشکور الدولہ سے تصویر کھنچوائی تھی اور ایک عرصہ بعد جب فوٹو کا رنگ اڑنے لگا تو میرزا اشار مہدی مرحوم سے اس فوٹو کی نقل آئیل پنٹ سے بنوائی۔ یہ تصویر 1940ء تک شادؔ عظیم آبادی کے پاس محفوظ تھی۔ میر انیسؔ کی مستند تصویر وہ اس ہاتھی دانت کی تختی پر بنائی ہوئی مصور کی تصویر قرار دیتے ہیں۔

تقی عابدی نے وضع اور لباس، پابندی وقت، اخلاق و کردار کے عنوانات سے تفصیلات درج کی ہیں۔ میر انیسؔ کسی کی غیبت گوارہ نہیں کرتے تھے۔ خاص طور پر مرزا دبیرؔ کی برائی کرنے والوں سے وہ سخت خفا ہوتے تھے۔ میر انیسؔ کا شعری ذخیرہ کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب نے تمام اہم محققین کے تعداد اشعار دکھائی ہیں وہ درج کی ہیں۔ ان کی اپنی تحقیق کے مطابق مراثی 213، سلام 103، نوحے 4 اور درجن بھر تضمینات مناجات کے علاوہ رباعیات کی تعداد 579 ہے۔ انھوں نے حالیؔ کے اس خیال کو بھی غلط ثابت کیا کہ ''نظیرا کبرآبادی نے شاید انیسؔ سے بھی زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں''۔ انتخاب بحر، مرثیوں کے مطلعے، شعرا کی قدردانی، تقلید طرز مرثیہ، تلامذہ، اقامت گاہیں، ذاتی امام باڑہ، منبر پر نشست اور پڑھنے کا انداز کے عنوانات سے تفصیلات لکھیں اس کے علاوہ مجالس کی تفصیلات، بیماری اور وفات کے بارے میں لکھا ہے۔ ''رباعیات انیسؔ کا اجمالی تذکرہ اور تجزیہ'' کے باب میں ڈاکٹر تقی عابدی نے رباعی کو ایرانیوں کی ایجاد قرار دیا۔ انھوں نے ڈاکٹر پروفیسر ناتل خانلری، محمد قیس بن رازی، اوج لکھنوی، علی حیدر طباطبائی، محمود شیرانی، نجم الغنی، پنڈت دتاتریہ کیفی کے حوالوں سے اسے ثابت بھی کیا اور سلیمان ندوی کی اس رائے سے اختلاف کیا کہ رباعی عربی نژاد ہے۔ انھوں نے ''حدائق'' میں ابن قیس نے امام حسن قطان کے ترتیب شدہ چوبیس اوزان کے لیے جو دو شجرے اخرم اور اخرب تیار کیے تھے انہیں پیش کر دیا۔ انھوں نے فارسی رباعی کے ارتقائی سفر کی نشان دہی کی اور عمر خیام، ابوسعید ابوالخیر، عطار اور سرمد کو نمائندہ رباعی گو شاعر قرار دیا۔ اردو رباعی کے ارتقاء پر بھی سیر حاصل گفتگو کی۔ ان کی تحقیق کے مطابق غالبؔ نے صرف سولہ اردو رباعیاں کہی ہیں۔ علامہ اقبال کی رباعیاں، رباعی کی بحر میں نہیں ہیں، انہیں رباعی نہیں کہا جا سکتا۔

وہ لکھتے ہیں ''رباعی میں جذبات سے زیادہ تجربات کا عمل دخل ہوتا ہے اس لیے رباعی فکر و تفکر کا سرچشمہ ہوتی ہے، چنانچہ جذباتی اشعار کی طرح اس کا اثر تیز و تند اور کوتاہ نہیں ہوتا بلکہ اس کی تاخیر سانچے کو یلے کی آگ کی طرح دھیمی مگر دراز مدت تک ذہن کو گرماتی اور روشن کرتی ہے اور پھر مشکل ہی سے ذہن سے نکلتی ہے شاید اسی لیے نظموں میں رباعی سب سے زیادہ حافظے میں محفوظ رہتی ہے''۔(ص94)

ڈاکٹر تقی عابدی نے میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی رباعیوں میں مضامین کی تکرار تلاش کی ہے اور ایسی 21 رباعیات پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے رباعیات کے مجموعوں کی فہرست بھی شائع کر دی اور ان میں شامل رباعیت کی تعداد بھی درج ہے۔ ان مجموعوں میں ڈاکٹر تقی عابدی کے دیوانِ رباعیاتِ انیسؔ کو فوقیت حاصل ہے جس میں (579) رباعیات ہیں۔

مراثی انیسؔ مطبوعہ نولکشور پریس کی ایک جلد اول میں 81 رباعیات ہیں جن میں 19 رباعیاں غلط ہیں۔ تقی عابدی صاحب نے غلط مصرعے اور اس کے قبل صحیح مصرعے درج کر دیے۔

میر انیسؔ کی رباعیات کے فارسی اور انگریزی تراجم بھی اس دیوان میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے رباعیات کو موضوع کے اعتبار سے تقسیم کیا ہے۔ حمدیہ، نعتیہ، منقبتی، اخلاقی، ذاتی، سماجی، اقتصادی اور رثائی رباعیات۔

ان رباعیات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے موضوعات، لب ولہجہ، لفظیات، سلاست و روانی، تشبیہات، استعارات، تلمیحات، تراکیب، محاوروں کا استعمال، فکر و جذبے کا امتزاج، اجتماعی تہذیب، داخلیت، معنوی اور صوری حسن، قوت مشاہدہ، صنعتوں کا استعمال کو مثالوں کے ساتھ پیش کیا۔ یہ ایک اہم کام ہے جو انتہائی عرق ریزی سے کیا گیا ہے۔

میر انیسؔ کے کلام پر بنگال کے رئیس نساخؔ نے ناموزوں مصرعوں کو انیسؔ سے منسوب کر کے جو اعتراضات کیے ڈاکٹر تقی عابدی نے ان کا جواب بھی دیا۔ آخر میں ''میر انیسؔ مشاہیر شعر و ادب کی نظر میں'' کے عنوان سے مشاہیر کی آرا اکٹھا کی گئی ہیں جن میں مرزا غالبؔ سے لے کر افتخار عارفؔ تک سبھی شامل ہیں۔

افتخار عارف کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہ ''پچھلے چند برسوں میں انیسیات میں کوئی بہت قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا۔ گرامی قدر نیّر مسعود نے اپنے والد بزرگ استاد الاساتذہ پروفیسر مسعود حسن رضوی کی روایت میں بلاشبہ جو گراں اضافے کیے اور مرحوم و مغفور سید جواد علی زیدی، شارب رودلوی، پروفیسر گوپی چند نارنگ کے کچھ مضامین استثنا قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اب تو رثائی ادب کی تحریریں عزاخانوں کے مذہبی کتب گھروں تک محدود رہ گئی ہیں اور بڑے شہروں میں مراثی کے مجموعہ بہت مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں''۔

میں ڈاکٹر تقی عابدی کی خدمت میں اس اہم اور مفید کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

بقیہ : ہوا کے دوش پر

ہماری کلاس میں بیس لڑکیاں تھیں مگر کالج کے وقت وہ سب سفید شلوار قمیض اور سفید کوٹ کا استعمال کرتی تھیں پھر تیز دھوپ اور مشقت کی وجہ سے وہ عجب مرجھائی لگتی تھیں۔ ہم لڑکے جل کر کہتے'' یار ہماری قسمت میں یہی لکھی تھیں''۔ کبھی کبھی شام کے وقت وہ کیمپس میں چہل قدمی کرتے یا حیدر آباد تفریح کے لئے جاتے رنگین کپڑوں میں نظر آجاتی تھیں۔ اسی طرح لڑکے بھی بڑی حد تک سادہ کپڑے پہنتے تھے۔ اس شام ایسا لگا کہ فیشن شو ہو رہا ہو۔ شائد لڑکیوں کو اسی موقعہ کی تلاش تھی کہ اپنے کپڑوں اور حسن کی بہار دکھائیں۔ آج وہ کچھ اور ہی لگ رہی تھیں۔ اسی طرح لڑکے بھی شاندار سوٹس میں تھے۔ میرے پاس کوئی سوٹ نہ تھا مگر میں نے زپر والا جیکٹ، سرمئی پتلون اور کالی ٹائی لگائی تھی۔ نجمہ شیخ بھی سیاہ پھول دار ٹائٹ شرٹ، چھوٹی مہری کی شلوار اور اونچی ایڑھی کی سنڈل میں تھی (اس زمانے میں ٹیڈی گرلز کا فیشن تھا) اور میں نے پہلی دفعہ اسے میک اپ میں دیکھا تھا۔ کچھ سموسوں پکوڑوں اور چائے کے بعد کالج کی لائبریری کے سامنے ایک گروپ تصویر کھنچوائی گئی۔ اس کے بعد ایک ورائٹی شو جو میں نے ترتیب دیا تھا اناٹومی کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ پھر ایک عمدہ ڈنر۔۔ یہ تصویر آج بھی میری لائبریری میں آویزاں ہے اور اس پر ۱۹۶۳ درج ہے میں دوسری قطار میں کھڑا ہوں۔۔۔ اسے دیکھتا ہوں تو استاد قمر جلالوی کا یہ مصرعہ یاد آتا ہے

میں جھک کے ڈھونڈتا ہوں جوانی کدھر گئی

☆☆☆

بقیہ : ادھ کھائی بوٹیاں

نجات حاصل کر لی تھی..... مومو کا بھورا بلا شاید! اُتنا' منہ زور اور ہتھ چھٹ نہیں ہے جتنا! ہمارا اور آپ کا بھورا بلا ہے..... یہ اپنے لئے خطرہ بننے والوں اور وقت پر پوری ہڈیاں معہ گوشت نہ پہنچانے والوں کو نہ صرف دن کی روشنی میں مارتا بلکہ اُس کا اعلان بھی التزام سے کرتا ہے۔ جس کے بعد باقی بچ رہنے والے مومو کی طرح' ادھ کھائی بوٹیاں' ہڈیاں کہہ کر' خوشی خوشی بھورے بلّے کو کھلانے اور ''سویٹی'' کو بھول کر بھورے بلّے کی محبت کے گن گانے پر مجبور ہوتے ہیں.....!!!

رشتوں کی تقدیس

رینو بہل
(چندی گڑھ، بھارت)

بڑے بزرگوں سے سُنتے آئے ہیں کہ کسی کو جاننے، سمجھنے اور پرکھنے کے لیے اُس کی صورت نہیں سیرت دیکھنی چاہیے۔ کہتے تو سبھی ہیں پر اس بات پر عمل کتنے لوگ کرتے ہیں۔ خدا جانے شادی بیاہ کے معاملے میں بھی سب سے پہلے رنگ روپ، نین نقش پر ہی تو نظر جاتی ہے، سیرت تو بعد میں ہی پتا چلتی ہے۔ شاید اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے جناب انل ٹھکر نے اپنا تازہ ناول ''رشتے'' کی خوبصورتی پر بھی توجہ دی ہے۔ ناول کا سرورق دیکھتے ہی بنتا ہے۔ کتاب کی جلد ایسی جیسے دروازے کے دو پٹ جسے کھولو تو ملائم کاغذ پر دلکش رنگوں سے دلکش چہرے پر زلفیں بکھرائے خوبصورت لڑکی کی تصویر جو ناول پڑھنے کو اُکسا رہی ہو۔ سرِورق اتنا دلکش کہ خود بخود نگاہیں اور اُنگلیاں صفحہ در صفحہ پلٹنے کو مجبور ہو جائیں۔

''رشتے'' شروع کرتے وقت سوچا تھا کہ دیکھوں یہ ناول کہاں تک پڑھا جا سکتا ہے۔ کب تک یہ اپنی گرفت میں میرے دل اور دماغ کو جکڑ سکتا ہے۔ اس سے پہلے بھی دو ناول شروع کئے تھے جو بیچ میں ادھورے ہی چھوڑ دیئے کیونکہ ان میں وہ قوت نہیں تھی کہ قاری کو باندھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دے مگر ''رشتے'' جیسے جیسے پڑھتی گئی اس کی جکڑ مضبوط ہوتی گئی۔ اس ناول کی سب سے اوّل خوبی یہ ہی ہے کہ کہانی میں اتنی کشش ہے کہ قاری اسے پڑھنے کو مجبور ہو جاتا ہے۔ کہیں بھی کوئی بھی باب کمزور نہیں ہے۔ ناول دو سو اٹھاسی صفحات پر مشتمل ہے۔ پھر بھی کوئی بھی تفصیل فضول، بے وجہ اور بے جواز نہیں ہے۔ کسی بھی واقعہ کو بے وجہ طول نہیں دیا گیا۔

''رشتے'' زندگی کی حقیقت اور انسان کی زندگی کے سب سے اہم پہلو یعنی ''رشتے'' پر ہی مبنی ہے۔ رشتوں کے بغیر زندگی کے کوئی معنی ہی نہیں۔ رشتے بنیادی ضرورت ہوتے ہیں۔ رشتے جینے کے لیے اُتنے ہی ضروری ہیں جیسے جسم کے لیے غذا اور سانسوں کے لیے ہوا۔

''رشتے'' ایک خانگی ڈرامہ ہے۔ ساری کہانی ایک خاندان کے چند افراد کے گرد گھومتی ہے۔ کہانی کے تین کردار اہم ہیں ''دیپک'' اس کی خوبصورت بیوی ''بھارتی'' اور اُن کی گود لی ہوئی بیٹی ''کرشمہ''۔ اس ناول کا مرکزی کردار بھارتی ہی ہے جو ایک بہو بھی ہے، بیوی بھی اور ماں بھی۔ اُس کا رشتہ اپنے ساس سُسر سے کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے کیونکہ وہ اس گھر کو چشم چراغ دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ گھر میں رشتوں میں اس سبب تناؤ بڑھنے لگا تو سُسر نے دوسری کوٹھی ان کے نام کر دی اور دیپک اپنی بیوی کو لے کر الگ رہنے لگا۔ گھر ضرور الگ ہو گئے مگر کام الگ نہیں ہوئے اور نہ ہی رشتوں میں دراڑ آئی۔

بھارتی ایک اچھی بیوی ہے۔ اپنے شوہر کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہے اسے دل و جان سے چاہتی ہے۔ اُس کے پاس اچھی زندگی بسر کرنے کے لیے سب کچھ موجود ہے پھر بھی وہ مایوس رہتی ہے کیونکہ وہ بے اولاد ہے۔ ماں بننے کی خواہش اتنا زور پکڑتی ہے کہ وہ ذہنی الجھنوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ اسے خواب آ آ کر ڈرانے لگتے ہیں پھر خود ہی ان خوابوں سے اُلجھ جاتی ہے اور سوچتی ہے کہ:

''خواب وہ نہیں ہوتے جو نیند میں دیکھے جاتے ہیں جن کی صورت آفتاب کے طلوع ہوتے ہی یقینی ہے۔ خواب وہ ہیں جو جاگتی آنکھوں میں اُترتے ہیں اور جن کی ہم اپنی سانسوں سے پرورش کرتے ہیں۔ کبھی کبھی سانسیں ٹوٹ جاتی ہیں مگر خواب نہیں ٹوٹتے۔ وہ ہماری پلکوں پر چمگادڑوں کی طرح لٹکتے رہتے ہیں''۔

بھارتی کی دن بہ دن بگڑتی صحت کو دیکھ کر دیپک ڈاکٹروں کا سہارا لیتا ہے۔ جانچ کے بعد پتا چلتا ہے کہ ماں بننے کی صلاحیت بھارتی میں نہیں مگر وہ باپ بن سکتا ہے۔ وہ بھارتی کے لیے تڑپ اٹھتا ہے۔ جس طرح ٹھکر صاحب نے عورتوں کی نفسیات کو خوبی سے سمجھا اور بیان کیا ہے اسی طرح مرد کی نفسیات کے ساتھ بھی اُنہوں نے پورا انصاف کیا ہے۔ دیپک مضبوط اور بلند کردار کا مالک ہے۔ وہ ایک حساس دل انسان ہے۔ بھارتی کے ٹوٹتے خواب دیکھ کر وہ پریشان ہو اُٹھتا ہے اور سوچتا ہے کہ:

''اس کے ارمان کہیں تتر بتر ہو کر نہ بکھر جائیں! نو مہینے بچے کو کوکھ میں سنبھالنے کی خوشی، درد اور سنہرے خوابوں کے جھولے میں جھولنے کی لذت سے وہ محروم نہ ہو جائے''

اور اس ڈر سے کہ کہیں اُس کے والدین اُس کی دوسری شادی نہ کرا دیں وہ ایک دوسری رپورٹ بنوا لیتا ہے جس میں لکھا ہوتا ہے کہ وہ باپ نہیں بن سکتا اور یہ رپورٹ وہ نس بندی کروانے کے بعد تیار کرواتا ہے۔ ایک مرد کی اتنی بڑی قربانی اس کی محبت کو ظاہر کرتی ہے اور دیپک کے کردار کو قاری کی نظر میں بلند بھی کر دیتی ہے۔

اپنی زندگی کے ادھورے پن کو پورا کرنے کے لیے دونوں ایک بچی یتیم خانے سے گود لے لیتے ہیں۔ روایت پسند والدین اس فیصلے سے خوش نہیں ہوتے مگر دھیرے دھیرے ننھی سی بچی ''کرشمہ'' اُن سب کا دل جیت لیتی ہے۔ کرشمہ کو گود لے کر بھارتی خود کو مکمل محسوس کرنے لگتی ہے وہ اس بچی کی پرورش میں اپنا آپ بھی بھول جاتی ہے، اپنے شوہر کی ضرورتیں بھول جاتی ہے۔ پہلے وہ صرف بیوی تھی اب رشتے بدلنے سے وہ خود کو پہلے ماں اور پھر بیوی سمجھتی ہے۔ اپنی زندگی میں اتنا بڑا بدلاؤ دیکھ کر دیپک پریشان ہو اُٹھتا ہے اور ایک روز بھارتی سے کہہ دیتا ہے:

''ہم اسے اپنی زندگی کا حصہ بنانے لائے تھے تم اسے ہمارے

درمیان دیوار بنا رہی ہو''

زندگی کے حالات بدلے تو دونوں کی زندگی میں دونوں کے رشتوں میں بدلاؤ آنا لازمی تھا۔

''بھارتی اولاد کے سُکھ سے مطمئن ہونا چاہتی تھی، جبکہ دیپک جسمانی آسودگی کا طلبگار تھا۔ان کی آرزوؤں اور خواہشوں میں تضاد بڑھ رہا تھا''

بھارتی نے ثابت کر دیا تھا کہ ممتا کا جذبہ سب سے اُوپر ہے اُس نے کرشمہ کو تراشتے، نکھرانے اُسے ایک اچھا قابل انسان بنانے کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ممتا کے بہاؤ میں بہہ کر وہ اپنے شوہر کی ضرورتیں نظر انداز کرتی گئی۔ جسمانی تعلقات پر ممتا کو ترجیح دینے پر اڑی رہی۔

اتفاق سے ایک روز دیپک کو اپنی ادھوری جسمانی خواہشات کو پورا کرنے کا موقعہ مل گیا۔ایک رات ایک جسم فروش عورت جسے اس نے سرکاری افسر سے کام نکلوانے کے لیے خریدا تھا، خود اس کے ساتھ رات گزارنے کا موقعہ حاصل ہوا۔اُس وقت اس کا کردار دوراہے پر کھڑا تھا۔

''گھی سے بنے پکوان کی سوندھی سوندھی خوشبو جیسے کسی بھوکے کی ناک کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔جسم و جان بھی بھوکے ہیں، پھر کیوں بغیر کھانا کھائے لوٹا دیا جائے! کم از کم ذائقہ تو چکھ لیا جائے''

''ہاں'' اور ''ناں'' کی اس کشمکش میں وہ سوچتا رہا کہ تن کی بھوک مٹا کر جذبات ٹھنڈے کر لیے جائیں یا الاؤ کے سامنے بیٹھ کر ہاتھ سینکنے پر اکتفا کیا جائے۔شیطان اور ضمیر میں چھڑی جنگ میں جیت ضمیر کی ہوئی جس نے اُسے اخلاق اور اپنی ہی نظروں میں گرنے سے بچالیا۔اسے یاد آیا کہ اس نے اپنی بیوی سے وفاداری، پیار، محبت کی خاطر نس بندی کروا کر جو قربانی دی تھی وہ جسم کی بھوک اور کچھ لمحوں کی تسکین کی خاطر، اپنی ادھوری خواہشات کی تکمیل کی خاطر نہ تو اپنی بیوی سے بے وفائی کر سکتا ہے اور نہ ہی اس مجبور جسم فروش عورت کی مجبوری کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

دیپک کے اس فیصلے نے رشتے کو پامال ہونے سے بچالیا۔

سن بلوغت کی الجھنیں، ماں باپ اور بچوں کے نظریہ کے اخلاقیات کو بھی ٹھکر صاحب نے بہت سنجیدگی سے چھیڑا ہے۔کرشمہ کے جوانی میں قدم رکھتے ہی ماں سے تھوڑے بہت اختلافات ہونے لگے۔اُسے ماں کی حد سے زیادہ پابندیاں تکلیف دیتی تھیں۔پھر دھیرے دھیرے ایک روز اس پر یہ راز کھل گیا کہ بھارتی اس کی ماں نہیں ہے اُسے گود لیا گیا ہے۔اُن کی زندگی میں طوفان آ گیا، ہنستی کھیلتی زندگیاں اچانک بکھرنے لگیں۔کرشمہ ماں سے کٹی کٹی رہنے لگی اور اپنی اصل ماں کی تلاش میں بھٹکنے لگی۔اسی چکر میں وہ دو ایسے لوگوں کے چنگل میں پھنس گئی جنھوں نے اسے اغوا کر لیا۔جب سے کرشمہ نے ماں سے بے رُخی شروع کی تھی اُس کی صحت پر اس کا گہرا اثر ہوا تھا اور جب وہ اغوا ہو گئی تو اس کی صحت اس قدر بگڑ گئی کہ اسے ہسپتال داخل کروانا پڑا۔جیسے جیسے جدائی کے لمحات گزرنے لگے ماں کی طبیعت ناساز ہوتی گئی۔دو دن دنیا کی ٹھوکر نے کھانے اور مجرموں کے چُنگل سے بچ نکلنے کے بعد کرشمہ کو احساس ہو گیا کہ اُس کی اصلی ماں بھارتی ہی ہے جس نے بڑے پیار سے اس کو سینچا ہے وہ بلاوجہ اُس ماں کو تلاش کرتی بھٹکتی رہی جو جنم دے کر اُسے چھوڑ گئی۔وقت پر ہسپتال پہنچے پر ماں کی ڈوبتی سانسوں کو پھر سے زندگی مل گئی۔

رشتوں کی اہمیت، رشتوں کا تقدس، انہیں کیسے سینچا جاتا ہے، اُنہیں کیسے نبھایا جاتا ہے، ان سب کا ٹھکر صاحب کو گہرا تجربہ اور احساس ہے۔انھوں نے اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات اور عرق ریزی سے رشتوں کو پرکھا ہے تبھی تو وہ لکھتے ہیں:

''رشتے آسمان سے اُتری چیز نہیں ہیں۔یہ تو جیسے بیج بونے سے پودا پھلتا پھولتا ہے، ویسے ہی رشتے کے پودے کو محبت اور شفقت سے سینچنا پڑتا ہے۔قربانیوں اور سمجھوتوں کی کھاد ڈالنی ہوتی ہے۔یہ سلسلہ تا عمر چلتا ہے تب جا کر رشتہ گھنا پیڑ بنتا ہے''۔

رشتوں میں توازن رکھنا لازمی ہے۔اپنے تجربات کو ظاہر کرتے ہوئے ٹھکر صاحب لکھتے ہیں:

''منہ اور زبان دونوں ہمارے جسم کے حصّے ہیں۔کبھی غلطی سے دانت زبان کو کاٹ لے تو ہم دانٹ کو اکھاڑ کر پھینک نہیں دیتے درگزر کر دیتے ہیں''

آگے بہت ہی خوبصورت بات لکھتے ہیں:

''سُکھ دکھ بانٹنے سے ہی رشتے پروان چڑھتے ہیں۔۔۔یہ رشتے جنگلی پھول کے مانند ہوتے ہیں۔جانے کب، کس کی زندگی میں تھوڑے سے وقفے کے لیے رنگ بکھیر کر کھو جاتے ہیں اور اس کی یادوں کے آسمان پر کہکشاں بن کر چھا جاتے ہیں''۔

ناول کے کردار گنے چُنے ہیں اور سبھی کردار اپنی مریادا میں رہ کر اپنا رول ادا کرتے ہیں اور کردار کی گریما بنائے رکھتے ہیں۔

معاشرے میں پھیلی بُرائیوں پر بھی ٹھکر صاحب کی کڑی نظر ہے۔ ایک ہی باب میں انھوں نے ایسی کئی بُرائیوں کا ذکر کیا ہے جو معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کر رہی ہیں۔رشوت خوری کس طرح ہمارے System کو بودا کر رہی ہے، نیچے سے لے کر اوپر تک سبھی اس جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ملاحظہ کیجیے:

''کام کے عوض آپ جو رشوت اسے دیں گے، اس میں سے تیس فیصد بابا کے حصے میں جائے گی۔بیس فیصد افسر لے گا اور پچاس فیصد منسٹر کی جیب میں پہنچ جائے گی''۔

سرکاری افسران کے غیر قانونی کام کرنے کے انداز کا بھی ٹھکر صاحب نے پردہ فاش کیا ہے:

''بڑے سرکاری افسروں اور منسٹروں سے کام کروانے کے لیے پانچ ستارہ ہوٹلوں

باقی صفحہ ۱۰۵ پر ملاحظہ فرمائیے

''الیکشن کا زمانہ''

انوار فیروز
(راولپنڈی)

محبوب عزمی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں وہ اسلام آباد کی ادبی محفلوں کی جان تھے۔ ''بزمِ ارباب ودانش''، ''ادارہ ادب وثقافت'' اور ''بزمِ تجدیدِ کتاب'' کے سرپرست اور ''بزمِ شعروادب'' کے خزانچی رہے۔ اسلام آباد کے مشاعروں کے علاوہ ٹی اور ریڈیو پاکستان کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ انھوں نے سنجیدہ شاعری سے آغاز کیا لیکن مجید لاہوری اور سید محمد جعفری سے متاثر ہوکر طنز ومزاح کی طرف آ گئے۔ پھر زیادہ تر مزاحیہ شاعری کی۔ انھوں نے نعت اور منقبت بھی کہیں اور جاسوسی ناول لکھ کر بھی اپنا سکّہ منوایا۔ انہیں ہر صنف پر عبور حاصل تھا۔

وزارت اطلاعات و نشریات میں ملازم تھے جہاں سے 1985 میں ریٹائر ہوئے۔ ان کی زندگی میں کوئی کتاب نہ چھپ سکی اب ان کے ہونہار بیٹے طارق شاہد نے جو اکادمی ادبیات پاکستان میں افسرِ تعلقاتِ عامہ ہیں، ان کی دو کتابیں شائع کی ہیں پہلی کتاب طنزیہ اور مزاحیہ قطعات پر مشتمل ہے اور اس کا نام ہے ''مکرر کہے بغیر'' اور دوسرے شعری مجموعے ''کیسے کہوں'' میں نظمیں شامل ہیں۔ ''مکرر کہے بغیر'' میں ان کے خوبصورت قطعات شامل ہیں ان کی مزاحیہ شاعری کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں پھکڑ پن نہیں، وہ لوگوں کے لبوں پر مسکراہٹیں بکھیرتے ہیں، وہ حالاتِ حاضرہ پر خوبصورت انداز میں تبصرہ کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کو ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی اور عطاء الحق قاسمی نے شاندار الفاظ میں سراہا ہے۔ کتاب میں شامل چند قطعات ملاحظہ ہوں جن سے محبوب عزمی کی بلند پروازی کا ثبوت ملتا ہے:

اندیشہ

آٹا، چینی، گھی ابھی ہے دستیاب
یہ گرانی دیکھ کر روتا ہے کیا
کہہ گئے غالبِ اِنہیں حالات پر
''آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا''

شادی

لڑکی کہاں سے لاؤں میں شادی کے واسطے
شاید کہ اس میں میرے مقدر کا دوش ہے
عذرا، نسیم، کوثر و تسنیم بھی گئیں
''اک ''شمع'' رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے''

مولا کی دین

میں جو جوتا چھپا کے لایا ہوں
یوں نہ سمجھو چرا کے لایا ہوں
اس کو مولا کی دین ہی سمجھو
اس کے گھر سے اٹھا کے لایا ہوں

گردشِ دوراں

ہو پاس اقتدار تو ہوتے ہیں سو سلام
چھن جائے اقتدار کوئی پوچھتا نہیں
ہائے وہ جن کی کار پہ لگتی تھیں جھنڈیاں
پھرتے ہیں اب وہ خوار کوئی پوچھتا نہیں

حقیقت

حقیقت کی تجھ کو خبر ہی نہیں ہے
نہ جا ان کے ظاہر پہ میرے مربّی
کمائی پہ رشوت کی اکثر بنے ہیں
وہ گھر جن پہ لکھا ہے ''مِن فضلِ رَبّی''

دیکھا آپ نے محبوب عزمی کس قدر خوبصورت انداز میں طنز کرتے ہیں، یہ قطع ملاحظہ ہو:

ہوسِ زر

ایک لیڈر نے خوب فرمایا
پہلے لوگوں نے خوب کھایا ہے
ہم کو بھی اب کی بار موقع دیں
ہم نے اب تک تو دکھ اٹھایا ہے

محبوب عزمی حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر رکھتے تھے اور اپنے اردگرد کے واقعات کو اپنے قطعات کا موضوع بناتے تھے، مثلاً:

آبیاری

چور بازاری اور کرپشن ہے
جرم کی اب تو آبیاری ہے
قتل و غارت ہے ہر جگہ عزمی
زندگی ہم پہ کتنی بھاری ہے

بہبود آبادی

دیکھ کر بہبودِ آبادی کا ایڈ
اچھے تو اس دور میں بچے ہیں دو
پوچھتے ہیں مجھ سے چھ بچے مرے

ہم میں بچے کون سے اچھے ہیں دو؟

غرض کتاب میں شامل تمام قطعات ایسے ہی خوبصورت ہیں ۔ محبوب عزمی کو مزاحیہ قطعات لکھنے پر پوری طرح دسترس حاصل تھی۔

ان کی طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں بھی بھرپور ہیں۔ ''کیسے کہوں'' میں شامل چند نظموں کے عنوان ملاحظہ ہوں۔ ''جاڑے کی شام، ویگن، ٹیلی فون، مسکہ پالش، الیکشن کا زمانہ''۔

''الیکشن کا زمانہ'' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

انتخابوں کی بہت تشہیر ہے
''سائیکل'' ہے اور کہیں پر ''تیر'' ہے
صرف لیڈر کی یہاں توقیر ہے
قوم کی حالت مگر دل گیر ہے
پھر الیکشن کا زمانہ آ گیا
گا رہا ہے اپنے گن ہر رہنما

دیکھا آپ نے وہ اپنے اردگرد کے ماحول پر کیسی گہری نظر رکھتے تھے۔

انہوں نے پیروڈیاں بھی لکھی ہیں جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ان میں علامہ اقبال کے ''شکوہ'' کی پیروڈی ''رشوت خور'' کے عنوان سے شامل ہے۔ اس کا بھی ایک بند ملاحظہ ہو:

آ گیا گر کہیں دفتر میں کوئی بندہ نواز
ہوسِ زر میں گرفتار ہوئی قومِ حجاز
نہ کہیں رُول رہا اور نہ کہیں ''لاء'' کا جواز
پستی عملے کی گئی اور گیا حاکم کا فراز
''بندہ و صاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے''
آئے رشوت کی جو زد میں تو سبھی ایک ہوئے

اسی طرح ''اہل ادب، تخریب کار، مشاعرے کا مزاح، سیاسی اتحاد، عید، سیٹ پکی رہے، سیاست کہاں گئی، بجلی کا بل، سیاست نامہ اور ہم زندہ قوم ہیں'' بھی بہت اچھی ہیں۔ محبوب عزمی ملکی سیاست پر بھی گہری نظر رکھتے تھے اور اپنی نظموں میں رہبروں پر طنز کرتے تھے۔

اسی شعری مجموعے میں محبوب عزمی کی شاعری کے بارے میں آغا ناصر، افتخار عارف، حلیم قریشی، ڈاکٹر نذیر تبسم، سرفراز شاہد، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، ڈاکٹر نثار ترابی اور انجم خلیق کی آراء بھی شامل ہیں، جن میں محبوب عزمی کی طنزیہ اور مزاحیہ نظموں، پیروڈی اور قطعات کی بھرپور انداز میں تعریف کی گئی ہے۔

یہ دونوں کتابیں طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ محبوب عزمی کی شاعری زندہ شاعری ہے ان کی شگفتہ بیانی اداس چہروں پر مسکراہٹیں بکھیر دیتی ہیں۔ دونوں کتابیں ''کلاسیک''، لاہور نے شائع کی ہیں۔ محبوب عزمی کے فرزند طارق شاہد کی محنت قابلِ داد ہے۔

بقیہ : رشتوں کی تقدیس

میں وچولئے مل جاتے ہیں۔ ہوٹل کا منیجر بھی اکثر انتظام کر دیتا ہے۔۔۔ کسی کا بھی کام کرنا ہو تو یہ انگور کی بیٹی کا سرخ رنگ پسند کرتے ہیں، ساتھ میں خدا کی بیٹی کی محبت بھی چاہتے ہیں''۔

آج کل خود کو بھگوان کہنے والے ''بابا'' بہت نظر آتے ہیں اُن کے چہرے کے پیچھے چھپے شیطان کو دنیا کے سامنے لانے میں بھی ٹھکر صاحب کامیاب رہے ہیں۔ عام انسان سے لے کر خاص شخص تک اپنی پریشانیوں سے نجات پانے کے لیے ''بابا'' کی پناہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ سرکاری افسر، پولیس افسر، سیاسی لیڈر، منسٹر وغیرہ سب کو ''بابا لوگ'' اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کوئی ان کے خلاف آواز اٹھا نہیں سکتا کیونکہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ایسے ڈھونگی بابا معاشرے کو اپنے ناپاک عمل سے نہ صرف اخلاق باختہ کرتے ہیں بلکہ بدطینت وبدکردار لوگوں کی ایسی فصل بو جاتے ہیں جو معاشرے میں آکاس بیل کی طرح پھیل کر کینسر سے بھی بدتر بیماریوں کا سبب بنتے ہیں۔

ایک ہی باب میں انل ٹھکر صاحب نے پورے System کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دی ہیں۔

کہانی کے ذریعہ وہ یہ کہنے اور ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ رشتے خون کے نہیں ہوتے رشتے پیار سے شفقت اور قربانی سے سینچے جائیں تو خون کے رشتوں سے بڑھ کر اہم ہو جاتے ہیں۔ ایک کامیاب کہانی کے سبھی لوازمات اس ناول میں شامل ہیں۔ ناول کی زبان عام بول چال کی طرح سادہ، سلیس اور دلکش ہے۔ ناول کی فضا طلسماتی نہیں بلکہ کردار اور ماحول حقیقی ہیں۔ کہانی میں کہیں جھول نہیں تسلسل اس طرح قائم ہے کہ پڑھنے والے کی محویت برقرار رہتی ہے۔ جذبات نگاری اور اُن کا بیان قاری کے دل ودماغ کو متاثر کئے بنا نہیں رہتا۔ لفظِ آخر کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''رشتے'' انل ٹھکر صاحب کی ایسی کاوش ہے جو تمام معاشرتی خوبیوں اور خامیوں پر محیط ہے۔ ادب کی دُنیا میں اسے وہ مقبولیت اور مقام ضرور نصیب ہوگا جو ایک بڑی تخلیق کا حق بنتا ہے۔

ٹھکر صاحب کے دل میں رشتوں کی اہمیت ناول کے انتساب سے ہی واضح ہو جاتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے ناول کا انتساب بے مثال رشتے بنانے والے ماہنامہ ''چہارسُو'' اور اس کے مدیر کے نام کیا ہے۔ ہر چند آرٹ اور فن کی کوئی قیمت نہیں ہوتی پھر بھی ادب کا یہ انمول رتن فقط تین صد روپے کے عوض ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی پر آپ کا منتظر ہے۔

''زندگی کا سفر''

امجد اسلام امجد
(لاہور)

ہاں یہی وقت ہے

غنچے پسِ بہار اگر کھل گئے تو کیا!
دن میں اگر چراغ کہیں جَل گئے تو کیا!

ملنے کا لطف جب ہے اگر وقت پر مِلیں
کھِلنے کا لطف تب ہے اگر وقت پر کھلیں

آتا نہیں پلٹ کے جو منظر بکھر گیا
جیسے وہ ایک بات جو باتوں میں کھو گئی
جیسے پُلوں کے نیچے سے پانی گزر گیا

ملنا اگر ہے دوست تو اِس پَل میں آ کے مِل
جذبے ابھی مرے نہیں، زندہ ابھی ہے دِل

○

حُسنِ سفر

زندگی کے سفر کا سارا حُسن
اس تذبذب میں ہے کہ آئندہ
آتی صبحوں کے اور شاموں کے، منظروں کا جمال کیا ہوگا!
منزلوں کو قریب لانے میں
دُوریوں کا کمال کیا ہوگا!
کیسی تعبیر ہوگی خوابوں کی
زخم کا اندمال کیا ہوگا!
راستے کیا ہمیں دکھائیں گے؟
ہم انہیں کِس طرح بنائیں گے؟

اس مسافت کا تجربہ ہے عجب
وقت دیتا ہے ہر مسافر کو، ہر قدم پر نیا سبق کوئی
غالب آتی ہے جب تھکن دل پر
دوست پھر حوصلہ بڑھاتے ہیں
زمزمے جو کہیں تھے پوشیدہ
اُن کو لفظوں میں ڈھال لاتے ہیں

یہ وہ رستہ ہے جس پہ دشمن بھی
اپنی نیّت کی تیرگی کے سبب
یوں تو تاریکیاں بچھاتے ہیں
پھر بھی یہ راستہ نہیں رکتا
روشنی اور بڑھتی جاتی ہے مشعلیں جس قدر بُجھاتے ہیں
اپنی کمزوریوں سے لڑنے کی ہم میں ہمّت نئی جگاتے ہیں

زندگی کے سفر کا سارا حسن بس اسی کشمکش میں ملتا ہے
یہ وہ غنچہ ہے جو کبھی آتش اور کبھی پانیوں میں کِھلتا ہے

''معذرت''

(پاکستان، اسلامی دنیا اور دُنیا بھر کے حالات دیکھنے کے بعد)

ڈاکٹر غلام ساگر
(امریکہ)

کِسی دعا کے لیے مجھ سے مت کہو بھائی
مِری دعا سے کوئی کام ہو نہیں پاتا
مِری دعا سے کوئی روگ بھی نہیں مٹتا
کسی کے دکھ کا ازالہ میں کر نہیں پاتا
مجھے نصیب نے مارا تو آنکھ روئی ہے
یا اور سب کے مسائل پہ آنکھ روئی ہے
کہیں پہ جنگ وجَدل اور کہیں پہ بیماری
کہیں پہ زلزلے، سیلاب کی تباہ کاری
کہیں پہ مذہبِ انسان کی سِیاہ کاری
مِری دعاؤں نے کیا کیا نہ روکنا چاہا
مِری دعائیں مگر معتبر نہ ہو پائیں
غمِ حیات سے وہ بہرہ ور نہ ہو پائیں
میں اپنے ہاتھ اٹھاؤں تو کس لیے بھائی
میں جس سے مانگتا رہتا ہوں خیر سب کے لیے
سُنا ہے وہ تو بہت بے نیاز ہے بھائی
تو آج تھک کے یہ کہتا ہوں ''پونچھ لو آنسو''
برستی آگ میں بارش کی آرزو بے سُود
خود اپنے ہاتھ سے شعلے بجُھا بجُھا کے چلو
دُعا کرو کے نہ کرو، خود کو آزما کے چلو
بھرم خدائی کا کاندھے پہ تم اُٹھا کے چلو

کِسی دعا کے لیے مجھ سے مت کہو بھائی
مِری دعا سے کوئی کام ہو نہیں پاتا
کسی بھی دکھ کا ازالہ میں کر نہیں پاتا

○

''آرزئے وصل''

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ
(امریکہ)

ایک تیرہ وتاریک شب میں
پوشیدگی کا لباس اوڑھے
وصل کی تمنّائی
تشنہ لب، شادمانی سے گریزاں
چُپکے سے وہ بھاگ نکلی،
بے خبر سوئے تھے سارے
زندگی کے در، دریچے وا پڑے تھے
اور قفسِ عنصری؟ محفوظ و منجمد، تماشا بنا تھا!

قرنوں سے جمہور کو ترسا وجود، جذبۂ احساس
از سرِ نو، کُھلی فضا میں، تہہ بہ تہہ
مسلسل تحلیل ہو رہا تھا، اور وہ ٹھہرا رہا
بھُول کر اپنا وجود،
سُکھ، دُکھ، رنج والم، سے لاتعلق
اُسکا چہرہ، محبوب کے چہرے پر جھکا تھا
جیسے وہ بیتاب ہو، مدغم ہونے کے لیے!!

جسمِ خاکی کو لوٹنے کی، کوئی بھی چاہ،
اب باقی نہیں تھی۔
شائد!
عُمر بھر، زندگی کے زہر و قند
پیتے پیتے تھک گیا تھا''!!!

○

سلیم آغا قزلباش
(سرگودھا)

کیا یہی زندگی ہے

تتلی کو چھونے کی کوشش کرنا
چاند میں کسی چہرے کے
نقوش ڈھونڈنا
آنسوؤں سے
خود اپنے ہی دامن کو
بھگوتے چلے جانا
اَور ہوا کے کسی
بے صبرے جھونکے کے ساتھ
بکھرتے اوراق کی صُورت
سارے شہر میں ٹھوکریں کھاتے پھرنا
پھر شام ڈھلے
کسی کٹیا میں
دھویں کی بدّھل مار کر
کھانستے کھانستے سو جانا
کیا یہی زندگی ہے!

○

ایکسٹر

وہ سب کے درمیان
موجود ہو کر بھی
غیر موجود ہے!
اس کا کوئی نام
کوئی شناخت نہیں
مگر اس کے بغیر
کوئی کہانی
کوئی مکالمہ
کوئی منظر
مکمل نہیں ہو پاتا
سب اس کے طلب گار رہتے ہیں!!

○

ولایت ہو کہ امریکہ میری پہچان ہے اردو

جاوید زیدی
(یو۔ایس۔اے)

ولایت ہو کہ امریکہ
میری پہچان ہے اردو
میرا لوح و قلم، طبل و علم
ایمان ہے اردو!
زبان کا روگ یارو
ماں نے یوں گھٹی میں ڈالا ہے
جہاں میں چار سو میری زبان کا بول بالا ہے
میرا خون جگر، فکر و نظر، طبعِ رواں اردو
وہ ہجرت ہو کہ غربت، ہے میری داستان اردو
قفس اور آشیاں اردو، زمین و آسماں اردو
وہ جن کو اوڑھ کر سوتا ہوں، میرے خواب بھی اردو
ولایت ہو کہ امریکہ، میری پہچان ہے اردو!

○

جواز

فیصل عظیم
(کینیڈا)

یقیں سنجیدگی سے دور بیٹھا تک رہا ہے
کہ آخر چاہتا کیا ہے یہ سنکی
یہ کس الجھن میں اتنی دور جا بیٹھا ہے مجھ سے
اور اب پھر سے مجھی تک آ رہا ہے، جانتا ہے۔۔
تو اتنے پیچ کیوں راہوں میں پیدا کر رہا ہے
یہ کیوں تشکیک اور وہموں کے پتھر نصب کر کے راہ نا ہموار کرتا جا رہا ہے
ہر اک مانوس سنگِ میل سے کترا رہا ہے
یقیں ہے بے یقینی کے بھنور میں
یہ سب کیا ہو رہا ہے
یہ دانستہ بہک کر کس کو دھوکہ دے رہا ہے
جو شک کا راستہ اپنا رہا ہے
جو کانٹے مل رہے ہیں ان کو چنتا جا رہا ہے

○

شبِ وعدہ

کرامت بخاری
(لاہور)

کبھی آہٹ اُبھرتی ہے کبھی دروازہ ہلتا ہے۔
کبھی ماضی کے منظر سے نیا منظر نکلتا ہے۔

کبھی آنچل کی خوشبو کو یہ دل محسوس کرتا ہے۔
تصوّر بے وفائی کا کبھی مایوس کرتا ہے۔
کبھی فرقت کا اِک لمحہ کئی صدیوں میں ڈھلتا ہے۔

کبھی اپنی اُمنگوں کو اُمیدیں سی دلاتا ہوں
ترا پیکر خیالوں میں بناتا ہوں سجاتا ہوں
کہاں اس خودفریبی سے دلِ ناداں بہلتا ہے۔

شبِ وعدہ چھلک اُٹھے ہیں آنکھوں کے یہ پیمانے
تجھے کُچھ یاد ہوگا بھی نہ ہو گا یہ خُدا جانے
ترا بیمار ہر آہٹ پر گرتا ہے سنبھلتا ہے۔

○

''تماثیل''

شگفتہ نازلی
(لاہور)

کلام اس میں کہاں کہ تم، بہت اچھی سی ممثلہ ہو۔۔۔
لگاؤ فن سے گہرا ہے جو لائق ہے ستائش کے۔۔۔
کہ تم اپنی نفی کر کے، کوئی کردار کرتی ہو۔۔۔
مگر تمثیل کہ دونوں کے تعارف کا سبب ٹھہری۔۔۔
اُسے نہ روگ بننے دیں۔۔۔
تمہارے بالمقابل جو بھی کچھ میں نے کیا تھا۔۔۔
وہ تمثیلی تقاضوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔
یہ خواہش تھی کہ ہو کردار کا تأثر جُداگانہ۔۔۔
تماشائی ''تماثیل'' اُس کو رکھیں، یاد برسوں تک۔۔۔
اور اَب انجانے میں ہی تم جو چاہو۔۔۔
تو وہ ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ۔۔۔
کہ پُھول اچھا لگے ہے فاصلے سے۔۔۔
ذرا چھُونے سے جانے کیوں بکھرتا ہی چلا جائے۔۔۔!

○

ایک صدی کا قصہ
کے۔آصف

دیپک کنول (ممبئی،بھارت)

کے۔آصف کا اصلی نام کریم دین آصف تھا۔وہ ریاست اُتر پردیش کے ضلع ایٹاوہ میں 14 اپریل 1922 کو پیدا ہوا۔اُسکے باپ کا نام ڈاکٹر فضل کریم اور ماں کا نام بی بی غلام فاطمہ تھا۔وہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا تھا۔شروع کی پڑھائی اُس نے ایٹاوہ میں ہی پوری کی۔کہا جاتا ہے کہ بعد کی تعلیم اُس نے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لے کر پوری کی۔آصف کی تعلیم کے بارے میں لوگوں کی متضاد رائے پائی جاتی ہے۔کچھ قریبی لوگوں کا کہنا ہے کہ آصف اُنگوٹھا چھاپ آدمی تھے۔اسکی تصدیق اُنکے کئی قریبی لوگوں نے کی ہے۔کہا جاتا ہے کہ اُنکے ماموں نذیر جو پیشے سے درزی تھے اور بعد میں وہ ایک کامڈین کے طور پر مشہور ہو گئے بمبئی میں رہتے تھے۔آصف اپنے ماموں کے بہت ہی چہیتے بھانجے تھے۔وہ اکثر اُنکے ساتھ ہی ٹھہرا کرتے تھے۔نذیر اُسے بھی ٹیلرنگ کے پیشے میں ڈالنا چاہتے تھے۔وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ آصف کا رجحان فلموں کی طرف ہے۔وہ ماموں سے بنا بتائے اسٹوڈیوز کا طواف کرنے نکل جاتا تھا اور صبح سے شام تک جوتیاں چٹخاتے پھرتا تھا۔وہ بڑا خوش گفتار اور چرب زبان تھا۔وہ کسی کو بھی اپنے بس میں کرنے میں ماہر تھا۔مجھے آصف کی ذاتی زندگی کے کئی ایسے گوشوں سے آگہی ہوئی ہے جو ہمیشہ فلمی نقادوں کی نگاہوں سے چھپے رہے ہیں۔آصف کی چوتھی اور آخری بیوی اختر آصف (جو دلیپ کمار کی چھوٹی بہن اور میری منہ بولی بہن ہے) کی معرفت مجھ پر آصف کی زندگی کے کئی ایسے پہلو آشکارا ہوئے جو آج تک سب سے پوشیدہ رہے۔

آصف مست ملنگ آدمی تھا۔وہ سن بلوغت کو پار کرتے ہی رومان پسند ہو گیا۔عورت اُسکی ہمیشہ کمزوری رہی۔کہا جاتا ہے کہ ماموں نذیر نے ڈانسر ستارہ دیوی سے شادی کی تھی۔ماموں کے گھر میں رہ کر آصف کا دل اپنی مامی پر آ گیا اور اُن کے بیچ قربت بڑھتی چلی گئی۔نزدیکیاں اس حد تک بڑھ گئیں کہ رشتوں کا تقدس پامال ہو گیا۔ایک دن جب نذیر نے ان دونوں کو رومانس کرتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو اُس نے غصے میں آ کر اپنی بیوی ستارہ کو طلاق دے دی اور ٹوٹا دل اور شکستہ ارمان لے کر وہ یہ ملک چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پاکستان جا کر بس گیا۔

اس بیچ آصف نے انڈسٹری میں اپنے پاؤں جما لئے تھے۔اُسے ہدایت کار کے طور پر ایک فلم ملی تھی۔1944 میں اُس نے اپنی پہلی فلم ''پھول'' بطور ہدایت کار پوری کی۔اس فلم میں اُس زمانے کے مشہور اداکار پرتھوی راج کپور، درگا کھوٹے اور ثریا شامل تھے۔یہ فلم خاصی کامیاب رہی۔اس فلم کی کامیابی کے بعد آصف نے ''مغل اعظم'' بنانے کا فیصلہ کیا۔اُنہوں نے اُس وقت کے بہت بڑے فائنانسر شیراز علی سے رجوع کیا جو سرمایہ کار کے ساتھ ساتھ فیمس اسٹوڈیو کے مالک بھی تھے۔شیراز علی نے اُن کے پروجیکٹ میں پیسہ ڈالنے میں رضامندی ظاہر کی۔شیراز علی نے سلیم کے رول کے لئے ایک نوخیز ایکٹر دلیپ کمار کے نام کی سفارش کی مگر آصف نے کسی نئے اداکار کو فلم میں لینے سے انکار کر دیا۔اُن کا کہنا تھا کہ کسی نئے کلاکار کو دیکھ کے کوئی بھی تھیٹر میں جھانکنے تک نہیں آئے گا سو اکبر کے رول کے لئے اُنہوں نے سپرو اور سلیم کے رول کے لئے چندر موہن کا انتخاب کیا جب کہ انارکلی کے رول کے لئے اُنہوں نے نرگس کو چنا۔اُنہوں نے انارکلی ڈرامے کے تخلیق کار امتیاز علی تاج کو کہانی اور اسکرپٹ رائٹر کے طور پر اور کمال امروہی کو مکالمہ نگار کے طور پر سائن کیا۔انل بسواس جو کہ اُس وقت شہرت کی بلندیوں پر تھے اُن کو موسیقار کے طور پر سائن کیا۔اس سے پہلے کہ فلم سیٹ پر جاتی 1946 میں فلم ''مغل اعظم'' کا اکبر چندر موہن چل بسا۔آصف کو چندر موہن کے چلے جانے سے بڑا گہرا دھچکا لگا۔بہر حال اُس نے ہمت نہیں ہاری۔اُس نے شیراز علی کو قائل کر کے فلمی کاسٹ میں ردوبدل کر کے چندر موہن کی جگہ سپرو کو لیا۔سپرو کئی تاریخی فلموں میں اس طرح کے رول بخوبی ادا کر چکا تھا۔شومئی نصیب کہ جب فلم کی دو تین ریلیں بن کر تیار ہو گئیں تو ملک میں فرقہ دارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔شیراز علی سب کچھ بیچ باچ کر پاکستان چلا گیا۔اُسنے اپنا فیمس اسٹوڈیو جگموہن رنگاٹا کو بیچ ڈالا اور آصف کی ''مغل اعظم'' کو ادھوری چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے پاکستان میں جا کر بس گیا۔آصف کی زندگی کا یہ سنہرا خواب ریزہ ریزہ ہو کر رہ گیا۔

''مغل اعظم'' کے انجام سے دل برداشتہ ہو کر اُنہوں نے ایک اور فلم شروع کی جس کا نام ''ہلچل'' رکھا گیا۔اس فلم کی ہدایت کاری اُنہوں نے خود نہیں کی۔وہ صرف پروڈیوسر بنے رہے۔اس کی ہدایت کاری کا ذمہ اُنہوں نے ایس۔کے۔آہوجہ کو سونپا۔اس فلم میں دلیپ کمار اور نرگس کو کاسٹ کیا گیا۔اس فلم سے اُن کی دوستی دلیپ کمار سے ہو گئی۔اس کی فلم بندی کے دوران دلیپ کمار اور نرگس میں ایسی ٹھن گئی کہ نرگس نے آئندہ کے لئے دلیپ کمار کے ساتھ کام نہ کرنے کی قسم کھالی۔فلم ''ہلچل'' 1951 میں ریلیز ہوئی۔

اسی دوران اُنہیں پھر سے ''مغل اعظم'' کو بنانے کا خیال آیا۔اس بار آصف نے ایک ارب پتی بلڈر شاپور جی پالن جی کو اس فلم میں سرمایہ لگانے پر آمادہ کر لیا۔اب اُن کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ چندر موہن کا انتقال ہو چکا تھا۔سپرو کی اب وہ اہمیت نہ رہ گئی تھی۔اس سے پہلے کہ وہ اس فلم پر پھر سے کام شروع کرتے اسی سبجیکٹ پر دو دو فلمیں شروع ہوئیں۔ایک ایم اینڈ ٹی اسٹوڈیو کے بینر تلے بن رہی تھی جس کے کہانی کار کمال امروہی تھے۔دراصل کمال امروہی کو یہ لگا

تھا کہ اب یہ فلم بننے والی نہیں ہے اسلئے اُس نے ''مغل اعظم'' کا اسکرپٹ اُن لوگوں کو دے دیا تھا۔اور دوسری فلم فلمستان اسٹوڈیو کی زیرِ نگرانی بن رہی تھی۔اُنہوں نے اس فلم کا نام ''انارکلی'' رکھا تھا جس کے لئے پردیپ کمار اور بینا رائے کو سائن کیا گیا جب کہ اس فلم کی ہدایت کاری کے لئے نندلال جسونت لال کو چنا گیا۔اس فلم کی موسیقی کا ذمہ اُس زمانے کے مقبول ترین میوزک ڈائرکٹر سی۔رام۔چندر کو سونپا گیا۔فلمستان والے تو فلم کی تیاریوں میں جٹ گئے جب کہ کے۔آصف نے کمال مروہی کو اپنی اسکرپٹ واپس لینے پر رضامند کرلیا۔ کمال امروہی کے۔آصف کی بیحد عزت کرتے تھے۔اُنہوں نے اُن کے حکم پر فوراً عمل کیا۔

آصف کے چند خیر خواہوں نے اُنہیں اس فلم میں ہاتھ ڈالنے سے منع کردیا پر وہ تو ٹھان کے بیٹھے تھے کہ بنائیں گے تو ''مغل اعظم'' ہی بنائیں گے اسلئے یار دوستوں اور خیر خواہوں کے منع کرنے کے باوجود اُنہوں نے اس فلم پر پھر سے کام شروع کردیا۔سب سے پہلے انہیں دلیپ کمار کو سلیم کے رول میں کاسٹ کرنے کا خیال آیا۔پہلے اُنہوں نے انارکلی کے رول کے لئے نرگس کو لینے کا ارادہ کیا مگر نرگس دلیپ کے ساتھ کام کرنے پر راضی نہ ہوئی۔اس انکار کے پیچھے کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ سب کچھ اُسنے راج کپور کے کہنے پر کیا۔ اُن دنوں اُن کا رومانس عروج پر تھا۔راج کپور کو یہ خدشہ تھا کہ کہیں نرگس دلیپ کمار کے قریب آکر اُس سے دور نہ چلی جائے۔نرگس کے انکار کے بعد آصف ہیروئن کی تلاش میں لگے رہے۔۔ادھر دلیپ سلیم کے رول میں اپنے آپ کو فٹ نہیں پا رہے تھے۔وہ عجب پریشانی کے عالم میں تھے۔اُنہوں نے ایک طرح سے آصف کو اس فلم میں کام کرنے سے معذوری ظاہر کی۔آصف اُنہیں یقین دلاتا رہا کہ وہ اس کردار کے لئے بالکل موزوں ہیں پھر بھی دلیپ تیار نہیں ہو پا رہے تھے۔پریشان ہو کے آصف نے دلیپ کمار کو لندن روانہ کیا جہاں پر اُن کے لئے نہ صرف سپیشل وگ تیار کی گئی بلکہ اُنہیں پورے شاہی ملبوسات کے ساتھ فوٹو شوٹ کیا گیا۔جب اُنہوں نے یہ سارے فوٹو گراف دیکھے تو اپنے آپ کو اس گیٹ اپ میں دیکھ کے وہ خود حیران رہ گئے۔وہ واقعی شہزادہ سلیم لگ رہے تھے۔اس طرح وہ اس تذبذب سے باہر نکل آئے۔

ہیروئن کا معاملہ ابھی تک سلجھ نہیں پایا تھا۔اُنہوں نے ہیروئن کو چھوڑ کے دیگر داکاروں کا انتخاب کرنا شروع کردیا۔پرتھوی راج کپور جنہوں نے اپنے تن وتوش اور گرجدار آواز سے ایک الگ پہچان بنالی تھی اُنہیں اکبر کے رول کے لئے چنا گیا جب کہ اجیت کو ترجن سنگھ،آصف کی تیسری بیوی نگار سلطان کو بہار کے رول کے لئے اور درگا کھوٹے کو جودھا بائی کے رول کے لئے سائن کیا گیا۔ درگا کھوٹے واحد اداکارہ تھی جسے آصف نے ابتدائی دور میں شہنشاہ اکبر کی ملکہ اور سلیم کی ماں کے رول کے لئے سائن کیا تھا۔ہیروئن کی تلاش ہنوز جاری تھی۔اسی بیچ 1951 میں رام دریانی کی فلم ''ترانہ'' جس میں دلیپ کمار اور مدھو بالا کی جوڑی نے غضب ڈھایا تھا اور اُسکے ایک سال بعد یعنی 1952 میں آر۔ سی۔تلوار کی ہدایت میں بننے والی فلم ''سنگدل'' میں اسی جوڑی نے فلمی شائقین کو دیوانہ بنا ڈالا تھا۔یہ دونوں فلمیں باکس آفس پر کامیابی کے جھنڈے گاڑ چکی تھیں۔سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے پیار میں گرفتار ہو چکے تھے۔آصف کی مشکل آسان ہوگئی تھی۔اُنہیں من پسند انارکلی مل چکی تھی۔وہ عشق ومحبت کے جس لطیف دور سے گزر رہے تھے اُسے اُنہوں نے پردہ سیمیں پر ہو بہو ادا کیا۔یہ دونوں ستارے اُس دور میں شہرت کی معراج پہ تھے۔اس فلم کو مکمل ہونے میں بیس سال لگے۔کہا جاتا ہے کہ پوری فلم مکمل کرنے کے لئے جو بجٹ آصف نے شاہ پور جی کو دیا تھا اُسمیں یہ فلم تین چار ریل سے زیادہ بن ہی نہ پائی۔میں اپنے قارئین کو یہ بتاتا چلوں کہ اُن دنوں اچھی سے اچھی فلم ایک سوا لاکھ میں بن کر تیار ہوتی تھی۔شاہ پور جی تو فلم کے مکمل ہونے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔جب اُنہیں معلوم پڑا کہ فلم تو ابھی تک آدھی بھی نہیں بن پائی ہے تو وہ گھبرا گئے۔پارسی آدمیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بڑے شانت سبھاؤ کے ہوتے ہیں مگر شاہ پور جی یہ خبر سن کر اپنا آپا کھو بیٹھے اور اُنہوں نے آصف کو فلم سے الگ کرنے کا فیصلہ کیا۔آصف بھی اڑیل آدمی تھے۔شاہ پور جی کے کچھ کہنے سننے سے پہلے ہی وہ گھر میں جا کر بیٹھ گئے۔شاہ پور جی نے بنی ہوئی چار ریل ڈیولپ کرا کے سہراب مودی، کمال امروہی اور کئی ایسے ایک دو ہدایت کاروں کو دکھائی جن کو اس طرح کی تاریخی فلمیں بنانے میں ید طولی حاصل تھا۔وہ چاہتے تھے کہ سہراب مودی یا کمال امروہی باقی کی فلم کو مکمل کرلیں۔جب ان لوگوں نے رشز دیکھے تو وہ دم بخود ہو کر رہ گئے۔اُنہوں نے شاہ پور جی کا ارادہ بھانپتے ہی اُنکے سامنے ہاتھ کھڑے کردئے اور اُنہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ آصف کو جیسے تیسے منالیں اور یہ فلم اُسی سے مکمل کروائیں۔یہ فلم کوئی اور بنا ہی نہیں سکتا۔شاہ پور جی کاروباری آدمی تھے۔وہ ایک لاکھ سے اوپر کی رقم اس فلم پر لگا چکے تھے۔اتنی بڑی رقم کو یونہی کیسے جانے دیتے۔مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اُنہوں نے آصف کو اپنے آفس میں بلایا اور لگے اُسکی خوشامد کرنے۔اُنہوں نے پہلے اُسے بڑے پیار سے ڈانٹا اور پھر بڑی سنجیدگی سے پوچھا کہ وہ یہ فلم کتنے پیسے میں مکمل کر پائیں گے۔آصف کے منہ سے بے ساختہ ایک کروڑ نکل گیا۔جب شاہ پور جی نے ایک کروڑ سنا تو وہ کرسی سے گرتے گرتے رہ گئے۔اُن دنوں کے ایک کروڑ کا مطلب تھا آج کا سو کروڑ۔اُنہوں نے مری ہوئی آواز میں آصف سے پوچھا۔اس رقم میں فلم پوری ہوگی نا۔تو آصف نے اب کے بڑے اعتماد سے کہا کہ ہاں پوری ہوگی۔

رقم کی منظوری کے ساتھ ہی فلم کی شوٹنگ پورے شدومد کے ساتھ شروع ہوگئی۔اسی بیچ ایک اور مصیبت نے دستک دی۔دلیپ کمار اور مدھو بالا کے تعلقات ایکدم کشیدہ ہوگئے۔اسکی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مدھو بالا کا والد عطا اللہ خان دلیپ کمار اور مدھو بالا کی نزدیکی سے خوش نہیں تھا۔مدھو بالا اُن کے لئے

سونے کے انڈے دینے والی مرغی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ مرغی کسی اور کا دڑبہ آباد کرے۔ مدھو بالا دلیپ پر زور ڈال رہی تھی کہ وہ اُسے دلہن بنا کر لے جائے۔ ستم تو تب ہوگیا جب مدھو بالا نے بی۔ آر۔ چوپڑہ کی فلم ''نیا دور'' میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ سب کچھ اُسنے باپ کے کہنے پر کیا تھا کیونکہ اس کا آؤٹ ڈور بمبئی سے باہر تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مدھو بالا دلیپ کمار کے اس قدر قریب رہے۔ عذر یہ پیش کیا گیا کہ وہ بیمار ہے۔ لوکیشن دور ہے۔ وہاں پر اُس کی طبیعت اور بگڑ سکتی ہے اسلئے مدھو بالا باہر نہیں جاسکتی۔ بی۔ آر۔ چوپڑہ مدھو بالا کی خاطر اپنی لوکیشن بدلنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اُنہوں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دلیپ دھرم سنکٹ میں پڑ گئے۔ اُنہیں عدالت میں مدھو بالا کے خلاف گواہی دینے کے لئے جانا پڑا جہاں اُنہوں نے سچ بول کر عطا اللہ خان سے دشمنی مول لی۔ اُسی عدالت میں اُنہوں نے ببانگ دہل یہ اعلان کر دیا کہ وہ مدھو بالا سے پیار کرتے ہیں اور مرتے دم تک اُس سے پیار کرتے رہیں گے۔ اسکے بعد حالات بیحد کشیدہ ہوگئے۔ مدھو بالا نے دلیپ سے کہا کہ وہ اُن کے والد کے پاس جا کر اُن سے معافی مانگ لیں۔ دلیپ بھی نسلاً پٹھان ہیں۔ وہ کسی بھی قیمت معافی مانگنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ دو پٹھانوں کی ضد کے آگے اُن کی محبت ہار گئی۔ دونوں ایک دوسرے سے بات کرنے کے روادار نہ رہے۔ بات کرنا تو دور وہ ایک دوسرے کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھتے تک نہ تھے۔ آصف اُن کے اس وطیرے سے کبھی کبھی جھلا کر اپنا سر پیٹنے لگتے تھے۔ وہ دونوں شوٹنگ میں آتے۔ اپنے اپنے شاٹ دیکر مخالف سمت میں نکل جاتے تھے۔ عطا اللہ خان اب سائے کی طرح بیٹی کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ آصف کافی پریشان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دونوں اپنی اپنی ضد کے پکے ہیں اور اُسے کسی بھی حال میں اس فلم کو جلد سے جلد مکمل کرنا پڑے گا۔ کہتے ہیں کہ جب مدھو بالا کا رومانٹک سین فلمانا تھا۔ وہ سین جس میں شہزادہ سلیم اُسکے چہرے پر پنکھ لہراتا ہے تو آصف نے اپنے خاص آدمی تارک ناتھ گاندھی سے کہا کہ وہ اس بوڑھے (عطا اللہ خان) کو تاش کی گیم میں تب تک اُلجھا کر رکھے جب تک وہ اس سین کو مکمل نہ کر سکیں۔ تارک ناتھ گاندھی نے ویسا ہی کیا۔

آصف کی کمزوری یہ تھی کہ وہ جھٹ سے کسی پر بھی اعتبار کیا کرتے تھے۔ پورا یونٹ راجستھان کے تپتے ہوئے ریگیستانوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ کوئی ایک بندہ آکر آصف سے سو ہاتھی اور گھوڑوں کا انتظام کرنے کے لئے ایک اچھی خاصی رقم لے کر گیا۔ یونٹ ہاتھیوں کی آس میں کئی دن تک بیٹھا رہا مگر اُس بندے نے پلٹ کے بھی نہیں دیکھا۔ جب یونٹ کے لوگ آصف کو یہ سمجھانے کی کوشش کرنے لگے کہ اُس بندے کی آس میں بیٹھے رہنا غلط ہے تو آصف کا جواب ہوتا کہ ارے وہ شریف بندہ کہیں پھنس گیا ہوگا۔ وہ ہاتھی گھوڑے لے کر ضرور آجائے گا۔ وہ نہیں آیا اور پروڈکشن والوں کو خود جا کر انتظام کرنا پڑا۔

ایک دن پتا چلا کہ مدھو بالا کی طبعیت بیحد خراب ہو چکی ہے۔ مدھو بالا کے گھر والے اُسکی بیماری پر پردہ ڈال کر بیٹھے رہتے تھے۔ اُسے کھانسی کے لمبے لمبے دورے پڑتے تھے۔ ایک بار ٹھسکا لگ جاتا تھا تو بہت دیر تک کھانسنے کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ اُسکے منہ سے خون آنے لگتا تھا۔ وہ انڈسٹری سے آوٹ نہ ہو جائے اس لئے اُسکا باپ اُسکی بیماری کو چھپا رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ اُسکا دل بڑھ چکا تھا اور ساتھ ہی دل میں ایک سوراخ بھی تھا جو جان لیوا ثابت ہوسکتا تھا۔ اُن دنوں اس بیماری کا علاج دستیاب نہ تھا۔ شوٹنگ ستر اسی پرسنٹ سے زیادہ مکمل ہو چکی تھی البتہ جیل کے سین ابھی شوٹ ہونا باقی تھے۔ یہ وہ سین تھے جہاں مدھو بالا کو زنجیروں میں جکڑ کے رہنا تھا۔ انہی زنجیروں کے ساتھ ''محبت کی جھوٹی کہانی پہ روئے'' والا گانا فلمانا باقی تھا۔ سب کی یہی رائے تھی کہ اُنہیں ڈپلیکیٹ کا استعمال کرنا چاہیے مگر مدھو بالا بضد تھی کہ وہ یہ سارے سین خود ہی ادا کرے گی۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ اُس کے دل میں سوراخ تھا۔ اُس لڑکی کی لگن اور جنون دیکھئے کہ اُسنے وہ سارے سین خود ادا کر کے فلم کو جاوداں کر دیا۔

''مغل اعظم'' کے بننے تک یہ جوڑی ایک دوسرے سے بہت دور چلی گئی تھی۔ یہ فلم 5 اگست 1960 کو ملک بھر میں ریلیز ہوگئی۔ اس کا پریمئر بمبئی کے مراٹھا مندر میں رکھا گیا تھا۔ اس فلم کا پرنٹ ہاتھی پر لاد کر سینما تک پہونچایا گیا۔ جب فلمی ہستیوں نے یہ فلم دیکھی تو بیشتر لوگوں نے اس فلم کو بورنگ کہا۔ جب یہ بات آصف تک پہونچی تو اُنہوں نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہ کیا۔ وہ اپنے فلم کے تئیں اتنے پراعتماد تھے جس کا ثبوت پبلک نے اس فلم کو دل سے سراہا کر دیا۔ اس فلم نے بزنس کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ فلمی تاریخ میں یہ چند بے مثال اور لاجواب فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔

اسی بیچ اُنہوں نے دلیپ کی چھوٹی بہن اختر خان سے چوتھا نکاح کیا تھا۔ اس پریم کہانی کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ اس پر ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اختر بی بی سے شادی کر کے اُن کے تعلقات دلیپ سے کافی کشیدہ ہو گئے۔ وہ تو آصف کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ آصف پر اسی دوراں جان لیوا حملہ بھی ہوگیا جس میں وہ بال بال بچ گئے۔ جب وہ موت کے منہ سے باہر نکل آئے تو اُنہوں نے ''محبت اور خدا'' پر کام کرنا شروع کر دیا۔ ایک بار پھر بدنصیبی نے اُن کے گھر میں دستک دی۔ فلم کا ہیرو گورودت کا انتقال ہوگیا۔ اُس نے محبت میں ناکام ہونے کے بعد نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کر لی تھی۔ آصف کا بُرا وقت پھر سے شروع ہوگیا۔ جتنا بھی سرمایہ تھا وہ فلم میں لگ چکا تھا۔ گھر میں فاقہ کشی کی نوبت آگئی۔ گھر میں دو دو شیر خوار بیٹیاں تھیں جو بھوک سے بلک رہی تھیں۔ اختر بی بی کا کہنا ہے کہ ایک دن وہ دونوں بیٹیوں کو آصف کے سامنے رکھ کر بولی کہ یا تو ان بچیوں کو مار ڈالئے یا ان کے لئے دودھ کا انتظام کیجئے۔ آصف نے اختر بی بی سے وعدہ کیا کہ وہ پیسے کا کچھ نہ کچھ انتظام کر لیں گے۔ شام کو وہ آئے تو اُنہوں نے اختر بی بی سے کہا کہ دس ہزار کا انتظام ہو چکا ہے۔ بی بی خوشی سے پھولے نہیں سمائی۔ اُس نے جھٹ پٹ گھر کے سامان کی ایک لسٹ تیار کی

اور وہ پہونچ گئی موہن اسٹوڈیو جہاں آصف کا دفتر تھا۔ جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر کی طرف جارہے تھے تو راستے میں ٹیکسی ایک جگہ رکی اور آصف ٹیکسی سے اُتر کر کسی شخص سے باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آکر ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور ٹیکسی اُنہیں گھر چھوڑ گئی۔ جب آصف نے کپڑے اُتارے اور وہ ہال میں جا کر بیٹھ گئے تو اختر بی بی پیسے کو ہاتھ میں لینے کے لئے اتنی اُتاولی ہوئی جارہی تھی کہ اُس نے آصف کی جیبیں کھنگالیں ۔ پیسہ تو ندارد تھا۔ وہ آصف کے پاس بھاگی اور پیسے کے بارے میں پوچھنے لگی۔ آصف نے نظریں چرا کر کہا کہ اُنہوں نے وہ پیسے اپنے چپراسی کو دے دئے۔ اُسکی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ اس جواب سے اختر بی برافروختہ ہوگئیں اور اُنہوں نے روتے ہوئے آصف سے کہا کہ اُنہیں چپراسی کی بیٹی کی شادی کا خیال رہا اپنی بچیوں کی بھوک کا خیال نہیں آیا۔ آصف کا جواب تھا کہ وہ مجھ سے نہیں مانگتا تو کس سے مانگتا۔

آصف صحیح معنوں میں فقیر آدمی تھا۔ کہتے ہیں کہ اُن کے گھر کے باہر ٹیکسیوں کی لائن لگی رہتی تھی۔ آصف جا کر کسی ٹیکسی میں بیٹھ جاتے تھے اور کرایہ چکائے بنا اُتر جاتے تھے۔ ٹیکسی والے بھی کبھی کرایہ نہیں مانگتے تھے۔ پھر ایک دن اچانک اُن کو خیال آجاتا تھا کہ ارے اُنہوں نے تو اس ٹیکسی والے کا کرایہ کتنے دن سے نہیں چکایا۔ اُن کا ہاتھ اپنی پتلون کی جیب میں جاتا تھا اور وہ بٹوہ نکال کر اُسمیں سارے کے سارے روپے ٹیکسی ڈرائیور کے سامنے گرادیتے تھے۔ یہ ٹیکسی والے کی قسمت پر منحصر ہوتا تھا کہ اُس وقت اُن کی جیب میں کتنے پیسے ہیں۔ وہ سخی بھی تھے اور ملنگ بھی۔ اُنہوں نے اپنی زندگی میں روپے پیسے کو ہاتھوں کا میل سمجھا۔ جب ''لوا ینڈ گاڈ'' کے فائنانس کی بات شاہ پور جی سے ہوئی تو شاہ پور جی نے پوچھا کہ وہ ضمانت کے طور پر کیا رکھ سکتے ہیں تو اُنہوں نے جھٹ سے شاہ پور جی کو ''مغلِ اعظم'' کے نیگیٹو رائٹس دے دئے۔ یعنی اُسنے پارس شاہ پور جی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ کمپنی آج تک اس فلم سے کمائی کر رہی ہے۔ کلر ورشن بنانے کے بعد اس کمپنی نے اُٹھتیس کروڑ کا منافع کمایا جو کہ ایک نئی فلم کی کمائی سے بھی زیادہ تھا۔

''لوا ینڈ گارڈ'' کے ادھورا رہ جانے کے بعد کے۔آصف نے راجندر کمار اور سائرہ بانو کو لے کر فلم ''سستا خون مہنگا پانی'' شروع کی۔ اس فلم میں سنجیو کمار ثانوی رول میں کاسٹ کیے گئے۔ ایک مرتبہ آوٹ ڈور شوٹنگ کا شیڈول ملتوی ہوا جس کی اطلاع آصف نے سنجیو کمار کو دی تو وہ بہت اُداس ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد آصف بار بار سنجیو کمار کو شوٹنگ پر بلاتے اور یہ کہہ کر لوٹا دیتے کہ شوٹنگ کینسل ہوگئی ہے۔ آصف کے اس عمل کو دیکھ کر اُن کی بیگم نے کہا کہ یہ لڑکا آپ کی اتنی عزت کرتا ہے اور اسے آپ کے ساتھ کام کرنے کا کس قدر شوق ہے اس کے باوجود آپ اس کے ساتھ یہ زیادتی کیوں کر رہے ہیں؟ جواب میں آصف نے بیگم کو یہ کہہ کر خاموش کرادیا کہ میں اپنے کام میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔ کئی مرتبہ کے انکار کے بعد آصف نے ایک دن سنجیو کمار کو اپنے آفس میں بلا کر دریافت کیا کہ میری فلم ''لوا ینڈ گارڈ'' میں ہیرو کا کردار ادا کرو گے؟

مارے خوشی کے سنجیو کمار کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مسئلہ درپیش سنجیو کمار کے زیادہ وزن کا تھا۔ سنجیو کمار کو لے کر آصف اپنے ڈاکٹر کے پاس گئے اور اُس سے دریافت کیا کہ اس کا وزن کتنے دنوں میں کم کر سکتے ہو؟ جواب میں ڈاکٹر نے کہا اگر چوبیس گھنٹے میری نگرانی میں رہے تو آٹھ دن میں خاصا فرق پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا آصف نے سنجیو کمار کو آٹھ دن کے لیے ڈاکٹر کی نگرانی میں دے دیا۔ پورے آٹھ دن بعد جب آصف ڈاکٹر کے پاس گئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سنجیو کمار خاصا سلم اور اسمارٹ ہوگیا ہے۔ وہ سنجیو کمار کو لے کر سیدھے اسٹوڈیو گئے اور سنجیو کمار کا گیٹ اپ کرا کر کئی اسٹل فوٹو گراف بنوائے اور فوٹو گراف پر نقاب ڈال کر گھر لائے۔ فوٹو گراف سے نقاب سرکا کر جب آصف نے بیگم کو سنجیو کمار کی آنکھیں دکھلائیں تو بے ساختہ اُن کے منہ سے نکلا ''ہائے اللہ یہ تو اپنا قیس ہے''۔ تب آصف نے بیگم کو بتلایا کہ جس دن پہلی بار میں نے سنجیو کمار کو شوٹنگ کینسل ہونے کی اطلاع دی تو اُس کی آنکھوں میں مجھے قیس کی آنکھوں کی جھلک نظر آئی۔ میں اپنے شک کو یقین میں بدلتا دیکھنا چاہتا تھا لہٰذا بار بار اُسے مایوس کر کے یہ چیک کر رہا تھا کہ میں غلطی پر تو نہیں۔

ناموافق حالات کے باعث ''سستا خون مہنگا پانی'' تو نہ بن سکی البتہ اُس کے بعد پھر سے آصف نے فلم ''لوا ینڈ گارڈ'' بنانے کا اعلان کردیا۔ اس ایک واقعہ سے آپ آصف کے خلاق ذہن کی اڑان کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

آصف نے ''لوا ینڈ گاڈ'' پر پھر سے کام شروع کردیا۔ گورودت کی جگہ سنجیو کمار کو لے لیا۔ فلم کی شوٹنگ شدومد سے شروع ہوگئی۔ فلم آدھی سے زیادہ بن چکی تھی کہ وہ خود ہی چل بسے اور اپنے پیچھے ایک بیوہ اور دو چھوٹی چھوٹی بچیاں چھوڑ کر چلے گئے۔ اُن کی موت بھی پراسرار حالات میں ہوئی۔ موت سے چند سال قبل دلیپ کے ساتھ تعلقات قدرے نارمل ہوگئے تھے۔ وہ اب اُن کے گھر آیا جایا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ 48 پالی ہل میں وہ آئے۔ ایک بھکاری دروازے پر کھڑا تھا۔ اُس نے آصف کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ اُن کی جیب میں اُسوقت پچاس روپے تھے۔ اُنہوں نے پچاس روپے بھکاری کی طرف بڑھا کر کہا کہ کہ وہ پینتالیس روپے رکھ لے اور اُسے سگریٹ خریدنے کے لئے پانچ روپے دے دے۔ پانچ روپے لے کر وہ سنجیو کمار سے ملنے چلے گئے جو کہ پالی ہل میں ہی رہتا تھا۔ ایک گھنٹے بعد یہ خبر آئی کہ آصف کا ہارٹ اٹیک ہونے سے موت ہوگئی۔

''لوا ینڈ گارڈ'' ادھوری رہ گئی۔ اُس فلم کو بعد میں اُن کی بیوہ اختر بی بی نے کے۔سی۔ بوکاڈیا کے مالی اشتراک سے مکمل کرلیا۔ اُن کی زندگی ایک فلم کے اسکرپٹ کی طرح بڑی ہی تہہ دار اور ڈرامے سے بھرپور ہے۔ مالک نے چاہا تو میں آصف اور اختر بی بی کی زندگی پر ایک پوری کتاب لکھوں گا۔

''ورثہ''

''ہمارے دردصوفی ہیں''

شاعر: بخشن مہرانوی ○ مترجم: جہانگیرعباسی (لاڑکانہ)

○

ہمارے درد صوفی ہیں،
ہمارے درد صوفی ہیں!
آنکھوں میں لیے آنسوؤں کی بوندیں
تن پہ اوڑھے جوگیوں کے لباس
تہہ مٹی کی اڑاتے ہوئے
ان چھوٹے راستوں پہ
دلوں کے دیپ جلاتے ہیں
اپنے من کو اُجارتے ہیں
ہمارے دردصوفی ہیں
جدائی کے لمحوں میں جب آنکھوں سے
راتوں کو آنسو بہتے ہیں
ساز لے کے تب ہاتھوں میں
گپ اندھیارے سے کسی موڑ پہ
اپنے اندر کی آگ جلاتے ہیں
مدہوش حال میں خود کو پاکر
اُسی کے ہم کہلاتے ہیں
یہ دل جو دریا کی مانند ہے
اسی میں تیرتے ، گنگناتے ہیں
ہمارے درد صوفی ہیں۔
ہاں! ہمارے درد صوفی ہیں
تمہارے قہر کوفی ہیں

وقت یزیدی بیری ہے
یہ تاریخ خود میلی ہے
مگر پھر بھی میرے پیارے
گدائی میں ہی امیری ہے
جاناں سے جڑا محبت کا دھاگہ
سارا سنسار سرکائے جا رہا ہے
سسّی بن کر تب یہ سانس
پہاڑی راستہ دھکیلا جا رہا ہے
ہم ہیں پلکوں کے پروانے
تیری آنکھوں کے دیوانے
تیری اک دیدِ دیا خاطر
بنے ہیں مست الست مستانے
جب سے دل کو کھولا ہے
بس! تم ہی کو پایہ ہے
بے زر وجود خاکی کو
فقط! ہر لمحے تیر ی ہی تمنا
رلاتے ہیں جنگل ویرانے
اور اسی جدائی میں
کئی دیپک راگ الاپے ہیں
زخم ساقی بن کے ہمارے
لے آتے ہیں آنکھوں کے پیمانے
پھر تیرے جام کی اے جان جاں!

جب صدا سی سنتے ہیں
تب پیتے اور پلاتے ہیں
ہمارے درد صوفی ہیں۔
ہاں! ہمارے درد صوفی ہیں
محبوب کے دامن میں
عشق بھی عجب کھیل ہے
مگر یہ بازی ہماری ہے ہماری
ارے او قاضی! ہاں ہماری ہے
سن او محبت کے منکر
کیا کر لوگے اب اس قبیلے کو
یہ سارا قبیلہ تیری بزرگی شریعت سے
پہلے سے روٹھا ہوا ہے
سولی پہ لٹکا ہوا ہے
ہم ازل سے پیار کے متلاشی
اسی درد میں ایسے جیسے کوئی داسی
صدا سجدوں اور سلامی میں
ہم ہیں حلقۂ بگوش غلامی میں
اور اسی کے کہلاتے ہیں
تب ہی تو اس قدر اِتراتے ہیں
ہمارے درد صوفی ہیں۔
ہاں! ہمارے درد صوفی ہیں۔

☆

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید (راولپنڈی)

برادرِ گرامی گلزار جاوید، تسلیمات۔

میرا تعلق اس دور اور عہد سے ہے جہاں کتاب کا ہاتھ میں ہونا ''رومانس'' ہوتا ہے۔ چہارسو انٹرنیٹ پر دیکھا لیکن فارسی کا ایک شعر ہے جس کا مطلب کچھ یوں ہے ''تم نے مجھے شراب دی، ہاتھوں نے چھوا، آنکھوں نے دیکھا، ناک نے سونگھا، زبان نے ذائقہ لیا، ظالم منہ سے بھی کہو یہ شراب ہے تاکہ کان بھی سن سکیں''۔

آپ نے فرمایا چہارسو ارجنٹ میل سے بھجوا دیئے ہیں وہ پانچ مارچ کو لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پہنچے اور پھر تیرہ دن وہیں اٹکے رہے خیال ہے کہ وہاں کے اسٹاف میں جو اُردو کی شُد بُد رکھتے تھے اُنہوں نے چہارسو پڑھنا شروع کیا شاید بچّے کر کے یا پھر زبانی یاد کیا ہوگا۔ تیرہ دن بعد خبر ملی کہ وہاں سے چل دیئے ہیں۔ نیویارک کے شہر البنی میں جہاں ہم رہتے ہیں وہاں برف کا شدید طوفان تھا اُس میں ایک شخص برف سے لدا رسالوں کا بنڈل لایا۔ ان دنوں یہاں خزاں کا موسم ہے اور ''چہارسو'' بہار بن کر آیا۔ آپ کا عرصے سے اصرار تھا کہ میرے اور نیلوفر کے بارے میں چہارسو کا ایک شمارہ نکالیں اور میں مسلسل ٹال رہا تھا کیوں کہ میں جشن اور کسی جریدے کے اپنے بارے میں خصوصی نمبر کا قائل نہیں لیکن آپ کے اصرار کے آگے میں ہار گیا اور یہ بہت اچھا ہوا۔ اب چہارسو کا شمارہ ہاتھ میں آیا تو احساس ہوا آپ نے بڑا کرم کیا میرے ماضی کو حال میں زندہ کر دیا کتنی یادیں کتنی باتیں کتنے لوگ اور وہ سارے موسم جو کسی پرانے البم کی طرح الماری میں بند تھے مہکنے لگے۔ مجھے ''چہارسو'' کی اس اشاعت سے بیتے ہوئے سارے پل، لمحے اور گھڑیاں اور دن یاد آ گئے۔ برستی بارشوں کے جلترنگ پگ پگ بہار کے شوخ رنگ شاخ شاخ پر شگوفے تیز سنہری دھوپ اور میں، یہ سب منظر سامنے آ گئے۔ آپ نے یہ کمال کر دیا کہ اُن سارے لوگوں کو یکجا کر دیا جو میرے مہربان شفیق محبت کرنے والے ہیں جو مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ میرے بارے میں لفظوں کو چنتے ہیں اور گلدستے کی طرح مجھے تحفے میں دیتے ہیں، ان میں کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو مٹی اوڑھ کر سو گئے ہیں لیکن وہ چہارسو میں سانس لینے لگے ہیں۔ آپ گلزار ہیں اور آپ نے میری زندگی کے سارے گل ''زار'' کر دیئے ہیں میں ان صفحات کو بار بار دیکھتا ہوں۔ سو بار دیکھتا ہوں اور ہر بار یوں محسوس ہوتا ہے ان میں نئے نئے تازہ پھولوں کی خوشبو پھیلتی جاتی ہے اور شوخ رنگ اپنی بہار دکھاتے جاتے ہیں۔ آپ یقین کریں چہارسو کا یہ خاص نمبر میرے ماضی کا البم ہے جو میری زندگی کی بہت سی بہاروں کا عکس ہے۔ اس لیے اس بار میرے شہر البنی میں کم سے کم میرے گھر میں خزاں نہیں آئی کیونکہ میں جب بھی آتشدان کے پاس مہکتی کافی کا کپ لے کر اس کو پڑھوں گا تو اُسی دنیا میں اُتر جاؤں گا جو میری نوجوانی کے سنہرے دن تھے۔

قمر علی عباسی (نیویارک)

محترمی و مکرمی گلزار جاوید صاحب، آداب۔

خوشی ایسا جذبہ ہے کہ جو دل کے نہاں خانوں سے نکل کر پورے وجود کو سرشار کر جاتا ہے، ایسی ہی سرشاری کی کیفیت میرے ''چہارسو'' طاری ہوئی کہ جب مارچ اپریل کا چہارسو موصول ہوا۔ گلزار صاحب آپ نے جس محبت اور خلوص سے اس شمارے کو میرے اور قمر علی عباسی کے نام موسوم کیا ہے اس پر میں آپ کی تہہ دل سے ممنون ہوں۔ ادب کی ایک ادنیٰ قاری کی حیثیت سے میں نے کبھی نہیں تصور کیا تھا میں اس اعزاز کے لیے چُنی جاؤں گی، یہ آپ کی اور ادارے کے دیگر ارکان کی فراخ دلی، وسیع النظری اور ذرّہ نوازی ہے۔

اپنے گھر کراچی پاکستان سے بے گھر ہوئے تو چیزیں بٹ گئیں، بکھر گئیں کتابیں، رسالے مضامین اخباروں کے تراشے، انٹرویوز، آپ نے بہت سی بکھری یادوں کو ترتیب سے سلیقے سے سمیٹ کر ایک یادگار دستاویز بنا دیا اس کے لیے کتنا شکریہ؟؟ ڈاکٹر فیروز عالم کا خط پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ''عید کا جوڑا'' اور نیلوفر علیم کو اپنی اتنی مصروفیات میں ذہن سے محو نہیں ہونے دیا۔ عنایت۔ ''چہارسو'' کا معیار حسبِ سابق حسبِ معمول اعلیٰ، دلربا، دلپذیر تحریروں کا گلدستہ ہے۔ اللہ کرے اس کی مہک چہارسو اسی طرح پھیلتی رہے۔

نیلوفر علیم عباسی (نیویارک)

برادرم گلزار جاوید، تسلیم۔

''چہارسو'' باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ معاصر ادیبوں کے لیے قرطاسِ اعزاز کا سلسلہ جو آپ نے شروع کیا تھا وہ قابلِ قدر بھی اور قابلِ توجہ بھی۔ اس کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ آپ اس کارِ خیر کا صلہ بصورتِ نقدی وصول نہیں کرتے حالانکہ ہندوستان کے ایک رسالے کے مدیر نے آپ کی نقل میں یہ سلسلہ شروع کر کے کاروبار بنا رکھا ہے۔ اگر آپ یہ کام پیسے لے کر کرتے تو میری طرح کے لوگ کبھی بھی ''قرطاسِ اعزاز'' کے حقدار نہ ٹھہرتے۔

اب سنیے میرا حال۔۔۔ تین ماہ قبل فالج حملہ آور ہوا جس سے زبان اور ٹانگیں متاثر ہوئیں۔ اب خاصا بہتر ہوں مگر خانہ نشین ہو چکا ہوں۔ یہ جو خوش خطی آپ دیکھ رہے ہیں اسی کا سبب ہے۔ PARKINSON کی وجہ سے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہو چکا ہے۔ اس حالت میں برادرِ محترم نند کشور وکرم کا ''ہم زباں چپ ہو گئے'' پڑھ کر بے حد دُکھ ہوا۔ میں ۱۹۸۸ء میں پہلی مرتبہ دہلی گیا تو وکرم صاحب (جن سے سفرِ دہلی سے قبل مراسلت کا آغاز ہو چکا تھا) دیوندر اِسّر کے ساتھ ملنے آئے۔ میں اِسّر صاحب کی تحریروں کا مطالعہ کر چکا تھا

جبکہ اپنی دلچسپی کی وجہ سے ان کی معروف تالیف ''ادب اور نفسیات'' خرید چکا تھا۔ ہم تینوں نے پورا دن ساتھ گزارا، ڈھیر ساری باتیں ہوئیں، ادبی بحثیں، معاصرین پر تبصرے (تبرّے نہیں) میں نے اِسّر صاحب کو ایک بُردبار، ہمدرد اور خلیق انسان پایا۔ میں طبعاً باتونی نہیں اِسّر صاحب بھی ہمیشہ گفتگو کرنے والے نہ تھے مگر ہم دونوں نے خوب باتیں کیں۔ وکرم صاحب اس کے بعد بھی اپنے اسکوٹر پر مجھے مشہور برلا مندر دکھانے لے گئے جب میں نے اِسّر صاحب کو بتایا کہ اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے ''نفسیاتی تنقید'' میں ان کا بطور نفسیاتی نقاد ذکر کیا ہے تو بہت خوش ہوئے۔ وکرم صاحب نے مضمون میں میرا جو اقتباس درج کیا ہے وہ ''نفسیاتی تنقید'' ہی سے لیا گیا ہے۔

نند کشور وکرم نے دکھ کے اُسلوب میں مضمون تحریر کیا ہے جو پڑھنے والے کو دکھی کر دیتا ہے۔ دانشور، ماہرِ نفسیات، فکشن رائٹر اور ان سب پر مستزاد ایک بے حد اچھا انسان جس کے اپنے اہلِ خانہ اُس کی جان کے دشمن بن گئے۔ چلیں کسی نہ کسی سبب بیوی تو جان کی دشمن ہو سکتی ہے مگر اولاد کا اس قدر ظالم ہونا ناقابلِ یقین لگتا ہے۔ اہلِ علم اُن کے فن سے دلچسپی تو رکھتے ہیں مگر اُنہیں اس کا اندازہ نہیں ہوتا کے فن کار دُکھ کے کولہو میں کس طرح نچڑتا ہے۔ دُکھ بھی ناقابلِ برداشت جو اپنوں کے ہاتھوں ملتے ہیں۔

میں جب راولپنڈی کے گورنمنٹ کالج اصغر مال میں پڑھتا تھا تو فلموں کا بہت رسیا تھا، ہر نئی فلم کا پہلا شو دیکھنا لازم تھا۔ اگرچہ اب دلچسپیاں اور نوعیت کی ہیں مگر فلموں کے بارے میں مطالعہ اور معلومات حاصل کرنے کا شوق اب بھی برقرار ہے اس لیے میں جناب دیپک کنول کے مضامین بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ اس بہانے ماضی کی مرحوم فلمی شخصیات سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ تازہ شمارے میں جہاں قمر علی عباسی اور نیلوفر عباسی کے بارے دلچسپ معلومات پڑھنے کو ملیں وہیں عظیم گلوکار کے۔ ایل۔ سہگل کے بارے میں دیپک صاحب کا مضمون پُر از معلومات بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ غالباً دیپک صاحب فلمی شخصیات پر کتاب قلم بند کر رہے ہیں جس کے ابواب چہارسو میں شائع ہو رہے ہیں۔ میری خواہش بلکہ فرمائش ہے کہ وہ اپنے دور کے نامور میوزک ڈائریکٹر ایس۔ ڈی۔ برمن پر بھی خوبصورت مضمون تحریر کریں۔ برمن دا کا شمار اُن موسیقاروں میں ہوتا تھا جن کے کمپوز کیے گئے نغمے آج بھی سُنے اور گنگنائے جاتے ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ برمن دا کسی چھوٹی سی ریاست کے مالک بن سکتے تھے مگر انہوں نے ریاستِ موسیقی کو ترجیح دی۔ واہ گلزار جاوید شاباش:

Keep up the Good Work

ڈاکٹر سلیم اختر (لاہور)

جناب محترم گلزار جاوید سلام وتسلیمات

''چہارسو'' کی تازہ اشاعت مبارک ہو۔ عبداللہ جاوید بھی آپ کو سلام اور مبارکباد بھیج رہے ہیں۔ ہمارے بعد قرطاسِ اعزاز (گوشے میں) ایک مرتبہ پھر رفقائے حیات اکھٹے ہو گئے ہیں۔ شہزوری نیلوفر عباسی کو ٹی وی اسکرین پر دیکھا تھا۔ ٹورانٹو میں تسلیم الٰہی زلفی کے دولت خانے میں جاوید نے ''پتی ورتا استری'' کے روپ میں دیکھا تھا۔ گھر آ کر مجھے بتایا۔ ہم دونوں دیر تک ان کی باتیں کرتے رہے تھے۔ قمر علی عباسی سیاح قلمکار کے طور پر اردو ادب کی تاریخ میں اپنا ممتاز مقام بنا چکے ہیں۔ دونوں (میاں بیوی) کو قدرت نے شہرت اور قبولِ عام سے نوازا ہے۔ حق بحقدار رسید کے بطور۔ پرچے کی اشاعت پر بارِ دیگر مبارکباد آپ کی اور آپ کے رفقائے کار کی خدمت میں۔

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

عزیزم گلزار جاوید! سلامت رہو۔

اس بار چہارسو میں آپ نے پنجابی کے محاورے ''چوپڑی نالے دو دو'' والی کیفیت پیدا کر دی۔ بلاشبہ قمر علی عباسی عمیق مشاہدے کے حامل ایسے قلمکار ہیں جن کو بار بار پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ میری بدقسمتی یا کم علمی میں اس سے قبل عباسی صاحب کے نام اور کام سے قطعی غافل تھا البتہ اُن کی بیگم صاحبہ کو پاکستان ٹیلی ویژن کے ابتدائی دنوں کے ڈراموں کے حوالے سے بخوبی پہچانتا ہوں۔ ہر چند نیلوفر صاحبہ کی اصل شناخت اداکاری وصداکاری ہے مگر اُن کی تحریر پڑھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اُنہوں نے اس دشت کی سیاحی میں تازہ تازہ قدم رکھا ہے۔ شعری حصہ کافی وقیع ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد کی غزل میرے خیال میں اس بار سرِ فہرست رہی ہے کم از کم میں ابھی تک اُس کے سحر میں گرفتار ہوں۔ افسانوں میں سعید نقوی، نیلم احمد بشیر، شاہد جمیل کے ساتھ رینو بہل نے عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ آپ کا قلم جس طور بے باک ہوا جاتا ہے اُسے دیکھ کر خوف آنے لگا ہے۔ میں یہاں آپ کو زورِ قلم زیادہ کے بجائے ہوشِ قلم زیادہ کی دُعا دینا چاہوں گا۔ بہرحال آپ کے نت نئے خیالات اور کاٹ دار جملوں کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ ڈاکٹر فیروز عالم اُسی روانی اور سلاست کے ساتھ قاری کو جکڑے ہوئے ہیں جس کا آغاز اُنہوں نے پہلی قسط میں کیا تھا۔ دیپک کنول بھی بھرپور طریقے پر قاری کو دلچسپی فراہم کر رہے ہیں۔ اس بار نند کشور وکرم نے اِسّر صاحب کے آخری ایام کی روداد اور اُن کی المناک وفات کی خبر دے کر ملول کر دیا۔ کیا آج کی دنیا مہذب کہلانے کی مستحق ہے؟ جس میں اپنی شریکِ حیات اور اپنی ہی اولاد تھوڑے سے مادّی مفاد کی خاطر جلاّد سے بھی بدتر روپ اختیار کر لیں۔

یوگیندر بہل تشنہ (یو۔ایس۔اے)

محترمی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو کے شمارے نومبر دسمبر ۲۰۱۲ء میں باقر مہدی کے بارے میں ترتیب دیا گیا گوشہ دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ عذرا اصغر صاحبہ کا افسانہ اُن کی فنی پختگی کا ترجمان ہے۔ ایک صدی کا قصّہ کے عنوان کے تحت گورودت کے بارے میں شامل تحریر اُن کی زندگی پر سے پردہ اٹھاتی ہے اور بہ حیثیت اداکار اور ہدایت کار اُن کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرتی ہے۔ ''ورثہ'' کے عنوان کے تحت شامل

کیا گیا سید ضمیر جعفری مرحوم کا ظریفانہ کلام اُن کے مخصوص لب و لہجے کا آئینہ دار ہے۔ وہ طنزیہ مزاحیہ شاعری کے فنّی رموز سے بخوبی آگاہ تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی طنزیہ مزاحیہ شاعری آج بھی تروتازہ محسوس ہوتی ہے۔ ''رس رابطے'' میں شامل اہلِ قلم کے خطوط کسی نہ کسی زاویے سے عام قاری کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ قارئین کے خطوط کی عدم موجودگی کی صورت میں کوئی بھی ادبی مجلّہ بے پتوار کشتی کے مانند دکھائی دینے لگتا ہے۔

چہارسو کے شمارے جنوری فروری ۲۰۱۳ء میں شامل افسانہ No Choice قابلِ توجہ ہے۔ اس افسانے کے ذریعے ملکی حالات کا افسانوی پیرایے میں تذکرہ ہوا ہے۔ نیز وطنِ عزیز کے مختلف شہروں میں رونما ہونے والے بعض حادثات و واقعات کا اشارۃً ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس افسانے میں ہمارے معاشرے کے تضادات، دہرے معیاروں، منافرتوں، ریاکاریوں، بدعنوانیوں، ناانصافیوں کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے اور استحصالی ہتھکنڈوں کی طرف اشارے بھی کیے گئے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ معاشی و اقتصادی عدم مساوات کے زائیدہ مسائل کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ مجموعی طور یہ طویل افسانہ ان تمام حالات و واقعات کی عکاسی کرتا ہے جن سے ہم سب اس وقت دوچار ہیں۔

سلیم آغا قزلباش (سرگودھا)

محترم گلزار جاوید، تسلیمات۔

پہلے تو آپ کا بہت بہت شکریہ کہ ''چہارسو'' برابر موصول ہو رہا ہے۔ اس بار وراث علوی پر قرطاسِ اعزاز بہت شاندار تھا۔ وارث علوی صاحبِ علم آدمی ہیں اور افسانے کی تنقید میں انہوں نے اپنے لیے بڑا انفرادی انداز پیدا کیا ہے۔ آپ کے اس شمارے میں ان کے بارے میں بہت اچھا مواد پڑھنے کو ملا۔ میں نے وہ شمارہ دبئی میں موجود ایک خاتون محترمہ شکیلہ رحمٰن کو روانہ کر دیا تھا جو وارث علوی صاحب کی نہایت زبردست فین ہیں اور ان کے ساتھ قریبی رابطہ رکھتی ہیں۔ انہیں بھی وہ شمارہ بہت پسند آیا۔

نجم الحسن رضوی (کراچی)

پیارے گلزار جاوید، سلامت رہیں۔

چہارسو شمارہ مارچ اپریل سامانِ ''چشم ما روشن دل ما شاد'' لے کر وارد ہوا میں تادیر اسی میں کھویا رہا۔ ہر تخلیق کو میں نے تہہ میں اُتر کر دیکھا۔ اب تہہ داریوں سے کون ابھرے۔ باخاطر شاد ڈوبا ہوا ہوں۔ صفحے صفحے پر تہہ داریوں کے جلوے ہیں کہ دیکھو تو دیکھتے رہو۔ ''چہارسو'' میں بہت سی تحریریں دامنِ دل کھینچنے والی ہیں۔ آپ کی حسن فرمائیاں اپنی گرویدگی میں کمال کی ہیں۔ ان کی کشش بھی ہے جو اپنا بنائے رکھتی ہے۔ قرطاسِ اعزازِ افضل اسی طرح کا ہے جس طرح کا ہوتا ہے۔ اب کے قمر علی عباسی اور نیلوفر عباسی کی ادبی اور شخصی روشنائی سے تحریریں لکھی گئی ہیں۔ سب تو نہیں پڑھیں لیکن جو پڑھی ہیں ان کے اثرات سے میری لوڈ شیڈنگ سے ماری ہوئی شاموں میں روشنی ہے۔ نشانِ راہ ''ہم زباں چپ ہو گئے'' نے مجھے تو از حد دل گرفتہ کر دیا۔ نند کشور وکرم نے دیوند اِسّر کے اخیر دم کو ایسے دردناک لہجے اور پیرائے میں لکھا ہے کہ میں بہت غمگین ہو گیا۔ آپ جانیں دیوندر اسر میرے پسندیدہ ادیب تھے۔ میں نے ان کو بارہا پڑھا ہے۔ دیکھا نہیں البتہ کان ضرور گنہگار ہیں۔ میں انہیں ''سدرشن'' کے ساتھ ملا کر پڑھتا تھا۔ اس قرینے سے کرشن چندر کا جادو چل نکلتا تھا۔ دیوندر اسّر کا ''اخیر دم'' جیسے ہوا ہے اس سے دل بہت دکھتا ہے۔ کے۔ ایل۔ سہگل کے گانے امر ہیں۔ پرانے وقتوں میں گھر کے بڑے ریڈیو پر خاص طور پر سہگل کے گانے سنتے تھے۔ اس کی آواز کا سوز و گداز محسوسات کے تاروں سے کھیلتا تھا۔ اے کاشِ تقدیر، غم دیئے مستقل، جھولنا جھلا۔۔۔ کون بھول سکتا ہے۔ نئی نسل کے لوگ اس سے واقف نہیں۔ ہوں گے بھی نہیں۔ نوید سروش نے عجب مگر پیار بھرے انداز میں میری غزل کو لیا ہے۔ وہ تعریف کا یہی ''مزاج'' رکھتے ہیں۔ یہی ان کی پہچان ہے۔

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چند روز قبل ''چہارسو'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا، شکریہ۔ اس بار قمر علی عباسی اور نیلوفر عباسی پر بالترتیب قرطاسِ اعزازِ افضل و قرطاسِ اعزازِ اعلیٰ دیکھ کر مسرت ہوئی اور ان دونوں کے بارے میں بہت کچھ جان کر میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ قمر علی عباسی کے کالم تو ہمیشہ ہی ''جنگ'' میں میری دلچسپی کا باعث رہے ہیں پھر ''براہِ راست'' میں دیئے گئے جوابات نے میرے دل میں ان کی قدر کچھ اور بڑھا دی حتیٰ یہ کہ اپنے آباواجداد کے بارے میں کچھ بتاتے ہوئے انہوں نے جس کسرِ نفسی سے کام لیا اس کا جواب نہیں۔ اے۔ پی۔ این۔ ایس کا ایوارڈ یافتہ کالم ''بھاوج کا تحفہ'' بھی ان کی ایک ایسی تخلیق تھی جس نے مجھے بہت متاثر کیا اگر ایک طرف یہ تحریر اُن کے لکھنے کے منفرد انداز سے ہمیں متعارف کرواتی ہے تو دوسری جانب ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جنہیں بات کہنے کا ڈھنگ آتا ہے وہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی وہ سب کہہ جاتے ہیں کہ پڑھ کر دل پر تیر نہیں نیزہ لگے اور آر پار ہو جائے۔ سفرنامے بھی اُن کے عجیب ہوا کرتے تھے اور اس سلسلے میں آغا ناصر کی رائے سے متفق ہوں۔ اب آیئے محترمہ نیلوفر عباسی کی جانب جو واقعی اپنے شوہر کے ساتھ اس اعزاز کی برابر کی حقدار ہیں۔ بھلا شہزوری میں ان کی بے ساختہ اداکاری کو کون بھلا سکتا ہے۔ اُن کے کھاتے میں اُن کی فطری اداکاری کے علاوہ اُن کی شستہ زبان سے لکھی ہوئی تحریریں بھی اُن میں موجود تہذیب و شائستگی کی غماز رہی ہیں۔ ''گئے دنوں کا سراغ'' اُن کی ایسی ہی صلاحیت کا ثبوت ہے۔

مرحوم معین اختر کا ذکر انہوں نے جس احترام کے ساتھ کیا ہے اُس نے مجھے آج سے نو سال پیشتر کا ایک دن یاد دلا دیا ہے۔ میرا اکلوتا بیٹا اُن دنوں ایک حادثے کا شکار ہو کر مشہور سرجن محمد علی شاہ کے ہسپتال A.D کلینک میں

داخل تھا کہ شام کو تاجدار عادل (سابق ٹی۔وی پروڈیوسر) نے اپنے ایک ادبی پروگرام کے لیے فون کیا ساتھ ہی یہ بھی اطلاع دی کہ معین اختر اُن کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے اُن کے ذریعے انہیں سلام بھجوایا تو مجھ سے براہِ راست مخاطب ہوگئے اور میری پریشانی جان کر صرف اتنا کہا کہ ڈاکٹر محمد علی شاہ کو میں اُن کا نام بتادوں تو شاید زیادہ دلچسپی سے میرے بیٹے کی نگہداشت کریں۔ بات آئی گئی ہوگئی لیکن اُن سے ملنے کی تمنا پھر حسرت میں بدل گئی۔ کہاں ہیں اب ایسے لوگ جن کے بارے میں شاعر نے کہا تھا:

اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

غالب عرفان (کراچی)

برادرم عزیز گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

اس بار قرطاسِ اعزاز میں ہم نے دو مزے لیے یعنی قمر علی عباسی اور نیلوفر عباسی کے انٹرویو پڑھے۔ دونوں میاں بیوی Talented ہیں ''میں بہت بُری آدمی ہوں'' والا نیلوفر کا ڈرامہ ہمیں اب تک یاد ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ قمر علی عباسی نے اتنے سفرنامے لکھے لیکن ہم ایک نہیں پڑھ سکے لیکن لوگوں کے مضامین سے اندازہ ہوا کہ وہ غصب کے سفرنامہ نگار ہیں۔

غزلیں، نظمیں خوب ہیں، افسانے سب ہی اچھے ہیں۔ گلزار جاوید کا ''جانِ آرزو'' خوبصورت ہے اور صورتحال کا عکاس۔ اس میں طنز بھی چھپا ہوا ہے۔ فیروز عالم کی خودنوشت کا جواب نہیں، وہ کوئی چیز چھپاتے نہیں۔ افسوس ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ انہوں نے پچھلی قسط میں ہمارے شہر کیمبل پور (اب اٹک شہر) کا بھی ذکر کیا تھا۔ دیپک کنول نے اس بارے کے۔ ایل۔ سہگل پر قلم اٹھایا ہے۔ یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ انہوں نے فن موسیقی/گائیکی باقاعدہ کسی سے نہیں سیکھی مگر وہ دیپک راگ اور میگھ ملہار تک گاتے تھے۔

انوار فیروز (راولپنڈی)

عزیزم گلزار جاوید، دعائیں۔

بہت دنوں کے بعد کچھ پڑھنے کی فرصت ملی۔ اکتوبر ۲۰۱۲ء سے سفر میں مبتلا تھی بیس مارچ کو واپس گھر لوٹی تو وارث علوی اور قمر علی عباسی والے شمارے دھیان سے پڑھے اور پسند آئے۔ وارث علوی کے تنقیدی شعور سے میں متاثر ہوں اور قمر علی عباسی سے نیویارک میں دو تین بار ملاقات ہوچکی ہے۔ وارث علوی والا شمارہ میں بوجوہ پورا نہیں پڑھ سکی۔ پڑھوں گی بعد میں مگر قمر علی عباسی والا شمارہ دل لگا کر پڑھا اور متاثر ہوئی

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

میں گزشتہ برس اپنی کتاب تخلیقی تنقید کے سلسلے میں مصروف رہی۔ اس کی تکمیل کے بعد اپنے مدتوں کے شروع کیے ناول پر متوجہ ہوئی۔ ایک عجیب تجربے سے دوچار ہوئی اور شدید قسم کی ڈپریشن کا سامنا ہوا۔ پہلے تو لکھے ہوئے دو ابواب جانے کس کی غلطی سے کمپیوٹر سے مٹ گئے۔ پھر یہ انکشاف ہوا کہ ہاتھ میں تھامے ہوئے قلم جذبات اور اسلوب کے حسن اور گہرائی و گیرائی کا تانہ بانہ ہے اور کمپیوٹر اس کے صحیح اظہار میں رکاوٹ بن رہا ہے تو مزید غم میں اضافہ ہوا اس پہ گزرتے ہوئے وقت اور زندگی کے پھسلتے لمحے کے زیاں کا شدید احساس ان سب نے ایسی کیفیت طاری کہ ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ہمت جواب دینے لگی، سوچا یہ بھی ممکن ہے کہ خط لکھوں اور یہ خط تھراپی کا کام کرے اگر اپنے ہم نفسوں سے یہ دکھ بانٹا جائے تاہم سب سے دعا کی درخواست ہے۔

نند کشور وکرم کا مضمون ''ہم زبان چپ ہوگئے'' مزید تازیانہ بن گیا۔ ایسا بھی ہوتا ہے؟ محبت کے رشتے یوں بھی بکھر جاتے ہیں؟ حافظ نے کہا تھا ناہر بنیاد کمزور ہوتی ہے سوائے محبت کی بنیاد کے۔ کیا محبت کا انجام یوں بھی ہوسکتا ہے۔ بچے بھی ظلم پہ اُتر آئیں تو پھر کیا پائیدار ہے؟ دیوندر اِسّر کیا شاندار ذہن، شعور، صلاحیت اور گہری علمیت والا انسان تھا، صحیح انفرادی فکر کا مالک۔ دیکھئے انجامِ کار انسان کتنا بے خبر ہے اور بے بس بھی۔ ارذ العمری کہ جاننے کے بعد کچھ نہیں جانتا۔ ''ہوا کے دوش پر'' فیروز عالم کی سرگزشت میں کچھ ایسے واقعات پڑھنے کو ملے کہ مجھے اپنے والد صاحب شدت سے یاد آئے۔ کیسے اچھے لوگ تھے جو گزر گئے۔ غزلیں نظمیں سب عمدہ ہیں بطور خاص مشکور حسین یاد، خیال آفاقی، عبدالرحمٰن عبد، صدیق شاہد، انوار فیروز، مناظر عاشق ہرگانوی، رب نواز مائل کا کلام زیادہ پسند آیا۔ افسانوں میں نیلم احمد بشیر کا افسانہ شیکسپیئرین ٹریجڈی کی تفسیر معلوم ہوا۔ اچھا لگا کتھارس کا کافی سامان ہے۔

حمیدہ معین رضوی (لندن)

محترم گلزار جاوید، سلام مسنون۔

اس دفعہ کا چہارسو بھی آپ کی شبانہ روز محنت اور ادبی بالغ نظری کا غماز ہے۔ اس دفعہ رشکِ قمر کے گوشے میں جناب قمر علی عباسی کا تعارف اور ادبی خدمات پیش کی گئی ہیں۔ یہ سلسلہ یقیناً نئے لوگوں کو ادبی ستونوں سے متعارف کروانے کا خوبصورت ذریعہ ہے۔ جناب قمر علی عباسی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے جو مضامین شامل کیے گئے ہیں بڑے توانا ہیں۔ بلکہ حصّہ نثر میں شامل تمام مضامین اور افسانے قابلِ ستائش ہیں۔ گوشہ ''حسنِ عقیدت'' میں شامل چاروں نعتیں بلاشبہ بہت خوبصورت ہیں۔ خاص طور پر سرور انبالوی اور نسیم سحر کی نعتیں۔ گوشہ جوشِ جنوں اور گوشہ پندار نگیں میں مندرجہ ذیل اشعار اچھے لگے:

ہمارے آئینہ ہونے میں کچھ کلام نہیں
مگر وہ حیرتِ عالم تو سامنے آئے

(مشکور حسین یاد)

یہی وہ صنفِ سخن ہے جسے عروج ملا
مرا یقین ہے ممکن نہیں زوالِ غزل

(پروفیسر حسن عسکری کاظمی)

ہوائیں سرد ہوتی جا رہی ہیں
پرندہ لوٹ کر آئے نہ آئے

(حنیف ساحل)

لمحاتِ گریزاں بھی مرے صیدِ زبوں ہیں
نیزے کی طرح وقت کے سینے میں گڑا ہوں

(پروفیسر زہیر کنجاہی)

جناب نور زمان ناوک میرے مہربان دوستوں میں سے ہیں اور اچھا شعر تخلیق کرنے والوں میں سے ہیں لیکن اس دفعہ شاید بے خیالی میں غزل ہذا میں لفظ نجم کو بروزن فعو باندھ گئے ہیں حالانکہ انہیں یقیناً اس بات کا ادراک ہوگا کہ یہ لفظ بروزن فعل درست ہے۔ (معذرت کے ساتھ) ورنہ ان کی غزل اور نظم بڑی توانا ہوتی ہے۔ الغرض پرچہ خوبصورت مرقعۂ علم وفن ہے۔ اسی مہینے ہمارے کچھ جانے مانے شعرا و ادیب اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں۔ مثلاً امیر الاسلام ہاشمی، خالد احمد اور سبط جعفر۔ اللہ ان سب کی مغفرت فرمائے (آمین) خاص طور پر سبط جعفر جو کسی ظالم کا نشانہ بن گئے۔ اس پر میں پرزور مذمت کرتا ہوں اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہوں کہ ان کے قاتلوں کو فی الفور کیفرِ کردار تک پہنچائے۔

پروفیسر انتظار باقی (جھنگ)

محترم گلزار جاوید تسلیم و نیاز۔

رشکِ قمر، قمر عباسی اور گلِ دلفریب نیلوفر عباسی پر مشتمل ''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ باعثِ تسکینِ دل و نظر ہوا۔ آپ نے اس کی تیاری پر جس قدر محنت و توجہ فرمائی ہے اس کی گواہی ہر صفحہ پر ثبت ہے۔ اپنی جامعیت اور معلومات سے پُر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ میرے لئے پرانی یادوں کے تازہ جھونکے لے کر آیا۔ اگرچہ قمر عباسی صاحب مجھ سے سینئر ہیں مگر میں بھی سندھ یونیورسٹی ہی کا فارغ التحصیل ہوں اور چند سال بعد میں بھی لیاقت میڈیکل کالج اور یونیورسٹی کی مباحثہ کی ٹیم میں فردوس عالم اور جہانگیر آذر کے ساتھ شامل تھا۔ عباسی صاحب کا نام مقرری کے حوالے سے ایک ضرب المثال تھا۔ عباسی صاحب پر لکھے گئے سارے ہی مضامین حاصلِ مطالعہ ہیں اور ان میں عباسی صاحب کے لئے مصنفین کے ذاتی اور نجی جذبات کی دل آویز جھلک ہے۔ عباسی صاحب کا اپنا کالم ''بھاوج کا تحفہ'' اس قدر متاثر کن تھا کہ اسے پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ سن ساٹھ کی دہائی میں حیدر آباد ایک پر امن اور خوبصورت شہر تھا۔ حیدر آباد کے شہریوں کو اس پر ناز تھا اور وہ کراچی سے مسابقت کی دوڑ میں شامل تھے۔ مجھے بھی قلعہ، اس کے ساتھ ریشمی گلی اور شیطان کی آنت کی طرح لمبا شاہی بازار یاد ہے۔ اسکے آخری کنارے پر گھنٹہ گھر تھا جہاں سے ہمارے کالج کے لئے بسیں جاتی تھیں ۱۹۹۰ء میں یہاں جو خوں ریزی ہوئی وہ انسانی بربریت کی بدترین مثال ہے۔ ان گلیوں میں جہاں رنگ برنگی چوڑیوں کی دکانیں تھیں، ایک تصور کی آنکھ شاید اب بھی خون کے دھبے دیکھ سکتی ہے۔

شمارے کا دوسرا حصہ ریڈیو اور ٹیلیوژن کی مشہور اداکارہ نیلوفر صاحبہ کے نام ہے۔ وہ اپنے دور میں شہرت کے آسمان پر آفتابِ نصف النہار کی مانند تھیں۔ اس شمارے میں ان کی بھی چند دلنواز تحریریں شامل ہیں۔ خاص طور سے مجھے ''گئے دنوں کا سراغ'' نے بہت متاثر کیا۔ وہ اردو ادب کے حوالے سے ایک نہایت مشہور خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں۔ موجودہ شمارے میں ان کے کزن آصف فرخی کا مضمون قابلِ توجہ ہے۔ اگرچہ وہ شمالی امریکا میں اپنی خوبصورت نظامت اور اپنی سحر انگیز شخصیت کے لئے ایک خاص مقام رکھتی ہیں مگر اس کے باوجود وہ ہر شخص سے نہایت محبت اور خلوص سے بات کرتی ہیں۔ یہ وصف مشہور لوگوں میں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ سعید نقوی، نیلم احمد بشیر، رینو بہل ہمیشہ کی طرح اپنی تحریروں میں کامیاب ہیں۔ آغا گل صاحب نے اپنی ایک خاص ڈگر بنائی ہوئی ہے اور اس میں انہوں نے اپنا مقام بنا لیا ہے۔ آپ کا ''جان آرزو'' بہت خوب ہے۔ خاکسار کی سرگزشت کو جو لوگ پسند فرما رہے ہیں انکا تہہ دل سے شکریہ۔

فیروز عالم (یو۔ایس۔اے)

بہت ہی پیارے گلزار جاوید بھائی۔ السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اس کرم فرمائی کا بہت بہت شکریہ۔ واللہ! میں اس خوبصورت پرچے کا شدت سے منتظر رہتا ہوں۔ اس مرتبہ نیلوفر علیم اور قمر علی عباسی پر مبنی نگارشات سے مزین ہے۔ بے شک نابغہِ روزگار شخصیات کے کام اور ذاتی مصروفیات پر ہر زاویے سے روشنی ڈالنا ایک تحقیق طلب اور دشوار کام ہے جسے آپ انتہائی جانفشانی سے ادا کر رہے ہیں۔ اس فریضہ کی ادائیگی پر میری دلی مبارکباد قبول کیجیے۔ فی الحال میں پرچے کا سرسری مطالعہ کر سکا ہوں۔ تاہم ''ایک صدی کا قصہ'' اور ''عام آدمی کی داستان حیات'' کے علاوہ آپ کی تحریر ہمیشہ میری ترجیحات میں شامل رہتی ہیں۔ آپ کا یہ جملہ ''ہر گھر سے بھوکا نکلے گا تم کتنے بھوکے مارو گے'' پورے افسانہ کا احاطہ کیے ہوئے ہے مجھے بے حد پسند آیا۔ دیگر افسانوں اور غزلوں کا انتخاب بھی معیاری ہے۔

سلیم ناز (کراچی)

مدیر محترم، سلام مسنون۔

چہارسو کے تازہ شمارے کے سرورق کے چہروں کی مسکراہٹ، قارئین کا استقبال کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ سبھی تحریروں نے اپنے اپنے انداز سے عباسی صاحب کے تخلیقی وجدان، اندازِ بیان، طباعتی و اشاعتی مراحل، خوش اخلاقی و ملنساری، دوستداری و وضعداری کا بے حد فعال و مستعد طرزِ زندگی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ دراصل سفر کرنا ایک کیفیت ہے مگر اُس سفر کو لطافت و جاذبیت کے ساتھ قلمبند کرنا بالکل مختلف نوعیت کا مشاہدہ اور تجربہ ہے لہٰذا اسی کامیاب عکاسی اور جاندار تجزیے نے ان کے سفرناموں کو شہرت و مقبولیت سے ہمکنار کر کے ان

کی شخصیت کا طرۂ امتیاز بنا ڈالا ہے۔اسی سبب سے جناب ضمیر جعفری نے اُنہیں سیاحتی تر و تازہ نام (ابنِ شگوفہ) دے ڈالا جبکہ مجتبیٰ حسین صاحب نے بھی بڑے منفرد و مخلصانہ انداز میں ''مسافرانہ چمک'' کی نفی کی ہے۔فی الوقت فیروز سنز یا ماورا سے ممکن نہ ہوا تو۔۔۔قائداعظم کیمپس (پی۔یو) کے آمدہ کتاب میلے پہ ان کے کسی سفرنامے کی جستجو ضرور رہے گی۔

محترمہ نیلوفر عباسی کی آواز کا لوچ، ادائیگی میں ملائمت، صوتی اتار چڑھاؤ، لہجے کی کھنک، فقروں کی دھنک، شہزوری کا تکیہ کلام سب کچھ یاد آتا گیا۔ کہی ان کہی کے توسط سے اُنہوں نے اظہار کی نئی جہت دریافت کی ہے کہ انسان کے اندر کئی۔''جہان دیگر'' آباد رہتے ہیں ''گئے دنوں کا سراغ'' یادوں کی بازیافت کا موثر پیرایہ بیان تھا اور ''سخن آزردہ'' کے شگفتہ و شاداب لہجے نے بھی لطف کا بھرپور سامان کئے رکھا۔''حسنِ عقیدت'' سے قلب و جاں منور و معطّر ہوئے۔ جانِ آرزو میں آپ نے انفرادیت کو اجتماعیت سے آمیز کر کے ''آئی۔ایم۔ایف'' کو خوب آڑے ہاتھوں لیا، ہدفِ تنقید بنایا اور تلخابۂ شیریں میں ڈھالا۔''کُجھ تاں میرے پلے پاؤ'' کی ساری فضا پر اکلاپے کا درد سرایت کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔''ہم زبان چپ ہو گئے'' پڑھ کے روبہ زوال اخلاقی و تہذیبی اقدار نے تادیر مغموم و ملول کیے رکھا۔''ایک صدی کا قصّہ'' میں ہر بار کچھ ایسی لنکا ڈھائی جاتی ہے کہ قاری کہے بغیر رہ نہیں پاتا۔

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ

رس رابطوں میں سرفہرست شہناز خانم عابدی صاحبہ کا مکتوب پڑھنا اچھا اور معمول سے ہٹ کے لگا (تاہم گزشتہ صاحبِ قرطاسِ اعزاز کے تاثرات کی کمی بھی محسوس ہوئی) رابطوں کے حوالے سے کلماتِ تحسین اور پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔قرطاسِ اعزاز افضل و اعلیٰ مرتب کر کے درحقیقت چہارسو نے ادبی تاریخ میں ایک اور زریں باب کا اضافہ کر دیا ہے۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

گرامی قدر گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' بابت ماہ مارچ اپریل نظر نواز ہوا۔تہہ دل سے ممنون ہوں۔چہارسو جیسے ہی ملتا ہے ہماری خوشی دیدنی ہوتی ہے۔پھر جوں جوں فرصت کے لمحات میسر آتے ہیں چہارسو کا مطالعہ ہماری اولین ترجیح ہوتی ہے۔ہر چند کہ دیگر بہت سے پرچے مطالعہ کی میز پر ہوتے ہیں۔ چہارسو اپنی انفرادیت کے باعث مقبولیت اور محبوبیت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہے (حرفِ حق ہے ریاکاری اور جانبداری ہمارا شیوہ نہیں) زیرِ نظر شمارہ بھی معیاری اور بامقصد تحریروں سے عبارت ہے۔قرطاسِ اعزاز بالخصوص پرچے کو چار چاند لگا دیتا ہے۔اور یہ اعزاز اگر بیک وقت دو شخصیات کے حصے میں آئے تو لطف دوبالا (جلنے والے کا منہ کالا) ''حسنِ عقیدت'' کے ذیل میں خوبصورت نعتیہ کلام پڑھنے کو ملا۔آنکھوں کو فرحت و تازگی اور روح کو تسکین ملی۔غزلیات کا انتخاب بھی خوب ہے۔دو دفعہ پڑھنے سے بھی جی نہیں بھرا۔بعض غزلیں تو ایسی ہیں جو آنکھوں کے رستے دل میں اتر گئیں (واللہ غزل کتنی خوبصورت ہے) میں اپنے تئیں کسی ایک غزل یا غزل نگار کو Highlight کروں اور دوسروں کو Sideline یہ مجھ جیسے مبتدی کو زیب نہیں دیتا۔نظموں میں مضمون آفرینی اور فنی و فکری ارتقا بطورِ خاص نظر آیا جامد و ساکت سوچ کو متحرک کرنے میں یہ نظمیں اپنا کردار بخوبی ادا کر رہی ہیں۔ ان نظموں کی انفرادیت اور اہمیت دیگر حوالوں سے بھی مسلمہ ہے۔افسانوی ادب کا مطالعہ خوشگوار حیرتوں کی نوید بنا۔''جانِ آرزو'' از گلزار جاوید سے اس حصے کی ابتداء کی اور اس طرح دوسرے افسانے پڑھنے کی گویا تحریک اور اُمنگ پیدا ہوئی۔ میری ناقص رائے میں ''جانِ آرزو'' درجہ اوّل پر فائز ہے۔صداقت غالب ہے۔(خوشنودی اور خوشامد درآئی ہو تو میرا ہاتھ لکھنے سے عاری ہو جائے اور قلم رک جائے) احباب کے خطوط بجائے خود ''چہارسو'' کی مقبولیت اور کامیابی کے ضامن ہیں۔

تصور اقبال (اٹک)

مکرمی جناب گلزار جاوید، آداب و تسلیم۔

تازہ شمارے کے قرطاسِ اعزاز کے لیے آپ نے ایک جوڑے کا انتخاب کیا تو قرطاسِ اعزاز کے دو حصے افضل و اعلیٰ کی تقسیم، آپ کے ذوق کا خوبصورت اظہار۔''براہِ راست'' میں قمر علی عباسی کا یہ شعر کبھی ان کی پہچان رہا ہوگا:

کیا قیامت ہے قمر انجم
چاند پورا ہے روشنی کم ہے

اس کے بعد ان کے کالم اور سفرناموں کی دھوم رہی۔سفرناموں کے شہزادے مستنصر حسین تارڑ کی ستائش تو معنی رکھتی ہے۔عباسی صاحب سے متعلق مضامین سے بہت کچھ جاننے کو ملا لیکن سلطان جمیل نسیم نے تو جیسے دل چیر کر رکھ دیا۔اور کیوں نہ ہو ایک ان کے دیرینہ تعلقات اور دوئم ان کا انداز بیاں اور اپنے والد کے برملا اشعار سے تو جیسے نگینے جڑ دیے۔اسی طرح نیلوفر عباسی سے متعلق ڈاکٹر اسلم فرخی کا مضمون ''میری نیلو باجی'' جہاں خلوص کا دریا بہتا ہے اور تعلقات کو بطریقِ احسن نبھانے کا درس ملتا ہے۔''ٹک ٹک دیدم'' سید سعید نقوی کے افسانے کے موضوعات انتہائی منفرد ہوتے ہیں۔ندرتِ خیال عروج پر، اگر وقت تھم جائے، ایک لمحہ جامد ہو جائے، زندگی جو بدلتے وقت کا دوسرا نام ہے۔سیّد صاحب قاری سے پوچھتے ہیں۔اسے کیا نام دیا جائے؟

جناب تشنہ بریلوی کا ''خلیج سے واپسی'' نے اطراف کے ممالک کے بے شمار ناداروں کے خواب کو سچا کر دکھایا۔لیکن کچھ نامراد بھی لوٹے۔ان میں سے ایک کی کہانی لیکن مستند اور معروف مصنف نے اس کے ٹریٹمنٹ میں اپنا ہنر خوب دکھایا۔آپ نے ''جانِ آرزو'' میں طنز کے وہ تیر تفنگ چلائے کہ قاری لہولہان ہو گیا۔جس ملک میں لوگ بھوک سے مر جاتے ہوں اس کے وزیراعظم

ہاؤس اور صدارتی محل کا خرچا فقط ایک یوم کا ایک ملین روپے سے زیادہ۔ غالب کو یہ احساس تو تھا کہ فاقہ مستی یونہی جاری رہی تو ایک روز ضرور رنگ لائے گی جبکہ ہم قرض پر قرض لے کر فاقہ مستی کا جشن مناتے جا رہے ہیں اور قرض کا بوجھ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس سرزمین میں جس کی زرخیزی ضرب المثل تھی ہم بھوک بو رہے ہیں اور بھوکوں کی فصل تیار کر رہے ہیں۔

نجیب عمر (کراچی)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

اس بار آپ نے قمر علی عباسی اور نیلوفر عباسی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ دونوں شخصیات انتہائی ذہین، باصلاحیت اور علم، ادب و فن سے گہری وابستگی رکھنے والی ہیں۔ ''براہِ راست'' میں قمر علی عباسی نے سوالات کے مختصر جوابات دیے جس سے تشفی نہیں ہوئی۔ محترمہ نیلوفر عباسی (میں بہت بُری آدمی ہوں) نے بھی جوابات دینے میں اپنے شوہر کی تقلید کی ہے۔ صاعقہ مقبول نے ''ابنِ شگوفہ'' میں قمر علی عباسی کے نام اہلِ علم و دانش کے خطوط کا انتخاب محنت سے کیا ہے۔ نیلوفر عباسی، سلطان جمیل نسیم، مامون ایمن، محمود شام اور اکرام بریلوی کے مضامین میں قمر علی عباسی کی شخصیت اور فکر و فن کے بہت سے زاویے سامنے آئے ہیں۔ قمر علی عباسی ایسے لکھاری ہیں جو مسلسل اچھا لکھ رہے ہیں وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کے قائل نہیں۔ نیلوفر عباسی کا مضمون ''گئے دنوں کا سراغ'' زبردست فنکار معین اختر کی شخصیت پر ہے۔ کس روانی اور عمدگی سے انہوں نے معین اختر کے مزاج، شائستگی اور رشتوں کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ نیلوفر عباسی کی فنکارانہ صلاحیتوں پر محسن علی اور امیر امام (پی۔ٹی۔وی) کی رائے بہت معنیٰ رکھتی ہے جبکہ احمد ندیم قاسمی کی رائے بھی کسی اعزاز سے کم نہیں۔

ڈاکٹر آصف فرخی کا مضمون ''میری نیلو باجی'' ایک ایسی تحریر ہے جس سے نہ صرف نیلوفر عباسی کی شخصیت کی عاجزی و انکسار کی جھلک نظر آتی ہے بلکہ اس میں رشتوں کے تقدس اور محبت کی خوشبو بھی بسی ہے اب ایسی محبتیں ''تبرک'' ہوتی جا رہی ہیں۔ نصرت انور کی تحریر بھی آغاز سے انجام تک اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ ''ایک صدی کا قصہ'' میں دیپک کنول صاحب نے کے۔ ایل۔ سہگل کے مختصر حالاتِ زندگی، اداکاری و گلوکاری سے جنون کی حد تک لگاؤ اور انسانوں سے محبت کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا کسی اور دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ سہگل صاحب کی زندگی سے چھوٹے چھوٹے واقعات لے کر بڑی شخصیت کی تصویر پیش کی ہے۔ بڑا اور سچا فنکار بڑا انسان بھی ہوتا ہے۔ ملازم یوسف اور کیدار شرما والے واقعے ہی اُن کو بڑا آدمی ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ محترم آصف ثاقب نے چھوٹی بحر کی غزل میں کس فنی پختگی سے عصری مسائل علامتی رنگ میں پیش کیے ہیں:

یہ کس نے روشنی روکی ہوئی ہے
کوئی تو دل کالا ہے زمیں پر

مشکور حسین یاد صاحب نہ جانے ایسی مشکل باتیں کس طرح غزل جیسی نازک مگر مضبوط صنف میں سمو دیتے ہیں۔ انتظار باقی، غالب عرفان، عبد الرحمٰن عبد، انوار فیروز، جاوید زیدی، پروفیسرز ہیر کنجاہی، کرشن پرویز، نور زمان ناوک، سلیم ناز اور ایم۔ زیڈ کنول کی غزلیں ہمارے عہد کی آوازیں ہیں۔ کرشن گوتم کی غزل منفرد ہے جزئیات نگاری کا بھی کمال ہے۔ گلزار جاوید صاحب آپ نے ''جانِ آرزو'' میں مظلوم پاکستانیوں کے دل کی آواز کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے۔ بہت خوب، نیلم احمد بشیر کے افسانے نے ہر بار کی طرح متاثر کیا ہے سید سعید نقوی کی کہانی ماضی کے جھروکوں سے ہوتی ہوئی لمحۂ موجود پر آتی ہے۔ فیروز عالم صاحب کی داستانِ حیات ''ہوا کے دوش پر'' کا مطالعہ سب سے پہلے دلچسپی سے کرتا ہوں۔ ڈاکٹر فیروز عالم ایک محبت کرنے والی شخصیت ہیں اُن کے مزاج دردمندی، حبُ الوطنی اور اپنے محسنوں کو یاد رکھنے کا جذبہ زندہ ہے۔ گارڈ فخر الدین خاں اور سانگھڑ کی کاروباری شخصیت کو کس احترام سے یاد کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب آج بھی ایسے ہی لوگوں سے انسانیت کا اعتبار قائم ہے۔ جو لوگ فیروز عالم صاحب سے ملے ہیں وہ لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ وہ ایک سچے اور مخلص انسان ہیں اور مختلف علوم کا گہرا مطالعہ رکھنے والے حقیقی ادیب ہیں۔

نوید سروش (میر پور خاص)

پیارے بھائی جان، آداب۔

اس بار جناب قمر علی عباسی اور ان کی اہلیہ محترمہ نیلوفر علیم عباسی کے حوالے سے یہ تازہ شمارہ ان دونوں کے فن اور شخصیات پر خاصی دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے۔ گو قمر علی عباسی نے خود تو ''براہِ راست'' میں بہت بخل سے کام لیا ہے لیکن ان سے متعلق تمام مضامین نے اس کمی کا ازالہ کر دیا ہے۔ افسانوں میں نیلم احمد بشیر، آغا گل، سید سعید نقوی، شہناز خانم عابدی اور ڈاکٹر رینو بہل کی کہانیاں بہت دل پذیر ہیں۔ ''جانِ آرزو'' میں آپ نے ایک منفرد انداز میں حالاتِ حاضرہ کی جو تصویر کشی کی ہے وہ بہت معرکے کی چیز ہے۔ منظومات سبھی اعلیٰ امتیاز کی ہیں اور تمام خواتین و حضرات کا کلام ''چہارسُو'' کے اعلیٰ مزاج و معیار کا ضامن ہے۔

فیروز عالم صاحب کی تحریر ہمیشہ کی طرح بے حد دلچسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ مرحوم کندن لال سہگل پر دیپک کنول صاحب کا مضمون بھی اس عظیم اور بے عدیل فنکار کی شخصیت اور فنی اہلیت اور ان کی بے پناہ مقبولیت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ مرحوم دیویندر اسّر صاحب کے بارے میں نند کشور وکرم صاحب کا مضمون پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ یقین نہیں آتا کہ اتنے بڑے ادیب جسے اہلِ ادب نے ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھایا اُس کی اولاد اس قدر بے ادب اور بدلحاظ بھی ہو سکتی ہے۔

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ، بھارت)

ترسیل وترویج

تنقید میں شخصی ردّعمل کا یہ عنصر فن کار اور نقاد کو تخلیقِ ادب کے سلسلے میں ایک دوسرے کے قریب کر دیتا ہے۔ وہ یوں کہ جس طرح تخلیقی ادب میں مختلف عناصر کے ربط باہم کی دریافت ایک تخلیقی رو کی منت کش ہوتی ہے، اس طرح تنقیدی ادب میں ربط و تسلسل کی دریافت کا سلسلہ شخصی ردّعمل ہی سے بڑی حد تک متشکل ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اچھا نقاد نہ صرف مختلف ادوار کی ادبی تخلیقات کے پسِ پشت ایک ذہنی اور احساسی تسلسل کو نمایاں کرتا اور یوں روایت کے مسلمّہ اصولوں اور تجربے کے باغی عناصر میں ایک ربط دریافت کر کے ادب کے تدریجی ارتقا کو واضح کرتا ہے۔ اگر آپ جنابِ اے خیام کے زیرِ نظر مضامین کو اپنی توجہ کا مرکز بنائیں گے تو مندرجہ بالا رائے کے معنیٰ اور مفہوم سے اتفاق لازمی طور پر کریں گے۔

---ڈاکٹر وزیر آغا

قیمت ۴۰۰ روپے، میڈیا گرافکس، نارتھ کراچی۔

کائنات مٹھی میں

اردو اور پنجابی کی ممتاز شاعرہ، ادیبہ، سکالر، ماہر تعلیم، ایم زیڈ کنول کا دوسرا شعری مجموعہ " کائنات مٹھی میں " باقر پبلیکیشنز لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہو کر منظرِ عام پر آ گیا ہے۔ کتاب کا ٹائٹل معروف پرائیڈ آف پرفارمنس آرٹسٹ ڈاکٹر اعجاز انور نے بنایا ہے اور دیباچہ معروف علمی و ادبی شخصیت چیئرمین شعبہ اردو گورنمنٹ اسلامیہ پوسٹ گریجویٹ کالج گوجرانوالہ پروفیسر ڈاکٹر طارق جاوید نے تحریر کیا ہے۔ کتاب کا انتساب شاعرہ نے اپنے سب سے چھوٹے راہی عدم کو کوچ کر جانے والے بھائی راؤ قاسم علی شہزاد کے نام کیا ہے۔ ادبی حلقوں کی طرف سے کتاب کا بہت خیر مقدم کیا گیا ہے۔ قبل ازیں اُن کا پہلا شعری مجموعہ "چہرے گلاب سے " 1998ء میں شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ اس کتاب میں کنول کی غزل میں برفاب کے رنگ سے نکہتیں چرا کے رنگِ اختر اور آب کو کنول کا پیرہن سے کر موجِ سا گر بنانے، اندھیری رات کے صُور سے اُجالے کی نمو، چاندنی کے فسوں کا پتھروں کے جگر کو پارا پارا کرنے، حبسِ دم کے بطن سے ابرِ باراں کا ظہور، صحراؤں کی خاک چھاننے سے من میں آنکھوں کی تخلیق، نفی نفی سے ثبات کا مٹھی میں مسکرا اُٹھنا، دھوپ کی اوس میں خوابوں کا پلنا اور بند مٹھی میں مسکرا اُٹھنا، دھوپ کی اوس میں خوابوں کا پلنا اور بند مٹھی سے جگنوؤں کا اُڑ کے ظلمت کو پارا پارا کر جانا حقیقت، خیال اور فن کے پیچیدہ مراحل کا آئینہ دار ہے۔

---اسلم ملک

اشاعت ۲۰۱۳ء، قیمت ۲۵۰، باقر پبلی کیشنز، لاہور۔

اُداسی کے رنگ

الطاف صفدر نے غزل میں روایات کی پاسداری کی ہے مگر روایت کے حصار میں مقید رہنے سے گریز کیا ہے، وہ ان غزل گو شعرا میں شمار کیے جانے کے سزاوار ہیں جنھوں نے غزل کے تخلیقی عمل میں ذہنی اپج سے کام لیا لیکن کسی نوع کی بدعتِ فن کا ارتکاب کر کے شریعتِ غزل سے متصادم نہیں ہوئے، الطاف صفدر نے غزلیہ اسلوبِ اظہار میں میر تقی میر کے اداس لب و لہجہ کی تمنا کی ہے کہ اس لب و لہجہ سے غزل کا تغزل عبارت ہے، الطاف صفدر نے میر تقی میر سے متاثر ہونے کے باوصف انفرادی اسلوب، انفرادی زاویۂ فکر اور متنوّع شعری متن و مواد کی جمالیات سے اپنی غزل کو پُرکشش بنانے کی سعی کی ہے۔

---قیصر نجفی

قیمت ۲۵۰، مثال پبلیشرز، امین پور بازار، فیصل آباد۔

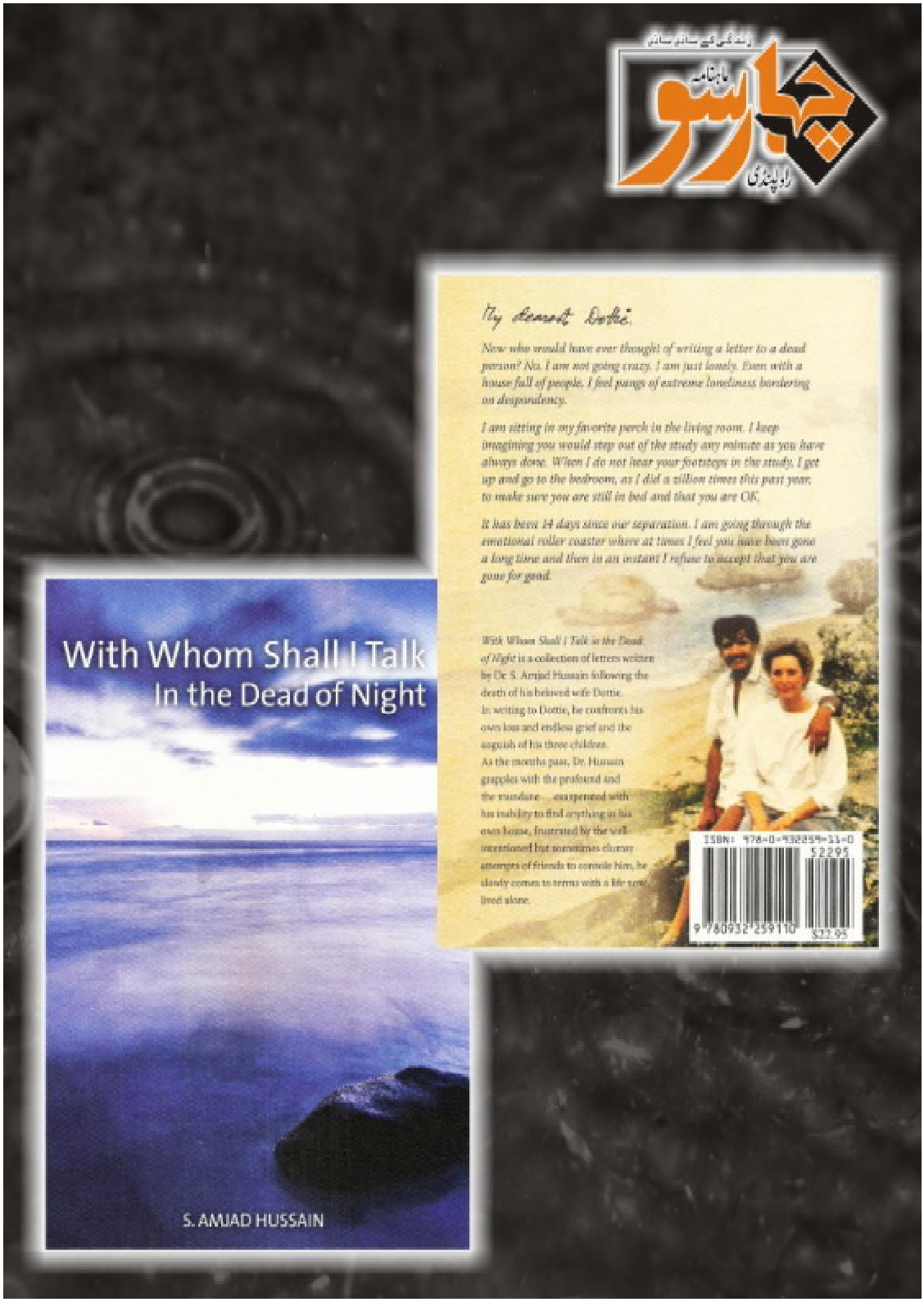

ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
My dearest Dottie,
Now who would have ever thought of writing a letter to a dead person? No. I am not going crazy. I am just lonely. Even with a house full of people, I feel pangs of extreme loneliness bordering on despondency.
I am sitting in my favorite perch in the living room. I keep imagining you would step out of the study any minute as you have always done. When I do not hear your footsteps in the study, I get up and go to the bedroom, as I did a zillion times this past year, to make sure you are still in bed and that you are OK.
It has been 14 days since our separation. I am going through the emotional roller coaster where at times I feel you have been gone a long time and then in an instant I refuse to accept that you are gone for good.
With Whom Shall I Talk in the Dead of Night is a collection of letters written by Dr. S. Amjad Hussain following the death of his beloved wife Dottie. In writing to Dottie, he confronts his own loss and endless grief and the anguish of his three children. As the months pass, Dr. Hussain grapples with the profound and the mundane ... exasperated with his inability to find anything in his own house, frustrated by the well-intentioned but sometimes clumsy attempts of friends to console him, he slowly comes to terms with a life now lived alone.
ISBN: 978-0-932259-11-0
52295
9 780932 259110
$22.95
With Whom Shall I Talk
In the Dead of Night
S. AMJAD HUSSAIN